



سلسلۃ المصنفین

(۵۱)

# قرآن و تفسیر

تالیف

جناب ڈاکٹر میرونی الدین صاحب

ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی (لندن) پیرسٹریٹ لا

صدر شعبہ فلسفہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن

رفیق اعزازی

مصنفین دہلی  
ندوۃ المصنفین دہلی

مصنفین اردو بازار جامع مسجد دہلی  
ندوۃ المصنفین اردو بازار جامع مسجد دہلی

86042

~~68542~~

پانچ روپے

قیمت غیر مجلد

چھ روپے

قیمت مجلد

طبع اول

دہلی قعدہ ۱۳۷۱ھ (مطابق) اگست ۱۹۵۲ء

مطبوعہ اشوک پریس دہلی

# انساب

مرشدی حضرت محمد حسین صاحب قبلہ رحمۃ اللہ علیہ کے نام جن  
 کے فیضانِ توجہ اور برکاتِ تربیت سے اس خدمت کے  
 لائق ہوا۔

عمرِ حریص در طلبِ کیمیا گزشت  
 مارا قبولِ اہلِ نظر کیمیا بس است

میر ولی الدین



# مُصَنَّف کی دُوسری کتابیں

## تراجم

- |                        |                           |
|------------------------|---------------------------|
| ۱۔ قرآن اور تصوف       | ۸۔ رہنمائی قرآن           |
| ۲۔ فلسفہ کیا ہے؟       | ۹۔ تاریخ فلاسفہ اسلام     |
| ۳۔ رموز اقبال          | ۱۰۔ تاریخ مسائل فلسفہ     |
| ۴۔ مراقبات             | ۱۱۔ مقدمہ فلسفہ حاضرہ     |
| ۵۔ قنوطیت یا فلسفہ یاس | ۱۲۔ فلسفہ کی پہلی کتاب    |
| ۶۔ ابطال مادیت         | ۱۳۔ مقدمہ مابعد الطبیعیات |
| ۷۔ رسالہ اخلاقیات      |                           |

## فہرست مضامین

صفحہ ۹	تہنید
۱۳ "	عبادت و استعانت
۲۲ "	توحید الوہیت
۱۰۹ "	صالحیت
۱۲۲ "	نیکی علم ہے
۱۳۰ "	تعلیم کا مقصد
۱۳۰ "	انسانِ کامل
۱۴۵ "	امام غزالی کا فلسفہ مذہب
۱۵۳ "	تصحیح و فکر
۱۵۹ "	قانونِ تجاذب اور تعمیر سیرت
۱۶۶ "	قرآن اور سیرت سازی
۱۸۹ "	قوتِ ایمانی اور ظہورِ غیب
۲۰۴ "	ماحول پر قابو کس طرح حاصل کیا جائے
۲۲۰ "	کامیاب زندگی کا قرآنی تصور
۲۳۵ "	قرآن اور علاجِ خوف
۲۵۷ "	بے خوف زندگی
۲۶۷ "	قرآن اور علاجِ حزن
۲۷۷ "	زندگی میں غم کیوں ہے
۲۸۷ "	قرآن اور علاجِ غضب
۲۹۹ "	دعا، اور دفعِ بلا
۳۰۷ "	اسراج



## بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اس کتاب کے بعض مقالات ۱۹۴۲ء میں "ادارہ اشاعتِ اسلامیات" حیدرآباد دکن کے زیر اہتمام "قرآن اور سیرت سازی" کے عنوان سے شائع ہوئے تھے، پھر شدہ شدہ ان میں اضافہ ہوتا گیا، یہاں تک کہ اب ۱۹۵۲ء میں یہ ایک مکمل اور ضخیم کتاب کی صورت میں پیش کیے جا رہے ہیں۔ گویا یوں کتاب چاہیے کہ "قرآن اور سیرت" ۱۹۴۲ء کی "قرآن اور سیرت سازی" سے اب ایک علیحدہ جدید تالیف کی صورت میں سامنے آ رہی ہے۔

۱۹۴۷ء کے انقلاب سے ملک میں جو حالات رونما ہوئے ان کی موجودگی میں اردو کی کسی ضخیم علمی اور مذہبی کتاب کا شائع کرنا آسان نہیں رہا، پوری فضا مایوسیوں اور تاریکیوں میں گھری ہوئی ہے، اردو کو خود اس کے بولنے والے اور اس کی آنکھوں میں شفقت میں تربیت پانے والے دیں نکالا دینے پتلے ہوئے ہیں، یہی وجہ ہے کہ حیدرآباد دکن جس کے چپے چپے سے کبھی دل آویز اردو تالیفات کے چشمے اُبلاتے تھے آج ایک ویرانے میں تبدیل ہو کر رہ گیا ہے اور اس کے ادبی اور علمی مرکز یا تو انقلاب کی موجوں میں لپیٹ کر فنا ہو گئے ہیں اور یا ان میں خاک اُڑ رہی ہے۔

لیکن سخت جان "ندوۃ المصنفین" جس کا وجود کسی حکومت یا ریاست کے اقتدار و سطوت سے وابستہ نہیں تھا تباہی و بربادی کی تمام منزلوں سے گزرنے پر بھی اس لائق ہے کہ اس کی نگرانی میں یہ روحانیت میں ڈوبی ہوئی پُر افادہ کتاب شائع کی جا رہی ہے۔ فالحمد للہ علی ذالک۔

"قرآن اور سیرت سازی" کے تعارف کے سلسلہ میں مولوی محمد اسحاق صاحب بی ایس سی ڈپ۔ ایڈ (عثمانیہ) نے "ادارہ اشاعتِ اسلامیات" کے معتمد کی حیثیت سے جو دیباچہ لکھا تھا، ماضی کے مٹے ہوئے نقوش کی یاد تازہ رکھنے کے لیے اس جگہ اسی دیباچہ کا ضروری حصہ نقل کیا جاتا ہے:-

"ڈاکٹر صاحب علماء ہند میں کسی تعارف کے محتاج نہیں، صاحب موصوف مذہب اور دینداری

کے زندہ پیکر ہیں اور ان کے فیضِ صحبت سے بیسیوں طالب علم صبیحۂ امت میں رنگے جا رہے ہیں، رات دن کے اس مشغلہ سے ان کو انسانی کردار کی تعمیر کا ایسا ملکہ حاصل ہو گیا ہے کہ وہ اس کی نفسیاتی کمزوریوں اور امراض کی تشخیص کر کے قرآن کے ذریعہ ان کے بہترین علاج تجویز فرماتے ہیں، مزید برآں اپنے مقالات میں جا بجا احادیث اور صوفیائے محققین کے اقوالِ نظم و نثر سے بکثرت استشہاد فرماتے ہیں۔ اور باوجودیکہ ڈاکٹر صاحب ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی (لندن) بار ایٹ لا اور جامعہ عثمانیہ میں مغربی فلسفہ کے صدر شعبہ وغیرہ سب کچھ ہیں لیکن مقالات سے ظاہر ہوتا ہے کہ تصوفِ قرآنی کے کسی رمز شناس عارف کے قلم سے یہ سطور نکلی ہیں۔

بہر حال یہ کتاب فلسفہ، تصوف اور ادب کا ایک خوشگوار امتزاج ہے۔

میں اس تعارف میں اتنا ہی باضافہ کر سکتا ہوں کہ فاضل دیباچہ نگار نے محترم ڈاکٹر صاحب سے جن خصوصیتوں کو منسوب کیا ہے، میرے ذاتی مشاہدے میں بھی یہ تمام خصوصیات میری ولی الدین کے پیکر میں اپنی پوری تابانی کے ساتھ جلوہ گر ہیں، موصوف اس دور کے اول درجے کے روحانی فلسفی اور متکلم ہیں، اور ملتِ گم گشتہ کی نبض پر ایک ماہرینِ طبیب کی حیثیت سے ہاتھ رکھنا جانتے ہیں مجھے اُمید ہے کہ ایک ایسے وقت میں جب کہ مسلمان عام طور پر احساسِ کمتری، بے یقینی اور تذبذب کی ظلمتوں میں پھنسے ہوئے ہیں، یہ گراں قدر تالیف ان کے روحانی رشتے کو مضبوط و مستحکم کرنے میں ”چراغِ راہ“ کا کام دیگی۔

عتیق الرحمن عثمانی

یکم ذی قعدہ ۱۳۷۱ھ

ناظم ندوۃ المصنفین دہلی

## تمہیں

پیش نظر کتاب بظاہر ایک کثرت ہے اور یہ کثرت مختلف موضوعوں کے اظہار خیالات پر مشتمل ہے مختلف اوقات میں مختلف تصورات کو واحد نصب العین کے زیر اثر پیش کیا گیا تھا اور اب انہیں یکجا حاضر کر دیا گیا ہے۔ لیکن نصب العین کی عنایت ہی وہ وحدت ہے جو اس کثرت میں متجلی ہے اور انہیں ایک شیرازہ میں باندھ رکھا ہے۔ اس نصب العین کو یہاں مختصر پیش کرنا مقصود ہے، عمد حاضر کے نوجوانوں کا خیال ہے کہ دین معاملہ ہے ان چندنا کامیاب افسردہ دل، آشفہ دماغ ضعیفوں کا جن کے ہاتھ سے دنیا نکل چکی ہے، جن میں متلع ذہنی سے محظوظ ہونے کی نہ قابلیت باقی رہی ہے اور نہ خواہش، یہ سرت و شادمانی کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ چکے ہیں اور حزن و غم کے آغوش میں ان کے دن گزر رہے ہیں۔ دنیا میں کامیابی، کامرانی، مسرت و راحت کا حاصل کرنا ذہنی اصول کے عاقلانہ استعمال ہی سے ممکن ہے ذہنی اصول کو ان میں کیا دخل ہے۔ شاید قبر کے اس طرف ان کا کام پڑتا ہو تو ہو!

پیش نظر اوراق میں اس ضابطہ کو اس کی تمام تفصیلات میں رفع کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اصولاً بتلایا گیا ہے کہ کامیاب زندگی بسر کرنے کے لیے سیرت کی تعمیر ضروری ہے اور جب تک سیرت کی تعمیر قرآنی اصول پر نہ ہو دنیا میں کامیابی و کامرانی کے ساتھ چین اور طمانیت کا جمع ہونا ممکن نہیں! کامیابی محض مال یا بی کا نام نہیں، بلکہ مراد ہے طمانیت روح اور برد قلبی کا جو محض مالیات کو کسی طرح حاصل نہیں ہوتی۔ واضح کیا گیا ہے کہ ذہنی عقل معاش عقل

میں روشنی اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب وہ حرص و ہوس سے آزاد ہو کر علم وحی کے تابع ہو جاتی ہے۔ اور حقیقت میں عاقل و بالغ وہی ہے جو ہوس و ہوس سے آزاد ہے۔

خلق اطفال اندر زمست خدا نیست بالغ جز رسیدہ از ہوی (ردی)

کامیابی و کامرانی، مسرت و طمانیت اس مردِ بحر کا انعام ہے جس نے اپنی عقل کو محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی عقل پر قربان کر کے اپنی ذات میں تقویٰ کے اوصاف پیدا کر لیے ہیں۔ اور حق تعالیٰ کو جہاتِ دینی و دنیوی میں کافی تصور کر لیا ہے۔ ایس اللہ بکاف عبدہ۔

عقل مترباں کن پیش مصطفیٰ حسی اللہ گو کہ اللہ ام کفہ

زین حسر و جاہل ہی باید شدن دست در دیوانگی باید زدن

اوست دیوانہ کہ دیوانہ نہ شد این عس را دید و در خانہ نہ شد (ہامی)

صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین نے اسی طریقہ سے تسخر جہات میں کامیابی حاصل کی تھی، ان کے شکوہ و جلال سے سلاطین کا نپ اٹھے تھے، انہوں نے حریت و آزادی کا تسلط دنیا میں قائم کر دیا اور جبر و استبداد کا خاتمہ کر دیا تھا۔ اسی اسوہ پر ایک بار پھر زندگی کو مرتب کرنے کی ضرورت ہے۔ اور ان اوراق کا مقصد عمد حاضر کے نوجوانوں کو اس کی طرف دعوت دینا، اور اس کی تفصیلات کو ان پر واضح کرنا ہے۔

خود مولف کو اس اسوہ کی طرف کچھ سال قبل ایک عارف تام المعروف نے بلایا اور اپنی زبان فیض ترجمان سے اس کی تفصیلات کو سمجھایا اور سات سال کے دوران میں مختلف اوقات میں ہر جزی کی کئی وضاحت فرماتے رہے۔ مغربی و مشرقی فلسفہ کے گہرے مطالعہ سے جس دماغ نے تربیت پائی تھی، اور جس کی عقل کو بقول اقبال "تفید سے فرصت

لے میرا اشارہ ہے مولائی و آقائی حضرت محمد حسین صاحب قبلہ کی طرف جو ۲۲۔ ربیع الاول ۱۳۶۳ھ اپنے فراق میں محزون چھوڑ کر رفیقِ اعلیٰ سے جملے فرود و درمیان و جنتِ نعیم۔



نہ تھی اور جو بالآخر عقل کی گتھیوں کو سلجھانے سے عاجز آ گیا تھا اس "صاحبِ جنون" نے اپنے ایک نکتہ سے کہ عقل تابع وحی ہو کر ہی اپنے بتوں سے نجات پاسکتی ہے، لات و منات کی بندگی سے آزاد ہو سکتی ہے۔ اس کو دل نیاز مند و نگاہ پاک باز "کاشفا کر دیا جو حصول معرفت کا واحد طریقہ ہے۔ اس نکتہ کے قلب میں اترنے کے بعد وہی ہوا جس کی اقبال نے خبر دی تھی۔

چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود جاں چو دیگر شد جساں دیگر شود

اس روحانی انقلاب کے بعد جہان جیسا نظر آنے لگا اس کو ان صفحات میں پیش کیا گیا ہے۔ اولاً اصول موضوعہ کو پیش کیا گیا ہے، ان کو اپنی ہمت اور اختیار کے استعمال سے عمل میں لانے کی تاکید کی گئی ہے، پھر انہی اصول کو مختلف مسائل کے حل کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ سیرت سازی کے لیے خوف و خزن و غضب کے دفعیہ کے لیے، کامیاب زندگی کے لیے، طمانیت و بردِ قلبی کے حصول کے لیے ان نسخوں میں سے اکثر کو "معارف" کے صفحات میں پیش کیا گیا، اور اہل ملک نے ان کو پسند بھی فرمایا ہے۔ یہاں یہ سب یکجا حاضر ہیں، یہ اس دل کی سوغات ہیں جو عقل کا غلام نہیں!

صبح ازل یہ مجھ سے کہا جبرئیل نے  
جو عقل کا غلام ہے وہ دل نہ کر قبول! (اقبال)

مگر زبان عقل کی ہے، تصورات و تعلقات سب عقلی ہی ہوتے ہیں اور انہی میں مفہوماتِ روحانی کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ لہذا مقصود مفہوم ہے نہ کہ زبان جو محض ذریعہ ہے۔

والسلام علی من اتبع الهدی!

۲۶ مارچ ۱۹۳۵ء

میر ولی الدین





بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

## عبادت و استعانت

اے دردِ من اصل تمنا ہمہ تو سے در سر من مایہ سودا ہمہ تو  
 ہر چند بہ روزگار در می نگریم امروز ہمہ توی و فردا ہمہ تو (الوسعی ص ۸۸)

انسان بلکہ تمام حیوانات کی زندگی کا پہلا قانون جلبِ منفعت و دفعِ مضرت ہے، تحفظِ ذات اور تولیدِ نسل دونوں کے لیے ضروری ہے تاکہ وہ ان چیزوں کو طلب کرے جو اس کی زندگی کے حفظ و بقا میں مدد و معاون ہیں، اور ان چیزوں سے گریز کرے جو اس کو عدم کی طرف لیجاتی ہیں، یا قوتِ حیات کی تحدید کا باعث ہوتی ہیں۔ اشیاء کی ابتدائی تقسیم اسی نقطہ نظر سے کیجاتی ہے، اشیاء یا تو نافع ہیں یا ضار، مفید ہیں یا نقصان رساں، اچھی ہیں یا بُری؛ عضویت پر جب ان کے اثرات کا ترتیب ہوتا ہے تو لذت، محبت، فریفتگی یا اطاعت پیدا ہوتی ہے، یا الم، نفرت، خوف اور توجس۔ ان میں سے ایک بالطبع محبوب ہے، مرغوب ہے، تو دوسری فطرۃً غیر محبوب و نامرغوب، ایک کے حصول کا وہ کوشاں ہوتا ہے تو دوسرے سے گریزاں انسان کی زندگی کا تار و پود ہی جذبات ہیں، ان کا زور مردِ اقلن ہوتا ہے۔ ان کے شر و شور سے اس کو فرصت ملتی ہے اور نجات، یہاں تک کہ زندگی کے مقررہ دن ختم ہو جاتے ہیں، اور وہ یہ کہتا ہوا رخصت ہوتا ہے:

من بلغ جہاں راقصے دیدم و بس مرغش ز ہوا ہو سے دیدم و بس  
 از صبح وجود تا شاہاں گاہِ عدم چون چشم کشودم نفسے دیدم و بس (سجالی استرآبادی)

اپنی زندگی کے مختصر قیام میں ہر شخص اشیاء کی تغیر و حدوث کا اچھا مشاہدہ کرتا ہے، کائنات میں ایک دائمی تغیر جاری ہے، کوئی شے ساکن نظر نہیں آتی، سکون و ثبات فریبِ نظر معلوم ہوتے ہیں۔ ہر ذرہ کائنات میں ایک تڑپ سی نظر آتی ہے، کاروانِ وجود کو کہیں قیام نہیں، شانِ وجود ہر لحظہ تازہ ہوتی ہے، قمری تجلی ہر شے کو ہر لحظہ فنا کر رہی ہے اور حالی تجلی ہر لحظہ وجود بخش رہی ہے۔

ہستی کہ عیاں نیست دو آن در کائنات  
در شانِ دگر جلوہ کند ہر آنے  
ایں نکتہ بجز ز کَلِّ یَوْمٍ هُوَ قِیَمٌ مِّثْلَ  
گر بایست از کلام حق برمانے جاہی

اشیاء کے اس تغیر و تبدل، تکون و حدوث، فنا پذیری و زوال کی جہت جب چشم بصیرت رکھنے والے انسان پر نمایاں ہو جاتی ہے تو اپنے اپنے فقر و احتیاج کی وجہ سے ذل و افتقار یا بندگی کی نسبت جو ان سے قائم کر رکھی تھی، وہ یکدم کٹ جاتی ہے، ذواتِ خلق کا فقر اس کی نظروں میں واضح ہو جاتا ہے، اور اس کو اس ذات کی تلاش ہوتی ہے، جو حدوث و تغیر سے منزہ ہے، جو قائم بالذات و متصور بالذات ہے، جو واجب و قدیم ہے، صفاتِ کمالیہ سے موصوف ہے، فعال ہے، سارے جہان کی مالک و حاکم و مولیٰ و رب ہے۔



اب مذہب یا دین کا حاصل بھی اتنا ہی ہے، کہ ذل و افتقار کی نسبت (جس کو دین کی زبان میں عبادت و استعانت سے تعبیر کیا جاتا ہے) ذواتِ خلق سے قائم نہ کی جائے اور احتیاج اور مرادات میں استعانت ذواتِ خلق سے نہ کی جائے، بلکہ عبادت و استعانت کا مرکز ذاتِ اللہ ہے، یہی مفہوم ہے اس دعوتی کلمہ طیبہ "لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللَّهِ" کا کہ اللہ کے سوا کوئی ذات قابلِ عبادت و مستحقِ استعانت (الہ) نہیں، اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں، اس پیام کو ساری دنیا کے سامنے پیش کرنے کے لیے بھیجے گئے ہیں۔

فقر و احتیاج انسان کی فطرت میں شامل ہے، اسی فقر یا احتیاج کو رفع کرنے کے لیے وہ ہر نفع و ضرر پہنچانے والی چیز کو اپنا "الہ" قرار دیتا ہے، خواہ یہ چیز عناصر سے ہو یا اجادات سے۔

نباتات سے ہو یا حیوانات سے، فوق الفطرت ہو یا فوق البشر، ان سے رفع احتیاج کے لیے اعانت طلب کرتا ہے، اور استعانت کے لیے ان سے ذل و افتقار کی نسبت قائم کرتا ہے، اپنے جہل اور نادانی کی وجہ سے ان کو مستقل طور پر نافع اور ضار خیال کرتا ہے، اور یہی خیال اس کو اپنے سے کم تر مخلوق کے آگے سجدہ ریز ہونے پر مجبور کرتا ہے۔

جو اس کے اس التباس اور عقل کے اس دھوکے کو دور کرنے کے لیے ادین حق کا پیغام محمد نبوی (فداہ ابی و امی) نے عالم کو سنایا کہ انسان اشرف المخلوقات ہو کر، فطرت کا شہکار ہو کر اپنے سے ادنیٰ اور کمتر مخلوق کے آگے ذلیل نہیں ہو سکتا۔ اس کی گردن اگر جھک سکتی ہے تو اسی ایک ہمہ خیر، ہمہ داں و ہمہ بین و ہمہ توان مہتی کے آگے، جس کے دست قدرت میں ساری کائنات کی باگ ہے، جو جملہ صفات کمالیہ سے متصف ہے، اور تمام عیوب سے منزہ اور مبرا ہے، یہی ہستی ہماری الٰہ ہے، یہی قابل عبادت ہے، یہی مستحق استعانت ہے، یہی ہماری خالق ہے، مالک ہے، ہماری رب ہے، مولیٰ ہے، حاکم ہے، اسی کے ہم مخلوق ہیں، مملوک ہیں، مرئوب ہیں، عبد ہیں، محکوم ہیں، اسی کی ہم عبادت کرتے ہیں، اور اسی سے تمام حاجات و مرادات میں بھیک مانگتے ہیں، یہی ذات غنی ہے اور ہم سب اسی کے فقیر ہیں، اس کے فقیر ہو کر ہم سارے عالم سے غنی ہیں۔

یہ پیام صدیقی محض ہے، ہماری عزت نفس کے عین مطابق ہے، حق و خلق کے رابطہ کا سچا اظہار ہے! اس کو مان کر انسان حقیقی معنی میں انسان بنتا ہے، بے خوف، بے جگر مجاہد کی امید و بیم کا مرکز وہی ایک اللہ ہوتا ہے، جو سارے عالم کا مالک اور حاکم ہے اب مجاہد کی زندگی کی ہر جنبش اسی مالک و حاکم کے حکم کے تحت ہو جاتی ہے، اور اس کے احکام کی تعمیل میں، امر کے امتثال میں وہ ایک جان دیتا ہے، تو ہزار جان پاتا ہے۔ اس کا ضعف قوت سے، اس کی ذلت عزت سے، اس کا فقر غنا سے بدل جاتا ہے۔ موجودات عالم میں سے وہ کسی سے نہیں ڈرتا۔ فَلَا تَخَافُوهُمْ وَخَافُواْ اِنۡ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ۔ کا حکم اس کو سارے عالم سے

لے اگر تم مومن ہو تو ان سے خوف نہ کرو مجھ سے خوف کرو۔

بے خوف کر دیتا ہے، نہ وہ کسی سے اُمید ورجا رکھتا ہے، اَلَيْسَ اللهُ بِكَافٍ عَبْدَهُ اس کو ساری کائنات سے غنی کر دیتا ہے، ذواتِ خلق سے اُمید و بیم کی نسبت کٹتے ہی وہ نفسِ مطمئنہ حاصل کر لیتا ہے، اور اپنے رب سے راضی ہو جاتا ہے، اللہ کو راضی رکھ کر وہ غیر اللہ سے مستغنی ہو جاتا ہے، اب وہ غنی عن لشیئہ ہے، کوئی چیز اللہ سے بتر ہو سکتی ہے، جس کے حصول کی وہ خواہش کیے، اب سب کچھ اسے حاصل ہے۔ اسی لیے فرمایا گیا ہے لَكَيْلًا تَأْسُوا عَلَىٰ مَا فَاتَاكُمْ وَلَا تَفْرَحُوا بِمَا آتَاكُمْ ۗ عَلَوتے تکمیل اسی کو حاصل ہے، وہی مخاطب ہے اس قول کا: اَسْتَمُّ الْاَعْلَوْنَ وَاللَّهُ مَعَكُمْ ۙ

دیکھو ”الہ“ کے فہم نے اس کو کیل سے کیا کر دیا، یا تو وہ ایک حقیر اور ذلیل جانور کی طرح ہر ایک سے ڈرتا اور لرزتا تھا، ہر ایک کو نافع و ضار قرار دیتا تھا، سرِ عبودیت خم کرتا تھا، مدد و اعانت کا خواہاں تھا، ان ہی کی عبادت و عبودیت میں زندگی گزار رہا تھا۔ مشوش پریشان حیران خود ضعیف اور مطلوب بھی ضعیف ”ضَعُفَ الطَّالِبِ وَالْمَطْلُوبِ“ یا اب علم رسالت کے جاننے اور ماننے کے ساتھ ہی لا کی شمشیر ہاتھ میں لے کر وہ آگے بڑھتا ہے اور اپنے جاہل ساتھیوں سے قرآن کے الفاظ میں پوچھتا ہے:

اَفَغَيْرَ اللَّهِ تَأْمُرُونِي اَعْبُدُ اَيْهَا الْجَاهِلُونَ ۙ

تا چند گے از چوب گے از سنگ تراشی بگزر ز خدائے کہ بصد رنگ تراشی

غیر اللہ کی عبادت و عبودیت کا جو اوہ گردن سے نکال کر پھینک دیتا ہے، عمر میں پہلی مرتبہ حریت محسوس کرتا ہے، خوف کا بھاری پتھر اس کے سینے سے اٹھ جاتا ہے، اپنے حقیقی مولیٰ کے آگے جھک جاتا ہے، اور ان کو رحیم پاتا ہے، گاہِ بِالْمُؤْمِنِينَ رَحِيمًا کی بشارت

۱۔ کیا اللہ بندہ کے لیے کافی نہیں۔

۲۔ تاکہ تم غم نہ کھاؤ اس پر جو ہاتھ نہ آیا، اور نہ شیخی کرو اس پر جو تم کو اس نے دیا ہے۔

۳۔ تم ہی بلند ہو اللہ تمہارے ساتھ ہے۔

۴۔ اے جاہلو! کیا تم مجھے غیر اللہ کی عبادت کرنے کا امر کرتے ہو۔



اس کو ہر طرح مطمئن کر دیتی ہے، اب اس کو یقین ہو جاتا ہے کہ حق تعالیٰ اس کے ساتھ اپنا  
 کے بعد شانِ رحمت ہی سے پیش آئینگے، ان کے علاوہ رحیم ہونے کے حاکم و حکیم ہونا، اس  
 کے دل کو اور قوی کر دیتا ہے، وہ انہیں اپنے ہر امر میں متصرف سمجھتا ہے اور ان کے فعل  
 کو سراسر حکمت سے مملود دیکھتا ہے، ان ہی کے حکم کے مطابق ان کو اپنے کاموں میں وکیل  
 بناتا ہے فَاتَّخِذْهُ وَكِيلًا ان کا فرمان ہے كَفَىٰ بِاللّٰهِ وَكِيلًا کہہ کر وہ آزادی وطمینان  
 کے ساتھ مصروفِ عمل ہو جاتا ہے، اب کہاں یہ اور کہاں وہ جاہل جو غیر اللہ سے ذل  
 افتقار کی نسبت جوڑ رہا ہے۔ صحیح ہے:

وَمَا يَسْتَوِي الْأَعْمَىٰ وَالْبَصِيرُ وَلَا الظُّلُمَاتُ وَلَا النُّورُ وَلَا الظِّلُّ وَلَا الْحَرُورُ  
 وَمَا يَسْتَوِي الْأَحْيَاءُ وَلَا الْأَمْوَاتُ ۗ (الفاطر ۱۱)

دین کا اجمال، عبادت و استعانت، اس کا حاصل، تحفظ و توجید۔ اب اس اجمال کی کسی قدر  
 تفصیل ضروری ہے۔

عبادت غایتِ تذلل کا نام ہے جس کا اظہار عبودیت حقیقی کے آگے کیا جاتا ہے۔ اس کے  
 معروف طریقے نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ ہیں، نماز کے تمام اعمال و ارکان پر غور کرو۔ عبادت  
 یا اظہارِ ذلت کا مفہوم بخوبی تمہارے دل نشین ہو گا، عابد نماز کا قصد کر رہا ہے، مصلے کی  
 طرف بڑھ رہا ہے، زبان پر ہے۔ اِنِّیْ ذٰہِبٌ اِلَی رَبِّیْ سَیِّدِیْنَ ۙ۔ دل غیر حق سے پاک  
 ہی، حق تعالیٰ کے سوا کسی کو بزرگی کا مستحق نہیں سمجھتا، اور اسی فہم کے ساتھ تکبیر تحریمہ "المدکبر"  
 کہتا ہے اور جب حق تعالیٰ کے روبرو ہو کر کہتا ہے اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهَیْ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ  
 وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ۔ دل پوری طرح متوجہ حق ہے، ورنہ جانتا ہے  
 کہ جھوٹ کی سزا کیسا ہے یُنَادِیْعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَٰدِعُهُمْ ۗ۔ اب نیت میں بھی خلوص سچوئی

لے برابر نہیں اٹھا اور دیکھتا اور نہ اندھیرا اور اجالا اور نہ سایہ اور لو اور برابر نہیں جیتے اور نہ مردے  
 لے میں اپنے رب کی طرف چلا ہوں وہ میری ہدایت کریگا۔  
 لے دعا بازی کرتے ہیں اللہ سے اور وہی ان کو دغا دیکھا۔

ہی کے لیے نماز پڑھ رہا ہے، عاشقانہ ایمان کے پیدا ہونے کے لیے پڑھ رہا ہے، عادت کے تحت نہیں، انہی کے حول و قوت سے پڑھ رہا ہے، ثنا میں حق تعالیٰ کی عظمت و جلالت و جبروت کا اظہار کر رہا ہے، اور توحید کا اقرار لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ سے ہو رہا ہے، اب حضوری میں دست بستہ نظر نیچی کیے ذلت و مسکنت کی تصویر بنا کھڑا ہے، زبان پر جاری ہے الحمد للہ اور دل میں سمجھ رہا ہے کہ عالم میں کوئی ذات مستحق حمد نہیں، سارے محامد و محاسن کی وہی ایک ذات لا شریک لہ سزاوار ہے، جب رَبِّ الْعَالَمِينَ کہتا ہے تو جانتا ہے کہ لَا سِرَّ سِوَاہِ، ربوبیت اسی کو زیبا ہے، عالم تمام اُس کا مر بوب ہے۔ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ کہتے وقت عالم رجا میں داخل ہوتا ہے، رحمت و کرم کی اُمید دل میں پیدا ہوتی ہے، جانتا ہے کہ رحمانیت کا تعلق تو ساری کائنات سے ہے، رحیمیت خصوصی شے ہے، اور مومنین سے مخصوص گانَ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَحِیْمًا، مَا لَکَ یَوْمَ الدِّیْنِ کہتے وقت عالم خوف کا مشاہدہ کرتا ہے، روز قیامت حق ہے، اور یہ وہ دن ہے کہ اس کی شان میں فرمایا گیا یَوْمَ لَا تَمْلِکُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَیْئًا اِسْ اُمِیْدِ بَیْمٍ کِی حَالَتِیْ مِیْنِ عَرْضِ کَرْتَا ہِیْ کِی اِیَّاکَ نَعْبُدُ حَقِّ تَعَالٰی ہِم اِپ ہِی کِی عِبَادَتِ کَرْتِی ہِی ذَلِّ وَاِتْقَارِ کَارِثَتِ اِپ ہِی سِی جُوئِی ہِی، وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ اِپ ہِی سِی اسْتِعَانَتِ کَرْتِی ہِی، جانتے ہیں کہ لَا فَاِیْعَلُ فِی الْوَجُوْدِ اِلَّا اللّٰہُ مَا سِوِی اللّٰہِ سِی اِشْدِی سِی اَلکَلِیۃِ اِعْرَاضِ کَر کے اِپ ہِی کِی طَرَفِ بِالکَلِیۃِ رَجُوْعِ ہُو تِی ہِی، ہِم اِپ کے سِوَا اسْتِعَانَتِ کِی جِہْتِ سِی غِیْرِ کُو کِیُوں پِکَارِیں جِب کِی ہِی ہِی سُنَادِ یَا گِیَا ہِی اُو دِہِم نے بھِی تَجْرِبِہِ سِی اِس کِی تُو ثَبِیْقِ کَر لِی ہِی کِی اِپ کے سِوَا کِی ہِی حَوْلِ قُوْتِ نَہِیں لَّا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰہِ اِس لِی ہِی کِی وہ نہ ہِی نَفْعِ پَنِچَا سِکْتِی ہِی، نہ ضَرر، اِس مَدْحِ و شَاوَا قِرَارِ عِبُوْدِیْتِ کِی بُو دِ التَّمَا سِ و دَعَا اِہْدَا الصِّرَاطِ الْمُسْتَقِیْمِ حَقِّ تَعَالٰی رَاہِ مُسْتَقِیْمِ کِی تِہْرَا فَرَاکِی نَفْسِ دِہُو ی سِی چھوٹِیں، اِپ کَا قَرَبِ نَصِیْبِ ہُو، صِرَاطِ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْہِمْ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْہِمْ وَلَا الضَّالِّیْنَ۔ اہل ایمان کی راہ پر چلنا نصیب ہو، جو انبیاء و

لہ جس دن نہ کرے کوئی نفس، کسی نفس کا کچھ۔

اولیاء کی راہ ہے، یہی اہل انعام ہیں وَالَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّينَ وَالصَّادِقِينَ وَالشُّهَدَاءِ  
وَالصَّالِحِينَ۔ مغضوبین وصالین کی راہ نہیں جنہوں نے غیر اللہ سے عبادت و استعانت کا  
رشتہ قائم کر کے ہمیشہ کے خسارہ میں اپنے کو مبتلا کر لیا۔ اُولَئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ الَّذِينَ خَسِرُوا  
أَنْفُسَهُمْ!

اس حمد و ثنا، التماس و دعاء کے ساتھ وہ کلام ربانی کی چند اور آیتیں احکام خداوندی  
کے معلوم کرنے، تکرار سے ان کو اپنے ذہن میں جانے، ہر حرف کی تلاوت پر دس نیکیاں کمانے  
اور حق تعالیٰ سے سرگوشی کرنے کے لیے پڑھتا ہے، اور پھر فوراً پیشی میں جھک جاتا ہے، گویا اپنے  
رحمان و رحیم آقا کے پیٹ میں موٹی دے دیتا ہے، اس طرح اپنی ذلت کا مزید اظہار کرتا  
ہے، اسی حالت میں اس کی زبان سے اس کے مولیٰ کی تقدیس و تزیین و تحمید جاری ہوتی ہے  
اپنی بے مائیگی، فقر و ذلت کا احساس قلب میں واضح طور پر موجود ہوتا ہے، جب سر اٹھاتا  
ہے تو حق تعالیٰ اسی کی زبان سے فرماتے ہیں سَمِعَ اللَّهُ لِمَنْ حَمِدَهُ اس طرح اس کا مرتبہ  
بلند کرتے ہیں۔ جو سر موجود حقیقی کے آگے جھکتا ہے، وہ مخلوق کے آگے جھک نہیں سکتا، وہ  
سب سے بلند ہوتا ہے، ممتاز ہوتا ہے، بے نیاز ہوتا ہے، وہ ایک لاقیمت جوہر ہوتا ہے،  
سچ ہے۔ من رکن الی المولیٰ و مال الیہ احرقہ اللہ بنورہ حتیٰ یصیرہ جوہراً لاقیمتاً لہ  
اس سرفرازی کے شکر میں وہ حق تعالیٰ کی حمد کرتا ہے، اور پیروں پر گر جاتا ہے، پیر پر لیتا ہے  
اور اس طرح غایت تذلل کا اظہار کرتا ہے، زبان پر آقا کی عظمت و رفعت و علو کا اقرار جاری  
ہوتا ہے! اس اظہار تذلل میں وہ اپنی آنکھ کی ٹھنڈک پاتا ہے و جعلت قرۃ عینی فی الصلوٰۃ  
یہ آنکھ کی ٹھنڈک اس کو اپنے محبوب مولیٰ کے مشاہدہ سے ہو رہی ہے، یہی اس کا کمال ہے  
یہی اس کی معراج ہے۔ الصلوٰۃ معراج المؤمنین۔

۱۔ جو اپنے مولیٰ کی طرف جھکتا ہے، اور اس کی طرف مائل ہوتا ہے تو وہ اس کو اپنے نور سے جلا دیتا ہے، یہاں تک  
کہ وہ لاقیمت جوہر ہو جاتا ہے۔

۲۔ میری آنکھ کی ٹھنڈک نماز میں رکھی گئی ہے۔ (لسانی باب عشرۃ النساء)



معبود کا نہ صرف خیر محض ہونا ضروری ہے، بلکہ اس کا ہمہ توان یا قادر مطلق ہونا بھی لازمی ہے، یہ اپنی لامحدود قوت اور لامتناہی طاقت کی وجہ سے ہماری حفاظت کرتا ہے، ہماری حاجتوں کو پورا کرتا ہے، مرادوں کو بر لاتا ہے، اس کے اعتصام کے بعد ہمیں اس کی نصرت و اعانت کا قطعی یقین ہو جاتا ہے، شرک کے مسئلہ کی توجیہ سے عاجز ہو کر تاجیہ (Pragmatist) نے خدا کے ہمہ توان ہونے کا انکار کر دیا، لیکن جو خدا قادر مطلق نہ ہو، وہ معبود حقیقی کب قرار

دیا جاسکتا ہے، جو خود شر پر غالب نہ ہو ہماری، وہ کیسے کر سکتا ہے، ہمارا مولیٰ اور نصیر کیسے ہو سکتا ہے۔ شرکی توجیہ کا یہ موقع نہیں، لیکن ہم اپنے معبود کو فعال مطلق، ہمہ توان مانتے ہیں، افعال و آثار کا مرجع اسی کو قرار دیتے ہیں، حول و قوت کا اسی کو مبدی سمجھتے ہیں، اسی لیے اس سے استعانت چاہتے ہیں، اور اس کے "نعم المولیٰ ونعم النصیر ہونے کا یقین رکھتے ہیں۔ اعتصموا باللہ ہو مولکم نعم المولیٰ ونعم النصیر!

جب قوت صرف اسی کو حاصل ہو لا قوۃ الا باللہ حرکت کا بھی وہی مبدی ہر احوال و لا قوۃ الا باللہ تو فعل جو حرکت و قوت ہی کا نتیجہ ہے، صرف حق تعالیٰ ہی کے لیے ثابت ہوتا ہے اور ذاتِ خلق سے اس کی بالکل نفی ہو جاتی ہے۔ اس حقیقت کے سمجھتے ہی اس کی بصیرت سے غفلت کا پردہ اٹھ جاتا ہے، اور وہ لا تتحرك ذرة الا باذن اللہ کے معنی سمجھ جاتا ہے، غیر اللہ سے استعانت کی نسبت کاٹ کر اسلم عبدی واستسلم کامصلح بن جاتا ہے!

اپنے رب سے استعانت کے طریقے کیا ہیں؟ بصیرت محمدیہ نے جن طریقوں کی تعلیم فرمائی ہے، ان میں سے بعض یہ ہیں۔

اپنی حاجتوں اور مرادوں میں حق تعالیٰ سے دعا کرو۔ دعا کا حکم ہے، اور اجابت کا وعدہ

۱۔ زمانہ جدید کے فلسفیوں کا ایک گروہ جن میں ولیم جیمس، ایم جی ولس، ہزارڈ ٹاؤ وغیرہ داخل ہیں۔

۲۔ تمہیں اپنے مولیٰ کا اعتصام چاہیے، وہی تمہارا اچھا مولیٰ ہے، اور اچھا دعا گار۔

۳۔ کوئی ذرہ بغیر اللہ کے حکم کے حرکت نہیں کرتا۔

ادعونی استجب لکم فی تعالیٰ جو دعویٰ محض ہے، عطا محض ہے، ان میں بخل کا شائبہ نہیں، یا یوسیٰ و محرمی ان کی درگاہ سے نہیں تفتی کے لیے فرما رہے ہیں۔ لَا تَأْتِسُوا صِنْفًا مِّنْ رِّحَالِ اللَّهِ۔ وہ حکیم بھی ہیں، ان کا ہر فعل حکمت رکھتا ہے، وہ ہمارے خیر کو ہم سے بہتر جانتے ہیں، اگر وہ ہماری کسی دعا کو قبول نہیں فرما رہے ہیں تو اسے نہ قبول فرمانے ہی میں ہمارا فائدہ ہے، اسی لیے کہا گیا ہے منعاً عطاءئہ مرد کا کمال اس میں ہے کہ ان کے منع کو عطا جانے، کسی عاشق نے اسی جذبہ کے تحت کہا ہے :

اگر مراد تو ہے دوست نامرادی ماست مراد خویش دگر بار من نخواہم خواست  
سیدنا عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرمایا کرتے تھے لَا بَالِي عَلِيٍّ اِي حَالٍ اَصْبَحَ عَلِيٌّ مَا  
اَكْرَهَ لَوْ عَلِيٌّ مَا احْتَبَ لَانِي لَ اَدْرِي الْخَيْرَ بَهْمَا۔ حق تعالیٰ خود ہیں تعلیم فرما رہے ہیں اور  
ایک نہایت دقیق نکتہ کی تعلیم فرما رہے ہیں :-

عَسَىٰ اَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَعَسَىٰ اَنْ تُحِبُّوا شَيْئًا وَهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ وَاللّٰهُ

يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ (البقرہ - ۱۰)

اسی نکتہ کو سمجھ کر عارف کہنے لگتے ہیں، ہمہ آں باد کہ او خواہد آن مباد کہ ما خواہیم اور خواہ  
شبلی نے عارف کی تعریف ہی اس طرح کر دی کہ ”عارف اوست کہ منع نزد او دست تراز  
عطا باشد“ یہیں سے رضا کا مقام شروع ہو جاتا ہے، جو استعانت کا بلند ترین طریقہ ہے۔  
بہر حال اگر حق سبحانہ تعالیٰ کسی حکمت و مصلحت سے بندہ مومن کی دعا کو قبول نہیں فرماتا  
تو اس کے قلب کی حفاظت فرما دیتے ہیں، مطلوب کی جانب سے خیال پلٹ دیتے ہیں

اللہ کی رحمت سے یا یوس نہ ہو۔ اللہ مجھے اس امر کی پروا نہیں کہ میں کس حال میں صبح کرونگا، ایسی حالت  
میں جس کو میں پسند نہیں کرتا یا ایسی حالت میں جس کو میں پسند کرتا ہوں، کیونکہ میں نہیں جانتا کہ میرے لیے بہلائی  
کس حالت میں ہے۔

اللہ شاید کہ بری لگے تم کو ایک چیز اور وہ بہتر ہو تمہارے حق میں، اور شاید تم کو کھلی لگے ایک چیز، اور وہ بری ہو  
تمہارے حق میں، اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

حکایت شکایت، جزع فزع کی طرف مائل نہیں کرتے، رضا کے مقام میں پہنچا دیتے ہیں، اور وہ لکل اجل کتاب کہہ کر حق تعالیٰ سے راضی ہو جاتا ہے، اجابت دعا کی ایک صورت یہ بھی ہوتی ہے کہ مطلوب تو حاصل نہیں ہوتا، لیکن حق تعالیٰ اس کی دعا کو رد نہیں فرماتے بلکہ اس کی کسی بلا کو رد کر دیتے ہیں، گو اس کو بدل کا علم نہیں ہوتا، ایک آخری صورت یہ بھی ہے کہ دعا اگر وہ دنیا میں نہیں پاتا تو آخرت کے لیے یہ ذخیرہ کیا جاتا ہے۔

ان العبد یروی فی صحائفہ یوم القیامۃ حسنات لا یعرفہا فیقال انھا بدل سواک فی الدنیا لہ یقدہ فضاہ فیہا (حدیث)

قیامت کے دن بند اپنے اعمال نامہ پر وہ نیکیاں دیکھگا، جن کو وہ نہیں پہچانے گا۔ اس سے کہا جائے گا کہ یہ اس سوال کا بدل ہیں جو تو نے دنیا میں کیا تھا۔ لیکن تیرے مقدر میں دنیا میں ان کا طمانہ تھا۔

ہر صورت اجابت دعا کا وعدہ سچا ہے، لیکن یہ وعدہ مطلق ہے، مقید نہیں کہ اسی وقت اور اسی صورت میں پورا کر دیا جائے، جس وقت اور جس صورت میں کہ بند نے دعا مانگی ہے، فافہم۔ اگر آپ اس نکتہ کو سمجھ جائیں تو پھر آپ کو معلوم ہو جائیگا کہ کیوں رسول عربیؐ نے اس کی تعلیم فرمائی تھی۔

اللہم اکنفی کل مہم من حیث شئت و کیف شئت و انی شئت و من این شئت

استعانت کا دوسرا طریقہ اپنے کاموں میں حق تعالیٰ پر توکل کرنا ہے، اگر ہمیں اس بات کا یقین ہو، محض علم نہیں، یعنی تحقیق ہو، محض تعقل نہیں، یا جدید نفسیاتی اصطلاح میں یوں کہو کہ اگر یہ بات ہمارے تحت الشعوری نفس میں اتر گئی ہو، کہ فاعل حقیقی حق تعالیٰ ہیں، کرنے والے خود بدولت ہیں، افعال و آثار کا مرجع خود ہیں، حول و قوۃ کا مبداء خود ہیں، اور پھر اس کا بھی یقین ہو کہ ایمان کے بعد وہ رحیم بھی ہیں۔ کان بالموءنین رحیما۔ ولی ہیں، واللہ ولی المؤمنین۔ تو ہم اپنے تمام امور ان کو تفویض کرنے میں خوشی سے آمادہ ہو جائیں گے، اور اس تفویض کے ساتھ ہی فکر سے آزاد ہو جائیں گے، طمانیت و مسرت سے ہمارے

قلوب بھر جائینگے، اور کسی مستِ محبت کے الفاظ میں کہہ اٹھینگے۔

وكلت الى المحبوب امرى كله فان شاء احياني وان شاء اتلفني

توکل

توکل اپنی حول و قوت سے بری ہونے ہے، اعتصام باللہ ہے۔ ذوالنون نے توکل کی تعریف اسی طرح کی ہے: التوکل ترك تدبير النفس والانخلاع من الحول والقوة، اور سری سقطی نے بھی ان کے ساتھ اتفاق کیا ہے التوکل الانخلاع عن الحول والقوة، ان تعریفوں کا ماخذ حدیث نبوی: لا حول ولا قوة الا بالله اور قول عز و جل لا قوة الا بالله توکل قلبی عمل ہے، یعنی قلب میں یقین جاگزیں ہو کہ مجھ میں اور کسی شے میں نہ اثر ہے نہ قوت ہے، نہ حرکت ہے، مجھ میں اور ہر شے میں اثر و قوت و حرکت حق تعالیٰ ہی پیدا کرتے ہیں، وہ جس طرح میرے خالق ہیں میرے افعال کے بھی خالق ہیں، خلفتكم و ما تعملون۔ میرے اقتضائے فطرت کے عین مطابق افعال کی تخلیق فرما رہے ہیں، میرا اقتضائے میرا اختیار ہے، لیکن فعل کی تخلیق حق تعالیٰ کی جانب سے ہو رہی ہے۔ اس لیے اسبابِ قطعہ کے استعمال و اختیار کا مجھے حکم ہے، حکم کے تحت میں ان کو استعمال کر رہا ہوں جانتا ہوں کہ اگر مجھے اولاد کی خواہش ہو تو جماع کو ترک نہیں کر سکتا، بھوک کی تشفی کے لیے نوالہ کا اٹھانا اور اس کا چبانا اور حلق سے نیچے اتارنا قطعی ضروری ہے، توکل یہاں تک عمل و تعطل کا نام نہیں، علم و حالت کا نام ہے، قلبی کیفیت کا نام ہے، اس یقین کا نام ہے کہ ہاتھ میں قدرت، حرکت، فعل سب حق تعالیٰ ہی کے حکم سے پیدا ہوئے ہیں، ان کی مشیت اور ارادے سے پیدا ہوئے ہیں، وہ چاہیں تو نوالہ منہ تک نہ پہنچے، ہاتھ شل ہو جائے، کھانا بھی چھین جائے، نظر ان کے فعل پر ہے، فضل پر ہے۔ اپنے زور بازو پر نہیں، کسب پر نہیں، دست بکا ردل بیار! توکل ترک اسباب نہیں، ترک رویت اسباب پر

لے میں نے اپنا کام اپنے محبوب کے حوالہ کیا، خواہ اب وہ مجھے زند رکھے یا مار ڈالے۔

مے توکل اپنے نفس کی تدبیر کو چھوڑنا، اور اپنی حول و قوت سے نکل آنا ہے۔ مے حضرت شاہ میر قبلہ



مہادیات کو سمجھ جانے کے بعد رزق کے مسئلہ پر ذرا غور کرو۔ رزق کا ذمہ حق تعالیٰ نے لیا ہے۔ وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا <sup>۱</sup> صرف ذمہ داری پر اکتفا نہیں کیا، قسم بھی کھائی ہے، صرف قسم پر اکتفا نہیں کیا، مثال بھی بیان کی ہے۔ وَفِي السَّمَاءِ مِثْقَاتٌ مِّنْ مَّا تَوَعَّدُونَ، فَوَرَبِّ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ إِنَّهُ لَنَحَقٌّ مِّثْلَ مَا أَنَّكُمْ تَنطِقُونَ <sup>۲</sup> (پارہ ۲۶ رکوع ۱۱) حق تعالیٰ ان لوگوں کو بھی رزق دیتے ہیں، جو غفلت و معصیت میں مبتلا ہیں، فسق و فجور میں چور ہیں، پھر جو ان کی اطاعت و رعایت کرتے ہوں، وہ کیسے محروم ہو سکتے ہیں۔ دیکھو جو درخت بوتل ہے وہی سینچتا بھی ہے؛ خلقت کو وہی مدد دیتا ہے، جو ان کا خالق ہے، مخلوق کے لیے یہ بات کافی ہے کہ ان کا خالق ان کو کافی ہے اَلَيْسَ اللَّهُ بِكَافٍ عَبْدًا <sup>۳</sup>۔ ایجاد ان سے ہے، دوام امداد بھی ان ہی سے ہے، تخلیق ان سے ہوئی، رزق کا دینا بھی ان کے ذمہ ہے، اس کی مثال انسان اپنے نفس میں پاتا ہے، یہ جب کسی کو گھر پر دعوت دیتا ہے تو ان کے لیے غذا کا بھی انتظام کرتا ہے، حق تعالیٰ نے جب ہمیں اپنی مشیت ارادے سے پیدا کیا ہے تو رزق کی ذمہ داری بھی انہی پر ہے، ان ہی کے خوانِ کرم سے ہمیں برگ و نوا حاصل ہے، حق تعالیٰ ہمارے مولیٰ ہیں، آقا ہیں، ہم ان کے عبد ہیں، غلام ہیں، اب آقا پر غلام کا تفقد ضروری ہے، جس طرح کہ غلام پر آقا کی اطاعت واجب ہے، اگر ہم ان کے ہو رہیں، ان کے سوا نہ کسی کی عبادت کریں نہ کسی سے حاجت و مراد براری چاہیں تو کیا یہ ممکن ہے وہ اپنا حق ادا نہ کریں؟ اس کی بشارت اس آیت کریمہ میں دے دی ہے :-

مَنْ يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَلْ لَهُ مَخْرَجًا وَ  
يَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ  
جو تقویٰ اختیار کرتا ہے اللہ اس کے لیے راستہ  
نکالتے ہیں اور ایسی جگہ سے رزق فراہم کرتے ہیں جہاں

لہ اور زمین پر کوئی ایسا چوپایہ نہیں جس کے رزق کا ذمہ اللہ پر نہیں۔ <sup>۱</sup> لہ اور آسمان میں ہر روزی تمہاری اور جو تم سے وعدہ کیا گیا، سو قسم سے آسمان و زمین کے رب کی کہ یہ بات تحقیقی ہے جیسے کہ تم بولتے ہو۔ <sup>۲</sup> لہ مثالیں ابو العطا اسکندری لکھی ہیں۔

وَمَنْ يَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ فَهُوَ  
حَسْبُهُ .  
ہر اللہ اس کے لیے کافی ہے۔

رزق کا وعدہ قطعی، صرف ہمیں اپنا حق عبادت و عبودیت ادا کرنا ہے، پھر نامکن ہے کہ وہ ہمیں اپنے  
گھر بلائیں اور پھر ہم اپنے احسانات سے محروم رکھیں، جو بخشی کریں اور پھر مدد نہ کریں، ہمت  
کریں اور اپنے کرم سے محروم رکھیں، اپنا حق (عبادت) ہم سے طلب کریں اور ہمارا (حق) رزق  
ہمیں نہ دیں! وہ کریم ہیں ان سے معاملہ کر کے ان کی خدمت ادا کر کے کون خسارہ میں رہتا ہے،  
من الذي سألك فخرته والجا إليك فاهملته او تقرب اليك فأبعدته

اوهرب اليك فطردته؟ (از اسبوع حضرت غوث اعظمؒ)

اسی خیال کے تحت کسی عاشق نے کہا ہے۔ "گمان تو انیست کہ از رزق چارہ نیست

اما رزق راز تو چارہ نیست"۔

بدنالی روزی چہ باید دوید تو بنشین کہ روزی خود آید پدید

ایک دوسرے عاشق نے اسی خیال کو یوں ادا کیا ہے :

ہیں توکل کن ملرزاں پاو دست رزق تو بر تو ز تو عاشق ترست

بہر حال اتباع نبوت اسی میں ہے کہ رزق کی طلب میں کوشش کریں لیکن

اجملو انی الطلب کو پیش نظر رکھ کر اور یاد رکھیں کہ ہماری طلب رزق کے حصول کا مستقل

سبب یا قطعی علت نہیں، شاہ عبدالحق محدث دہلویؒ شارح فتوح الغیب نے مسئلہ کو

اجمالاً خوب ادا کیا ہے "بعد از طلب می یابی اما نہ بطلب می یابی" یہی مفہوم اس شعر میں ادا

ہوئے :-

بجستجوئے نیابد کسے مراد دلی کسے مراد سیابد کہ جستجو دارد

لے وہ کون ہے جس نے تجھ سے سوال کیا، اور تو نے اس کو محروم رکھا، یا تجھ سے ملتی ہو اور تو نے اس کو بیکار

چھوڑا، یا تجھ سے ملاپ چاہا اور تو نے اس کو دور کر دیا، تیری طرف دوڑ کر آیا، اور تو نے اس کو دھتکار دیا۔

لے یعنی دنیا کمانے میں دل توڑ کر کوشش نہ کرو۔

شعر کا مطلب یہ ہے کہ جستجو کو مرادِ یابی کی مستقل علت قرار نہ دینا چاہیے کیونکہ معاملہ فضل پر منحصر ہے، ہاں جستجو ضرور کی جائے، عادت الہی یہی ہے کہ حرکت میں برکت دیتے ہیں۔

استعانت کا تیسرا طریقہ مصیبتوں میں صبر کرنا ہے۔ دنیا دار الحزن ہے، دار الحزن ہے، "سجن ہر" (قید خانہ) غم کی وادی ہے، شیطان کی دکان ہے جس میں سوا شر و فساد کے کچھ نہیں،

أَفِ لِلدُّنْيَا وَأَيَّامِهَا فَانَهَا لِلْحَزْنِ مَخْلُوقَةٌ  
هُم مَهَالَا تَقْضَى سَاعَتُهُ عَن هَلِكٍ فِيهَا أَوْ سَوْقَةٍ

درویش ہو کہ شاہ، امیر ہو کہ گدا سب غم و ہم میں مبتلا ہیں ہدفِ بلا ہیں، لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي كَبَدٍ۔ چونکہ حق تعالیٰ ہی ہماری غم سے آزمائش کرتے ہیں مصیبت میں مبتلا کرتے ہیں، رَلَاتے ہیں اور ہنساتے ہیں وَأَنَّهُ هُوَ أَصْحَابُكَ وَأَنْكِ۔ مارتے اور جلاتے ہیں وَأَنَّهُ هُوَ أَمَاتٌ وَأَحْبَبِي۔ اور غنی کرتے اور فقیر کرتے ہیں وَأَنَّهُ هُوَ أَغْنَىٰ وَأَقْنَىٰ۔ اس لیے حق تعالیٰ ہی ہمیں مصائب سے بچنے کا طریقہ بھی بتاتے ہیں، اور وہ طریقہ صبر ہے، کیا حکیمانہ ارشاد ہے۔  
يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اصْبِرُوا وَصَابِرُوا وَرَابِطُوا وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ

ایمان والو موجودہ مصائب پر صبر کرو، دوسروں کے ساتھ صبر و استقلال سے کام لو (صابر و رابط) اور ایسے کاموں میں ثابت قدم رہو جس کا وقت ابھی نہیں آیا (رابطوا) اور اللہ سے ڈرو اسی میں تمہاری فلاح و بہبودی ہے، یہی نجات کا راستہ ہے، صرف صبر اور حق تعالیٰ ہی کے حکم پر اصبر لحکم ربك اور حق تعالیٰ ہی کے لیے وما صبرك الا بالله ہاں صرف صبر کرنے سے مصائب کی برداشت سہل ہو جاتی ہے، غم کے بادل جھٹ جاتے ہیں، فکر کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے، اسباب کی راہ سے اگر انسان مصائب کو دور کرنا چاہے، غم سے گلہ خلاصی حاصل کرنا چاہے اور راحت کی امید باندھے تو سولے حسرت و یاس کے کچھ نہیں ملتا، مولانا

۱۔ قول یحییٰ بن معاذ۔ ۲۔ دنیا دارِ ایام دنیا پر افسوس ہو کہ وہ حزن و غم کے لیے بنائی گئی ہے، اس کے غم ایک گھڑی کے لیے خم نہیں ہوتے، خواہ بادشاہ کے لیے ہوں یا بازاری آدمی کے لیے۔

۳۔ ہم نے انسان کو سختی میں پیدا کیا۔ (الآیہ)

روم نے اسی چیز کو کس خوبی سے ادا فرمایا ہے۔

گر گریزی با اُمید راتے ہم از آنجا پیشت آید آفتے

ایچ کنجے بے ددو بے دام نیست جز بخلوت گا حق آرام نیست

حق تعالیٰ سے اگر محبت ہو، اور مصیبت کو ان ہی کی طرف سے دیکھے، تو مصائب کا آسان ہونا ضروری ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھو کہ تم ایک تاریک کمرے میں ہو، کوئی چیز تمہیں آ لگی، اور تم تڑپ اٹھے، تمہیں معلوم نہیں کہ مارنے والا کون ہے، جب تم نے چراغ منگوا یا اور دیکھا کہ یہ تو تمہارا شیخ ہے، یا باپ ہے، یا کوئی عزیز، محبوب ہستی ہے جس سے تم کسی صورت میں آزار کی توقع نہیں کر سکتے تو تمہارا یہ جاننا بیشک تمہاری تسلی اور صبر کا باعث ہوگا۔ کیونکہ تم اس تکلیف میں بھی دقائقِ لطف کا معائنہ کرو گے۔ اسی طرح وَلِیْرَبَّکَ فَاصْبِرْ میں حق تعالیٰ اپنے بندہ خاص سے بطریقِ منت فرما رہے ہیں کہ اپنے پروردگار کی رضا و خوشنودی کے لیے اس کے حکم و بلا پر صبر کر، کیونکہ ایمان کی جلالت اس وقت تک حاصل نہیں ہوتی جب تک کہ تیرا کاہنہ نہ بنے ۶

من ساختہ جاں را ہدف تیر بلایت!

اگر تم کو حق تعالیٰ کے بچہ مرہبان، رحیم، اور ودود ہونے کا یقین ہو جائے اِنَّ اللّٰهَ بِکُمْ لَرَفِیْقٌ رَّحِیْمٌ پر ایمان ہو گا اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ پر اذعان ہو، اور وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِیْمِ پر ایقان قائم ہو جائے، تو پھر تم اپنے دکھ درد کو پوشیدہ رحمت سمجھو گے۔ مثالوں سے اس نکتہ کو سمجھو، مشفق باپ اپنے بچے کو بچھنے لگاتا ہے لیکن دکھ پہنچانا مقصود نہیں ہوتا، فاسد خون جو اس کے بدن میں زہر ہے آسان طریقہ سے نکال رہا ہے، ماں اپنے چھوٹے بچے کو غلیظ دیکھنا نہیں چاہتی، صابون اور گرم پانی سے اس کو نہلاتی اس کے جسم کو رگڑتی اور مالش کرتی ہے، بچہ چیختا چلاتا ہے، دکھ محسوس کرتا ہے، لیکن ماں کا مقصد آزار پہنچانا نہیں ہوتا، تمہارا

لہ یہ مثال ابوالعطا اسکندری نے دی ہے۔ پتھر پیریاں استعمال کی گئی۔



خیر خواہ طبیب تمہیں ایارح دیتلے ہے، اور تم اُسے ناپسند کرتے ہو، لیکن اگر وہ تمہارے اختیار کا اتباع کرے تو شفا تم سے کوسوں بھلے گی، اگر تم کو کوئی ایسی چیز نہ دی جائے جس پر تمہارا دم نکل رہا ہو اور تمہیں یہ ابھی طرح معلوم ہو جائے کہ یہ نہ دینا عین شفقت و مہربانی کے باعث ہے تو تم کہو گے کہ یہ نہ دینا ہی میرے حق میں دینا ہے۔ شیخ ابو الحسن شاذلی نے کیا خوب فرمایا ہے:

جان لو کہ اگر حق تعالیٰ تم کو کوئی چیز نہیں عطا فرماتے تو ان کا نہ دینا ہی دینا ہے لیکن نہ دینے میں دینا وہی سمجھتا ہے جو صدیق ہے عَسَىٰ اَنْ تَكُوْهُوَ اَشْيَا وَّيَجْعَلُ اللّٰهُ فَيْءَ خَيْرًا كَثِيْرًا

میں اسی راز کی طرف اشارہ ہے، اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شاید پر بھی اسی طرح شکر فرماتے، جس طرح کہ نعمتوں پر الحمد لله علی مایساء ویتبرک

صرف ایمان کی ضرورت ہے اور شدتِ حب کی، ہر مصیبت کے وقت حق تعالیٰ کی جو تجلی ہوتی ہے مومن کو اس تجلی میں ایسی جلالت نصیب ہوتی ہے کہ وہ سختیِ عم کو آسانی سے جھیل لیتا ہے اور اکثر اوقات غلبہِ تجلی سے اس کو دکھ بھی نہیں محسوس ہوتا یہ بات اگر تمہاری سمجھ میں نہ آ رہی ہو تو زلیخا پر طعنہ کرنے والی حسین بیبیوں کے حال پر غور کرو۔ یوسف کے ہوش رہا جمال سے وارفتہ ہو کر انہوں نے اپنا ہاتھ کاٹ لیا، اور خبر بھی نہ ہوئی کہ درد کیا چیز ہے۔ فَلَمَّا رَاٰ اٰيٰتَهُ الْكٰبِرٰتِ وَقَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ ۙ ذٰلِكَ حٰلٌ مِّنْ حٰلِهَا

تھیں ۵

این است کہ خوں خوردہ دل بردہ بسورا بسم اللہ اگر تاب نظر است کسے را شاید ہی معنی ہیں عرفا کے اس قول کے کہ "انسِ قریب سے اور اکِ الم مفقود ہو جاتا ہے۔ ایمان اور محبت میں پختہ ہونے کے بعد تم کو بیماریوں، بلاؤں، فاقوں میں وہ اسرارِ لطف و رحمت نظر آنے لگیں گے کہ تم کہہ اٹھو گے کہ رسول اللہ نے سچ فرمایا حَفَّتِ الْجَنَّةُ

۱۔ شاید تم کسی چیز کو برا جانو اور اللہ تعالیٰ نے اس میں خیر کثیر رکھی ہو۔  
 ۲۔ شکر ہے اللہ تعالیٰ کا اس چیز پر جو بُری معلوم ہو، اور جو خوش نظر آئے۔  
 ۳۔ پھر جب دیکھا اس کو ششدر رہ گئیں اور کاٹ ڈالے اپنے ہاتھ۔

بالمکارۃ و محقت النار بالشہوات۔ بلاؤں اور مصیبتوں سے نفس دب جاتا ہے، ذلیل و خوار ہو جاتا ہے، حق تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے، ان سے ربط قائم کر لیتا ہے، اور سمجھوں سے ٹوٹ جاتا ہے، خلق سے فانی ہو جاتا ہے، غم سے زیادہ مؤثر سیرت سازی کے لیے کوئی اور شے نہیں، غم ہی کے ذریعہ نفس کی خامیاں دور ہوتی ہیں، قلب کا تزکیہ ہو جاتا ہے، روح کا تجلیہ ہو جاتا ہے۔ بلاؤں کی وجہ سے اگر تم نے اپنے امراضِ قلبی کا معالجہ کر لیا، استقامت پیدا کر لی، تو یاد رکھو کہ غم نے تمہیں فوزِ عظیم کے حاصل کرنے میں مدد دی، اور ایسے غم پر ہزاروں خوشیاں قربان ہیں، وہ خوشیاں جن کی وجہ سے تم شہوتوں میں گرفتار تھے، ہو اور ہوس کے شکار تھے، ظلمتوں میں گھرے ہوئے تھے اور نور سے دور تھے! حق تعالیٰ سے تمہارا کوئی ربط نہ تھا، شیطان تمہارا قرین تھا، تم پر مسلط تھا، اور اس وعید کے تم مصداق تھے:-

وَمَنْ يَعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ يَقِضْ لَهُ شَيْطٰنًا فَاَهْوَلُ قَرِيْنًا

بلا کے اسی فلسفہ سے واقف ہو کر حضرت عمرؓ نے فرمایا تھا کہ فضل عیش (بہترین زندگی) ہم نے صبر میں پائی، حضرت ابو بکر صدیقؓ بیمار ہوئے، لوگوں نے عیادت کی اور کہا کیا ہم طبیب کو بلائیں؟ فرمایا، طبیب نے مجھے دیکھ لیا۔ کہا کہ پھر کیا کہا؟ فرمایا کہ یہ کہا ہے کہ اِنِّيْ فَعَالٌ لِّمَا اُرِيْدُ، معروف کرخی فرمایا کرتے تھے لیس بصادق فی دعواہ من لم یبتلذذ بضرب مولاہ جو اپنے مولا کی ضرب سے متلذذ نہیں ہوتا وہ سچا غلام نہیں، اپنے دعوائے عبودیت میں صادق نہیں، بعض عارفین کی جیب میں یہ لکھا رہتا تھا وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَاِنَّكَ بِاَعْيُنِنَا مصیبت کے وقت اس پر نظر ڈالتے اور محض اس خیال سے کہ حق تعالیٰ ہماری اس مصیبت کو جانتے ہیں، دیکھ رہے ہیں، جھوٹے رقص کرتے۔ رسول اللہؐ نے اس آیت پر

لے جنت تو ان باتوں سے گھری ہوئی ہے جو نفس کو ناگوار ہیں، اور دوزخ شہوتوں، خواہشوں سے گھری ہوئی ہے۔ لے اور جو کوئی آنکھ چراتے رحمن کی یاد سے، ہم اس پر مقرر کردیں ایک شیطان پھر وہی ہے اس کا ساتھی۔ لے وہی کرتا ہوں جو میں چاہوں۔ لے اپنے رب کے حکم پر صبر کرو، کیونکہ تو ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔

وجد فرمایا تھا اور ام المؤمنین عائشہ صدیقہؓ آپ کے پاؤں پر گر گئی تھیں، اس لیے سلف کے بعض بزرگ تعزیتِ مصائب یوں کیا کرتے تھے اصبر لحکم ربک اس کے ساتھ اس قول نبی صلعم کا سنا دینا بھی مومن کی خاص تسلی کا باعث ہوگا:

اِذَا احْتَبَّ اللهُ عَبْدًا ابْتِلَاہُ      جب اللہ بندہ سے محبت کرتا ہے تو اس کو مصیبت  
فَاَنْ صَبَرَ اجْتَبَاہُ وَاِنْ رَضِيَ      میں مبتلا کرتا ہے۔ اگر وہ صبر کرے تو اپنا پسندیدہ اور  
اصطفاهُ۔      راضی رہے تو برگزیدہ بنا لیتا ہے۔

اب ایک کئی نفسیاتی قانون پر غور کرو، انسان کے لیے مصیبتوں اور آفتوں کا برداشت کرنا اس وقت کسی قدر آسان اور سہل ہوتا ہے جب اس کو کسی اچھے بدل کی توقع ہوتی ہے۔ مثلاً اگر میں اپنے وطن سے دور، اہل و عیال سے مجھ کو کسی جگہ تمام دن محنت و مشقت میں گزار رہا ہوں، تو واقعی میرے لیے یہ ایک مصیبت ہے، لیکن میں اس کو مصیبت نہیں سمجھتا، کیونکہ مہینے کے ختم پر مجھے اس کا معاوضہ معقول تنخواہ کی صورت میں مل جاتا ہے، یہ میرے غموں کو بھلا دیتا ہے، میرے زخموں کے لیے مرہم کا کام دیتا ہے۔ اسی اصول کو پیش نظر رکھ کر ان وعدوں اور بشارتوں پر غور کرو جو قرآن کریم میں اس شخص سے کی جا رہی ہیں جو مبتلائے مصیبت ہے اور صبر کر رہا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دنیا و آخرت کی ساری بھلائیاں صبر ہی میں رکھی ہیں!

امام احمد رضی اللہ عنہ کی تحقیق ہے کہ قرآن میں صبر کا ذکر نوٹے جگہ آیا ہے، ہم یہاں چند بشارتوں کا ذکر کرتے ہیں جو صابر کے حق میں آئی ہیں۔ اگر وہ ان کو پیش نظر رکھے، ان پر یقین و اذعان کے ساتھ تفکر کرے تو چیخ اُٹھے کہ "بلا از دوست عطا است و از عطا نالیدن خطا است!"

صبر سے ہم حق تعالیٰ کے محبوب بنتے ہیں۔ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ۔ اور جو

لہ اللہ صبر کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

حق تعالیٰ کا محبوب ہوا اس کو کس چیز سے حزن ہو سکتا ہے اور کس چیز سے خوف؟ صابر کو  
 حق تعالیٰ کی معیت نصیب ہوتی ہے **إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ** اور یہ معیت سوکھی معیت نہیں  
 جس کے ساتھ حق تعالیٰ ہوں وہ کیسے ذلیل ہو سکتا ہے، کیسے مقہور ہو سکتا ہے، خلق اس کا  
 کیا بگاڑ سکتی ہے؟ **لَا طَاقَةَ لِمَخْلُوقٍ مَعَ قُدْرَةِ الْخَالِقِ** صبر ہی سے امامت و پیشوائی  
 نصیب ہوتی ہے **وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ أُمَّةً يُهْتَدُونَ بِأَمْرِنَا لِمَا صَبَرُوا**؛ خلق کی ہدایت کا  
 منصب سپرد ہوتا ہے، صابر کے لیے اس کا صبر اعدا کے مکرو فریب کے مقابلہ میں ایک  
 زبردست سپر ہے۔ **وَإِنْ تَصَابِرُوا وَاتَّقُوا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُ الَّذِينَ شَرًّا**۔ بالآخر ان پر غالب ہونا  
 اس کے لیے یقینی ہے **فَاَصْبِرْ إِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِينَ**۔ اس کا اپنے مطلب پر فائز ہونا ضروری  
 ہے۔ **وَمَتَّ كَلِمَةَ رَبِّكَ الْحَسَنَىٰ عَلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ بِمَا صَبَرُوا**؛ یعنی تیرے پروردگار نے  
 جو وعدہ بنی اسرائیل کے ساتھ کیا تھا، یعنی دشمنوں سے نجات اور ملک و حکومت کے  
 عطا کرنے کا وعدہ صبر ہی کی وجہ سے ایفا ہوا، صابریں کے لیے غیر محدود اجر کا وعدہ ہے  
**إِنَّمَا يُوفَى الصَّابِرُونَ أَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ**۔ سلیمان بن قاسم نے کہا ہے کہ ہر عمل کا ثواب  
 معلوم ہے، مگر صبر کا اجر ”بغیر حساب“ ہونے کی وجہ سے نامعلوم و ناقابل علم! حق تعالیٰ نے  
 صابروں کے لیے اپنی رحمت، ہدایت اور صلوة کی جامع کیے ہیں۔ اور یہ اکٹھے ان کے  
 سوا کسی اور کو نہیں دیے **وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ إِذَا أَصَابَتْهُمُ مُصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا  
 إِلَيْهِ رَاغِبُونَ**۔ **أُولَئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ**۔  
 اگر درد گریزا، سریع الزوال، فانی درد صبر کے ساتھ برداشت کر لیا جائے اور

۱۔ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ ۲۔ اور کیسے ہم نے ان میں سے پیشوا جو بتاتے تھے ہلکے  
 حکم سے جب وہ صبر کرتے رہے ۳۔ اگر تم صبر کرو اور اللہ سے ڈرو تو ان کے کمرے تمہیں کوئی ضرر نہیں پہنچے گا  
 ۴۔ پس صبر کرو کیونکہ متقین کا انجام نیک ہوتا ہے۔  
 ۵۔ اور بشارت دو صابریں کو جب ان پر کوئی مصیبت آتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم اللہ ہی کی طرف رجوع  
 کرنے والے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن پر ان کے پروردگار کے صلوات ہیں اور رحمت اور یہی ہدایت  
 یافتہ ہیں۔

اس کی برداشت ناممکن بھی نہیں کیونکہ ناقابل برداشت تکلیف کسی کو دی بھی نہیں جاتی، تو دیکھو اس کے معاوضہ میں کیا مل رہا ہے؟ کن چیزوں کا وعدہ ہو رہا ہے؟ اور کون وعدہ کر رہا ہے؟ کس کی زبانی وعدہ کیا جا رہا ہے؟ اگر تمہارے قلب میں ایمان کی شمع روشن ہے، اگر وہ "غلاف" میں نہیں باندھ دیا گیا ہے، اونڈھا نہیں ہو گیا ہے، اگر وہ ادراک کی قوت رکھتا ہے، اور ان حقائق کا ادراک کر رہا ہے تو کیا درد اس کے لیے ایک نعمتِ بے بہا نہیں، وہ اس سے متلذذ نہیں ہوگا، اس کا مشتاق نہ ہوگا، اور فرطِ اشتیاق میں یہ چیخ اس کی زبان سے نہیں نکلیگی۔

زہرِ غمِ دوستِ جزِ شکرِ نصیبت  
 بد کے دہاں صبیبِ جانی  
 این تیر نصیبِ ہر جگر نصیبت  
 شیریں بودا نچہ تلخ می دانی!  
 اب غور کرو اس حدیث کے مفہوم پر:-

یتعاهد اللہ عبدہ بالبراء  
 کما یتعاهد الوالد الشفیق  
 حق تعالیٰ اپنے بندے کی بلا کے ذریعہ خبر گیری کرتے  
 ہیں اسی طرح جس طرح کہ مہربان باپ اپنے بچے کی  
 وکدۃ . خبر گیری کرتا ہے

صحابہ کرام کے یہی ادراکات تھے، اور ان ہی کی قوت سے انہوں نے اپنا سارا تن  
 من دھن اسلام کی راہ میں قربان کر دیا تھا۔ رضی اللہ عنہم ورضوا عنہم  
 صبر کا ادب یہ ہے کہ زبان کو شکوہ شکایت سے روکا جائے، سوائے حق تعالیٰ کے  
 اپنی مصیبت کا کسی سے گلہ نہ کیا جائے إِنَّمَا أَشْكُو بَثِّي وَحُزْنِي إِلَى اللَّهِ  
 دردم نہاں بہ ز طیبیانِ مدعی باشد کہ از خزانہ غیبم دوا کنند

۱۔ ابو سعید سے مرفوعاً روایت ہے، دل چار طرح کے ہوتے ہیں (۱) اجرد (برہنہ) اس میں چراغِ ساجلتا  
 ہے، یہ مومن کا دل ہے، (۲) غلف جس کو غلاف میں باندھ دیا گیا ہو، یہ کافر کا دل ہے (۳) منکوس (اونڈھا)  
 یہ خالص منافق کا دل ہے (۴) مسخ وہ دل جس میں ایمان و نفاق دونوں موجود ہیں، یعنی زبانی ایمان کا  
 دعویٰ اور دل میں اس کا یقین نہیں۔ ۱۔ میں تو کھولتا ہوں اپنا اضطراب و غم اللہ کے سامنے۔



غور تو کرو کہ مخلوق سے شکوہ کرنے کے کیا معنی ہیں، یہی نہ کہ ایک رحیم و غیر کریم ہستی سے شکوہ کیا جا رہا ہے، ایسا شخص کبھی حق تعالیٰ کی اطاعت کی تلاوت اپنے دل میں نہ پائیگا، اس صبر یہ ہے کہ مصیبت کو چھپایا جائے، من کنوز البرکتان المصائب وما صبر من بئس لہ (حدیث انس مرفوعاً) لیکن مصیبت میں یاد رکھو کہ حالت میں زبان سے ہائے نکل جائے تو یہ منافی صبر نہیں بشرطیکہ ان سے شکوہ شکایت مقصود نہ ہو اور محض استراحت منظور ہو، کیونکہ کراہنے سے توجہ درد کی طرف سے ہٹ کر اس میں ایک قسم کی کمی محسوس ہوتی ہے، اسی لیے ”انین“ (زالہ) کی دوسری قسم کے متعلق حکم ہے کہ لا یکرہ و لا یقدح فی الصبر یعنی صبر کے منافی نہیں، اور پہلی قسم کو بہ روایت امام احمد قادی صبر قرار دیا گیا ہے۔

بلا اور مصیبت کے وقت صبر کے معنی یہی ہیں کہ توافق بالقضا کیا جائے، گو فطری طور پر درد و حزن ہو رہا ہو اور ہو گا کیسے نہیں یہ تو اقتضائے بشریت ہے۔ انسان کامل، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ابراہیم کے انتقال پر فرما رہے تھے انا بفراتک یا ابراہیم لمخزون (تیرے فراق نے اے ابراہیم ہمیں محزون کر رکھا ہے) لیکن عقلی صدمہ نہ ہونا چاہیے یعنی اس مصیبت کے واقعہ کو بے محل اور قبل از وقت خیال نہ کیا جائے، اس کے ساتھ توافق کیا جائے، زبان پر ہو ۶

ہرچہ آں خسرو کند شیریں بودا

اور دل میں یہ خیال ہو ۶

جہاں دار داند جہاں داشتن

اب حکم کے تحت اسباب قطعہ کا استعمال جائز ہے بلکہ ضروری ہے، اور انسان کی فطرت ہی ایسی واقع ہوئی ہے کہ بغیر چارہ کار اختیار کرنے کے خاموش نہیں رہتی لیکن

۱۰ نیکی کا خزانہ مصائب کے چھپانے میں ہے جس نے اپنے مصائب کو ظاہر کر دیا اس نے صبر نہیں کیا۔

اسباب کے استعمال میں نظر اسباب پر نہ ہو سبب پر ہو تو اسباب میں اثر پیدا ہوتا ہے۔ علاج کا یہ طریقہ استعمال کیا جائے اس کے تمام اجزاء کو سمجھ کر ان کی پابندی کی جائے تو رفتہ رفتہ رضا کا مقام حاصل ہو جاتا ہے، جو راحت کبریٰ ہے، دنیا میں جنتِ عالیہ ہے۔ استعانت کا چوتھا طریقہ حق تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا کرنا ہے۔

انسان کی زندگی میں غم بھی ہے اور خوشی بھی، سنج بھی ہے اور راحت بھی، ظلمت بھی ہے اور نور بھی۔ قنوطیہ نے اپنی کوری عقل سے دنیا کے مبدیہ کو مقرر کر دیا، اور بالآخر ہمہ شیطنت (Pandiatbolism) کے نظریے کے حامی بن گئے۔ ان کے تجربے میں دنیا بدترین دنیا ثابت ہوئی۔ سوائے غم و حزن کے کوئی شے انہیں حقیقی نظر نہ آئی، اس کے برخلاف رجائیت نے اس دنیا کو بہترین دنیا قرار دیا، غم و الم ان کی رائے میں محض منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے ہیں۔ تضاد سے لذت کی کیفیت میں اشتداد پیدا کرتے ہیں، حقیقی نہیں اعتباری ہیں، لیکن سچ تو یہ ہے کہ اس دنیا میں غم بھی حقیقی ہے، اور خوشی بھی حقیقی، ان میں سے کسی ایک کو التباس قرار دینا خود کو دھوکے میں مبتلا کرنا ہے۔ حقیقت سے چشم پوشی کرنا ہے، اس کی تصدیق ہر شخص اپنے تجربے سے ہر روز کر رہا ہے، وہ نہ بلا کو قائم پاتا ہے نہ نعمت کو ہر دو سے گزر رہا ہے، خوشی کے احساس کا انکار کر سکتا ہے، نہ غم کے ادراک کا، بلا و نعمت کا پایا جانا ان کا محسوس ہونا ہے اور ہمیں بارگاہ کی بات صحیح معلوم ہوتی ہے کہ موجود ہونا دراصل محسوس ہونا ہی ہے (ESSNIST PERCOPI) بات یہ ہے کہ حق تعالیٰ کے اسماء جلالی بھی ہیں اور جمالی بھی اور یہ ہر وقت مصروفِ عمل ہیں، ایک لحظہ کے لیے معطل اور بیکار نہیں۔ خیر و شر، رنج و راحت، لذت و الم، نعمت و بلا انہی کی تجلیات کا نتیجہ ہیں اور حقیقی ہیں۔

لے تصویریت کا بانی اٹھارویں صدی مسیحی کا ایک نہایت فریس اور تیز ذہن فلسفی ۱۶۸۵ تا ۱۷۵۳ء مادہ کے وجود ہی سے انکار کیا۔ کائنات غیر مادی روحانی شے ہے اور محض نفوس یا ارواح کی جماعت پر مشتمل ہے

انسان کی یہ فطرت ہے کہ وہ بلا سے نجات چاہتا ہے، اور نعمت میں اضافہ، بصیرت محمدی نے دونوں کے لیے قلبی طریقے بتائے ہیں، بلاؤں میں صبر اور نعمتوں میں شکر قلب انسانی میں ایک عظیم الشان انقلاب پیدا کر دیتے ہیں، اس کو ایک طرف تو نال، فریاد، ماتم، سینہ کو بی، یاس و قنوط سے نجات دیتے ہیں، اور دوسری طرف کبر، عجب، فخر، غرور، تجتر سے چھڑاتے ہیں، ان سلبی و مضر جذبات سے نجات پا کر وہ قوت، ہمت اور عمل کا مخزن بن جاتا، اور اس کے لیے کائنات کی تسخیر آسان ہو جاتی ہے، اس کی توانائیاں رائیگاں نہیں جاتیں صحیح جانب لگ جاتی ہیں، اور وہ ایک نقطہ پر مرکوز ہو کر حیرت انگیز نتائج پیدا کرتی ہیں مصیبت میں صرف اتنی احتیاط ضروری ہے کہ ارادہ بالکل شکستہ نہ ہو جائے، ہمت

بالکل ٹوٹ نہ جائے، بلا کا بہادری سے مقابلہ کیا جائے، جو اس بجاہوں ہی چیز صبر سے حاصل ہوتی ہے، اور نعمت میں خطرہ اس بات کا لگا رہتا ہے کہ وہ حق تعالیٰ کو بھول نہ جائے، جو تمام حسات و محامد کا منبع ہیں اور اس طرح اس منبع سے دور نہ ہو جائے اور ظلمتوں میں گرفتار نہ ہو جائے، شکر سے یہ خطرہ رفع ہو جاتا ہے، کیونکہ شکر کی حقیقت یہ ہے کہ نعمت کو حق تعالیٰ کی جانب سے دیکھا جائے، اپنی ذات یا خلق کی طرف اس کی نسبت نہ کی جائے، کیونکہ دراصل حق تعالیٰ ہی صنار ہیں اور نافع، نفع و ضرر انہی کے دستِ قدرت میں ہیں، گو جو اس کی نگاہ کو یہی نظر آتا ہے، کہ نعمت خلق ہی کے ہاتھ سے پہنچ رہی ہے، لیکن چشم بصیرت جانتی ہے کہ یہ محض بمنزلہ اسباب و آلاتِ نعمت ہیں، قاسم، مجری و فاعل و مسبب حق تعالیٰ ہی ہیں، وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ۔ جب انسان اس حقیقت کو پیش نظر رکھ کر حق تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہے

تو وہ اس کی نعمتوں میں اضافہ کرتے ہیں، یہ ان کا قطعی وعدہ ہے، کسی استثنائی گنجائش نہیں۔ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ ۖ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ إِنَّ عَذَابِي لَشَدِيدٌ۔

اے اگر تم شکر کرو تو یقیناً ہم (نعمتوں میں) اضافہ کرتے ہیں۔



اپنی مرضی پر رکھا ہے لیکن شکر کے عوض زیادتی نعمت کا حصول بلا تخلف ہے، اسی لیے حضور  
انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مَنْ نَزَلَتْ إِلَيْهِ نِعْمَةٌ فَيَشْكُرْهَا - جِس كَسَى بِرِغْمَتِهَا نَزَلَ  
ہو اس کو چاہیے کہ شکر ادا کرے۔

سیدِ رسلاں و مرسلِ راز دادِ فرمانِ بشکرِ نعمت و ناز  
گلِ نعمتِ برائے ہر کہ شگفتِ شکرِ آں روز و شبِ بباہدِ گفت

اس عظیم الشان صداقت کو جس پر نعمتوں کا بقا منحصر ہے فصیح العرب و اعجم صلی اللہ  
علیہ وسلم نے ایک اور نفسیاتی طریقے سے ادا فرمایا ہے۔

النعمۃ و حشیتہ قیدھا نعمت ایک وحشی جانور ہے، شکر کی زنجیروں  
بالتشکر۔ سے اس کو باندھ رکھو

خاتمِ ملکِ وحی و خاتمِ دیں شکر فرمود برنجیف و سہیں  
باز نعمت چوہست وحشی را صید از قیدِ شکر کن اورا  
چوں گذاری تو شکر نستیزد در شوی ناسپاس بگریزد

نفسیات کا یہ ایک مسلمہ قانون ہے کہ انسان کو جب نعمت حاصل ہوتی ہے تو وہ  
خوش ہوتا ہے، لیکن چند روز بعد یہ نعمت اپنی ماتوسیت کی وجہ سے اپنی قدر و قیمت کھو  
دیتی ہے، اب اس میں کوئی ندرت باقی نہیں رہتی، اس کے وجود سے اس کو کوئی خاص  
فرق اپنی زندگی میں محسوس نہیں ہوتا، اور باوجود ناز و نعم میں گھرے ہونے کے وہ ضیق محسوس  
کرتا ہے، لیکن اگر یہ مفقود ہو جائے، یا ہاتھ سے چھین لی جائے تو اب اس کو اس کی قدر  
ہوتی ہے، قدرِ نعمت بعد زوال اسی صداقت کا اظہار ہے، علاوہ ازیں احساسِ نعمت کا  
مفقود ہونا گویا نعمت ہی کا مفقود ہونا ہے، اگر نعمت سے مجھے خوشی نہ ہو، کوئی ہونے کا  
ہو تو یہ میرے لیے نعمت نہیں زحمت ہے، ان حقائق کو سمجھ لینے کے بعد ہمیں معلوم ہوگا  
کہ از دیادِ نعمت میں شکر کا کتنا دخل ہے۔ نعمت کے شعور سے نعمت کا بقا ہے، شعور کا فقدان

نعمت کا فقدان ہے، اسی لیے احساسِ نعمت کو زندہ رکھنا چاہیے، اور یہی چیز شکر سے حاصل ہوتی ہے۔ حضرت حسن بصری شکر کو "جالب" حافظا" کہتے تھے، کیونکہ وہ موجودہ نعمتوں کی "حافظا" اور مفقود نعمتوں کی "جالب" ہے۔ شکر سے نعمت سلب و نقصان سے محفوظ ہو جاتی ہے، اور چونکہ شعور میں نعمتوں کے ادراک کی قوت پیدا ہو جاتی ہے، وہ ان چھوٹی چھوٹی نعمتوں کا بھی مشاہدہ کرنے لگتا ہے جو اس کے قبل نظر سے پوشیدہ تھیں اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ شکر سے نعمتوں میں قطعی اضافہ ہوتا ہے۔ الشاکر يستحق المزيد (شاکر زیادتی کا مستحق ہے) ایک نفسیاتی صداقت ہے، اسی لیے پہلے اسوۂ حسنہ کو جب بھی کوئی امر خوشی کا پیش آتا تو شکر الہی کی ادائیگی کے لیے سجدہ میں گر جاتے۔ (رواہ احمد)

انسان کی کچھ عجیب فطرت ہے، نعمتوں کو بہت جلد بھول جاتا ہے اور مصیبتوں کا ہمیشہ شکوہ کرتا رہتا ہے، کسی عرب شاعر نے اس پر خوب تمہید کی ہے۔

يا ايها الظالم ففعلہ والظلم مردود علی من ظلم  
الی متی وحتی متی تشکو المصیبات و تنسى النعم

ذرا ہمیں اپنی ان نعمتوں کو دہرانا چاہیے جن کی طرف ہماری نظر نہیں جاتی، پہلے "نعمتِ نفع" کو لیجیے، پھر "نعمتِ دفع" کو دونوں بشمار رہیں۔ "نعمتِ نفع" میں آدمی اپنے صحیح و سالم قد و قامت پر نظر کرے، صحت و عافیت پر غور کرے، ان لذتوں کا خیال کرے جو کھانے پینے اور صہنی خواہشوں کی تکمیل میں اس کو میسر ہیں، پھر "نعمتِ دفع" کے سلسلہ میں یہ دیکھے کہ وہ اپنا بیج نہیں، ہزاروں بیماریوں سے محفوظ ہے، دشمنوں اور مخالفوں کے شر سے مامون ہے، صاحبِ ایمان پھر نعمت کو ایک اور نقطہ نظر سے دیکھ سکتا ہے۔ اس کو "نعمتِ توفیق" بھی حاصل ہے اور "نعمتِ عصمت" بھی، نعمتِ توفیق یہ کہ

اے اپنے فعل میں ظلم کے رد اور کھٹے والے تجھے معلوم ہے کہ ظلم ظالم پر لوٹ کر آتا ہے۔ کب تک اور کہاں تک تو مصیبتوں کا شکوہ کرتا رہیگا اور نعمتوں کو بھلانا چاہیگا؟

اس کو ایمان توحید، صدق و استقامت حاصل ہے، نعمتِ عصمت یہ کہ وہ کفر و شرک، نفاق و ارتداد، بدعت و فسق و غفلت سے محفوظ رکھا گیا ہے، اگر ان نعمتوں کی وہ تفصیلات میں جئے، ان کی جزا پر نظر کرے، اپنی صلاحیت و استعداد پر غور کرے، یہ دیکھے کہ اس کو ان نعمتوں کا کیا حق ہے، تو بے اختیار چیخ اٹھے۔

بے لطفِ تو من قرار تو انم کرد احسان تو شکر از تو انم کرد

گر برتن من زباں شود ہر موئے یک شکر تو از ہزار تو انم کرد (ابوسعید ہمدانی)

سچ ہے اِنْ تَعُدُّوا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا (اگر تم اللہ کی نعمتوں کا شمار کرو تو گن نہ سکو گے)

اب ان لا تعداد احسان کا شکر انسان کیسے ادا کر سکتا ہے، اسی لیے کہا گیا ہے کہ شکر اوائے

شکر سے اپنے عجز کا جان لینا ہے "اوائے شکر کے ساتھ ہی ایک اور شکر لازم آتا ہے، کیونکہ

شکر کی توفیق بھی توحق تعالیٰ کی جانب سے ہوتی ہے، اور یہ توفیق خود ایک بڑی نعمت ہے،

جس کا شکر ضروری ہوا، پھر اس شکر کا شکر، و لَمْ جَرَّ اِلٰی نِهٰیۃ۔ اس لیے احسان و منت باری

تعالیٰ کا مشاہدہ خود شکر ہے، ان کی نعمتوں کا اعتراف خود شکر ہے۔ ان کے حصول کے بعد

مرضیات حق پر قائم رہنے کی دعا خود شکر ہے، ان پر حق تعالیٰ کی ثنا خود شکر ہے۔

حق تعالیٰ سے استعانت کے دوسرے طریقے اجمالاً یہ ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ گناہوں

کے صدور پر توبہ کریں حق تعالیٰ مغفرت سے ہماری استعانت فرماتے ہیں۔ اِنَّهٗ كَانَ لِذٰلِکَ وَابِیۡنٍ

غَفُوْرًا۔ وہ رجوع کرنے والے کو معاف کرتے ہیں، کتنا تسکین بخش اور محبت آمیز پیام ہر انبی

لِغَفَّٰرٍ لِّمَنۡ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صٰلِحًا ثُمَّ اٰهْتَدٰی میں معاف کر دیتا ہوں اس کو جس

نے توبہ کی، ایمان لایا، نیک عمل کیے اور پھر اس راستہ پر چلا، توبہ و ندامت سے گناہ کی سیاہی

قلب سے محو ہو جاتی ہے۔ گناہوں سے تنفر پیدا ہو جاتا ہے نیکیوں سے محبت پیدا ہوتی ہے۔

اور تائب حق تعالیٰ کا محبوب ہو جاتا ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ التَّوٰبِیۡنَ۔

ہم نے اوپر تفصیل سے دکھلایا ہے کہ قوت و اثر اصالۃ صرف حق تعالیٰ ہی کے لیے ثابت

ہیں۔ لا قوۃ الا باللہ۔

ہماری خوف ورجا کی نسبت صرف حق تعالیٰ ہی سے قائم ہو جاتی ہے اور اس کے قیام کے ساتھ ہی حق تعالیٰ ہمیں مخلوق سے غنی اور بے نیاز کر دیتے ہیں اور اس غنا کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہم اس قاتل جذبہ کے چنگل سے آزاد ہو جاتے ہیں جس نے سنگ پرستوں کی زندگی کو سکون و طمانیت سے ہمیشہ کے لیے محروم کر دیا ہے۔ یہ خوف کا جذبہ ہے جس نے ان کو سوتے جاگتے ہر وقت پریشان، مضطرب و حواس باختہ کر رکھا ہے اور جس کی وجہ سے انہیں ہر کونہ میں ایک دام دکھائی دیتا ہے اور ہر گوشہ میں ایک درندہ!

اگر ہم اس امر میں حق تعالیٰ سے استعانت چاہیں کہ وہ ہمیں یاد رکھیں اور ہم سے راضی رہیں، تو ہمیں چاہیے کہ ہم حق تعالیٰ کو یاد رکھیں اور ان کے ہر حکم و فعل سے راضی ہو جائیں فا ذکر فی اذکرکم۔ تم مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد کرونگا، اسی لیے حکم فرمایا کہ اذکر و اللہ ذکرًا

کثیراً۔ اور ہمارے راضی ہو جانے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ہم سے راضی ہو جاتے ہیں۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ و رضوا عنہ۔

آنا کہ رضائے حق بجاں می جویند در راہِ رضاے او بسرمی پویند

ہر یک ہمہ آں کند کہ حق فرماید حق نیز ہماں کند کہ ایشاں گویند

اوپر جو کچھ ہم نے کہا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ مذہب یا دین مشتمل ہر دو اجزا پر عبادت و استعانت پر لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی قلبی تصدیق اور لسانی اقرار سے ہمارے قلوب سے غیر اللہ کی معبودیت و ربوبیت فنا ہو جاتی ہے۔ اس قلب کی عظمت کا کیا کہنا جس سے غیر اللہ کی معبودیت و ربوبیت فنا ہو کر اللہ کی ربوبیت و معبودیت متکثر ہو گئی ہے، جس کے الہ قطعاً اللہ ہیں، یعنی جس کے معبود، جس کے مسجود، جس کے مطلوب، جس کے مقصود قطعاً اللہ ہیں، جس کے رب جس کے مستعان قطعاً اللہ ہیں! اس قلب میں توحید کا جلوہ ہے، ایمان کا نور ہے، وہ نورانی قلب ہے، حق تعالیٰ کا محبوب ہے اور حق تعالیٰ

اس کے ذیل ہیں کفیل ہیں، ولی ہیں، مولیٰ ہیں، نصیر ہیں، حنیظ ہیں اور ہادی ہیں۔  
 اس ضمن میں چند تعریفات یاد رکھو، جیسا کہ تم نے دیکھا ہے۔ ذات اللہ ہی کو الہ قرار  
 دینا یعنی معبود و مستعان قرار دینا، زبان سے اقرار اور دل سے اس کی تصدیق کرنا توحید  
 ہے، اس اقرار و تصدیق سے قلب سے شرک کا خروج ہوتا ہے، اور توحید داخل ہو جاتی ہے،  
 جس ذات پاک نے یہ پیام ہم تک پہنچایا (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اس کی رسالت کے اقرار و  
 تصدیق سے دل سے کفر کا خروج ہو جاتا ہے اور ایمان جلوہ افروز ہو جاتا ہے۔ ایمان میں دو  
 چیزیں ہیں اور توحید میں بھی دو چیزیں۔ ایمان میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور صرف  
 اللہ وحدہ لا شریک لہ کی الوہیت کی تصدیق ہے، توحید میں اللہ تعالیٰ کی معبودیت و  
 ربوبیت اور ان کے ماتحت بندہ کی عبادت و استعانت کی تصدیق داخل ہے۔ اس  
 کا زبان سے اقرار اور دل سے انکار یا شک نفاق ہے۔ اس کی تصدیق کے بعد انکار ارتداد  
 ہے۔ یہ مثل شرک کے دین و مذہب کی نفی ہے، بغاوت ہے، اور اس لیے ناقابل معافی  
 اور بدعت بھی بُری بلا ہے۔ یہ دین میں کسی نئی بات کا پیدا کرنا ہے، جو دین کی بات نہیں  
 اس کو دین سمجھنا ہے۔ غیر شریعت کو شریعت بتلانا اور علی اللہ اور ایک گوٹہ ادعائے نبوت  
 ہے، بدعتی کو توبہ کم نصیب ہوتی ہے، کیونکہ وہ تو اس کو مستحسن سمجھ رہا ہے، پھر توبہ کیوں کر چکا  
 اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کل بدعت ضلالتہ وکل ضلالتہ فی النار۔  
 قبل ایمان کفر و شرک سے توبہ لازم ہے، پھر ایمان یعنی لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ  
 کی قلبی تصدیق اور لسانی اقرار جس سے غیر اللہ کی معبودیت اور ربوبیت فنا ہو کر اللہ کی  
 معبودیت و ربوبیت متکمن ہو جائے۔ اب نفاق، ارتداد، بدعت، فسق و فجور سے  
 احتراز ایمان اور عمل صالح پر استقامت، یہ ہے دین یا بندگی جس کے متعلق عارف  
 روم نے کیا خوب کہا ہے

بندگی کن بندگی کن بندگی کن بندگی کن بندگی

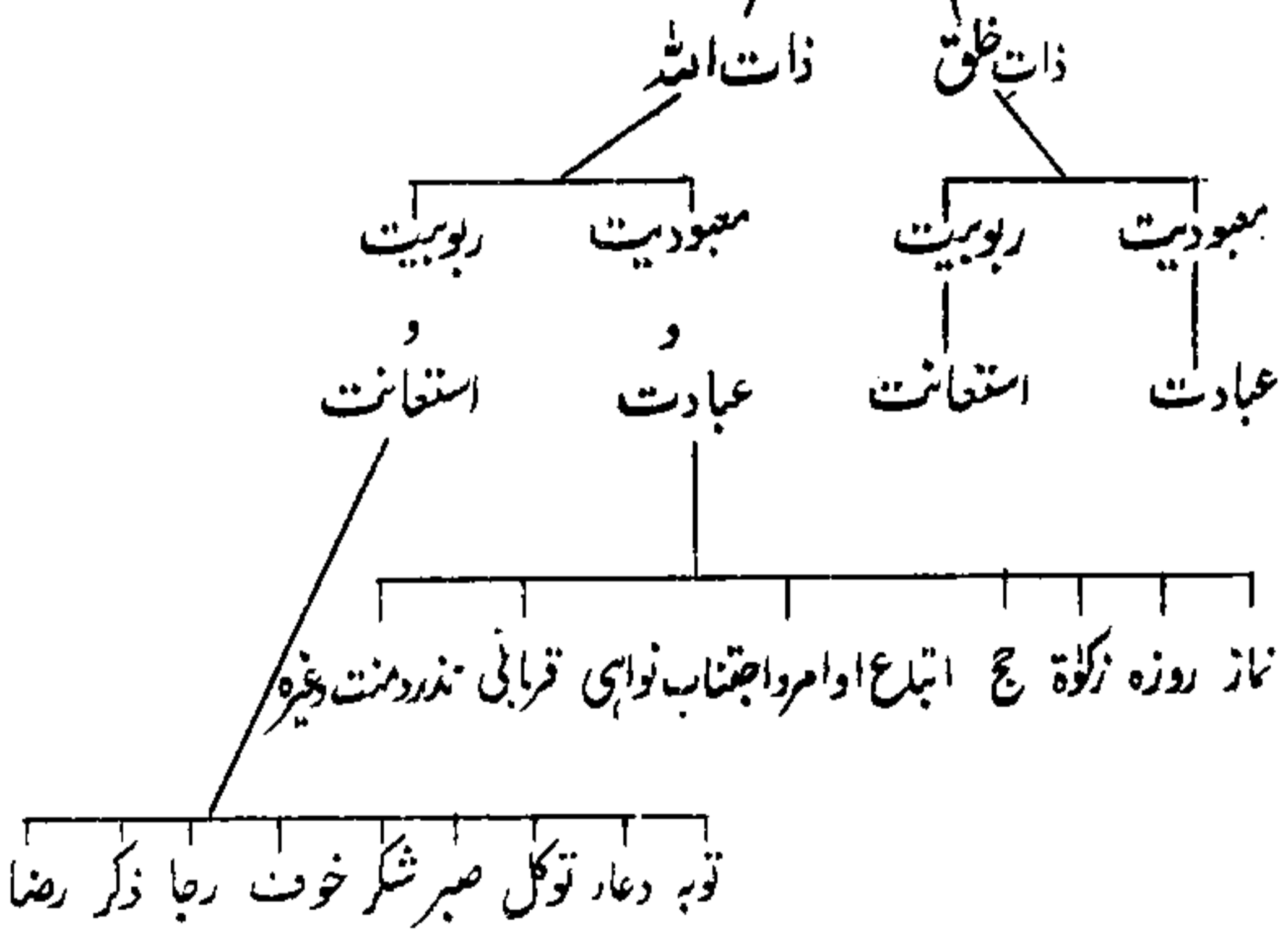


زندگی مقصود بہر بندگی است  
زندگی بے بندگی شرمندگی است  
جز خضوع و بندگی و اضطراب  
اندریں حضرت ندارد اعتبار  
ہر کہ اندر عشق یابد زندگی  
کفر باشد پیش او جز بندگی  
ذوق یابد تا دہ طاعات پر  
مغز یابد تا دہ درانہ شجر  
قُلْ هَذِهِ سَبِيلِي أَدْعُو إِلَى اللَّهِ عَلَى بَصِيرَةٍ أَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِي وَسُبْحَانَ اللَّهِ  
وَمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِينَ (یوسف ۱۲۶)

## ضمیمہ

مندرجہ ذیل نقشہ سے دین کے سارے اجزاء کی تلخیص پیش نظر ہو جاتی ہے۔

لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللَّهِ



## توحید الوہیت

سیری بہ حریم جان و دل منزل کن قطع نظر از صورت آب و گل کن  
 جز معرفت الہیچ است ہمہ بگذر ز ہمہ معرفتے حاصل کن! (سیری غزنی)

تخلیق عالم کی غایت کیا ہے؟ جن وانس پیدا کیوں ہوئے؟ ۶۰ از آمدن وقتن مودے کوہ  
 فلسفیوں کو اپنے کودک عقل کے ساتھ کھیلتا چھوڑ کر (ذَرَّهُمْ فِي خَوْضِهِمْ لِيَلْعَبُونَ) ہم اس ساری  
 سوال کے جواب کے لیے قرآن کریم کی طرف توجہ کرتے ہیں جو مبدیہ علم حقیقی کا اور جو ریب و شک،  
 ظن و تخمین، قیاس و وہم سے منزہ ہے! ہمیں ہمیں وہ نور ہدایت نصیب ہوتا ہے جس کو عقل نظری  
 ہمیں عطا نہیں کر سکتی! اِنَّ هُدٰى اللّٰهُ هُوَ الْهُدٰى! ہمیں مومن کے لیے یقین و اذعان کا ذخیرہ  
 ہے۔ ہمیں ہدایت و ہدایت کا جلوہ ہے ہمیں علم حقائق ہے اور ہمیں طمانیت و تسکین۔ وَاَنْ  
 هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهِ ذٰلِكُمْ وَصَّوْكَمُ بِهِ  
 لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ! (پ ۶۷)

علمی کہ نہ ماخوذ ز مشکوٰۃ نبی است واللہ کہ سیرابی ازاں تشنہ لبی است (شاہ ولی اللہ)

جائیکہ بود جلوہ حق حاکم وقت تابع شدن حکم خرد بولہبی است

جن وانس کی تخلیق کی غایت صاف و سلیس الفاظ میں یوں بیان کی گئی ہے مَا خَلَقْتُ  
 الْبَشَرَ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ عبادت کے معنی ہیں "توحید"۔ چنانچہ امام المفسرین حضرت ابن عباس  
 کا قول ہے کہ قرآن کریم میں جس جگہ بھی عبادت کا ذکر آیا ہے اس کے معنی توحید کے ہیں۔ گویا محاورہ قرآن

۱۔ یہ مقالہ رسالہ برہان دہلی، ستمبر، اکتوبر، نومبر ۱۹۸۸ء میں شائع ہوا۔ ۲۔ اور دوسری راہوں پر مت چلو کہ  
 وہ راہیں ہمیں اللہ کی راہ سے جدا کر دیں گی۔ اس کا تم کو اللہ نے تاکید کی حکم دیا ہے تاکہ تم احتیاط رکھو۔  
 ۳۔ بخاری حدیث وفد عبد القیس۔

میں عبادت ہر جگہ توحید کے معنی میں آئی ہے "ایاک نعبد و ایاک نستعین" کے معنی ہونگے توحدک  
 و فطیعتک اور "ایای فاعبدون" کا مفہوم ہوگا کہ میری ہی توحید تمہارا ہے سینوں میں بس جلسے۔  
 عبادت کی تعبیر توحید کے لفظ سے کرنے میں خوبی یہ ہے کہ اس سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ عبادت  
 صرف حق تعالیٰ ہی کے لیے مخصوص ہے جو واحد لا شریک ہے۔ اس سے شرک کی قطعی نفی ہو جاتی ہے  
 جس کو کسی دوسری جگہ کھول کر اس طرح بیان کیا گیا ہے **وَاعْبُدُوا اللَّهَ وَلَا تُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا**  
 (۳۷) ہمیں اپنی عبادت و معرفت کے لیے پیدا کیا ہے، ہماری زندگی کا مقصود ہی عبادت و بندگی  
 ہے۔ یہی عرفان ہی توحید ہے، تمام انبیاء نے اسی توحید الوہیت کو پیش کیا۔ یہی ان کی بعثت و  
 دعوت کا اصل مقصود تھا۔

خواہم کہ ہمیشہ درہموائے توزیم خاکے شوم و بزیر پلے توزیم! (قاسم)  
 مقصود من خستہ ز کونین توئی از بر تو میرم و برائے توزیم!

تمام پیغمبروں کے پیغام کا یہی نچوڑ تھا کہ **يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ آلِهَةٍ غَيْرُهُ** یعنی اے  
 قوم تم اللہ ہی کی عبادت کرو کہ اس کے سوائے تمہارا کوئی معبود و رب نہیں! **يَا اَنْ لَا تَعْبُدُوا اِلَّا**  
**اِيَّاهُ** یعنی اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو! حضرت نوح نے اپنی قوم سے خطاب فرمایا: **اِنَّ بَاعْبُدُوا**  
**اللَّهَ وَالْقُوَّةَ وَاَطِيعُوا**، اور یہ عبادت اسی توحید و تقویٰ و اطاعت پر مشتمل ہے! حضرت ہود حضرت  
 صالح اور حضرت شعیب نے بھی انہی الفاظ سے کہ **يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ آلِهَةٍ غَيْرُهُ** سے اپنی  
 قوم کو توحید کی طرف بلایا۔ حضرت ابراہیم نے اپنی قوم کو یوں مخاطب کیا **اعْبُدُوا اللَّهَ وَالْقُوَّةَ ذِكْرُكُمْ**  
**خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ** اور مشرکین سے اپنی برائت اس طرح ظاہر فرمادی: **يَا اِنِّي بَرِيٌّ مِّمَّا تَعْبُدُونَ**  
**اِلَّا الَّذِي فَطَرَنِي فَاِنَّهُ سَيِّدُ الدِّينِ** (پ ۷۷) انہوں نے اور حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنی اولاد کو یہ  
 وصیت فرمادی تھی کہ **اِنَّ اللَّهَ اصْطَفَىٰ لَكُمْ الدِّينَ فَلَا تَمُوتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُسْلِمُونَ** (پ ۷۷)

اے تم اللہ ہی کی عبادت اختیار کرو اور اس کے ساتھ کسی اور چیز کو شریک مت کرو۔ اے میں ان چیزوں سے بیزار ہوں  
 جن کی تم عبادت کرتے ہو مگر ان میں سے اللہ کو پیدا کیا پھر وہی مجھ کو رہنمائی کرتا ہے۔ اے میرے بیٹو! اللہ تعالیٰ  
 نے اس دین کو تمہارے لیے منتخب فرمایا ہے سو تم بجز اسلام کے اور کسی حالت پر جان مت دینا!

حضرت لوطؑ نے اپنی قوم کو اور حضرت موسیٰؑ نے فرعون اور اہل فرعون کو یہی بات پہنچائی تھی کہ تم صرف اللہ ہی کو پوجو، اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں، اسی تعلیم، اسی دعوتِ توحید کے ساتھ ہمارے نبی ابنی النخاتم صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے اور حق تعالیٰ نے آپ کی ذات پر اس دعوتِ الی التوحید کو ختم فرمادیا، آپ کو ارشاد ہوا۔ قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا الَّذِي لَهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۖ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ يُحْيِي وَيُمِيتُ فَأَسْمُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ (پ ۹)

غرض توحید الوہیت پر سارے انبیاءے اولین و آخرین کا اجماع ہی، جو بھی رسول آیا وہ توحید کی دعوت لے کر آیا۔ وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَسُولٍ إِلَّا نُوحِيَ إِلَيْهِ أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنَا فَاعْبُدُون (پ ۲۶)

اسی لیے لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللَّهِ اسلام کا دعوتی کلمہ ہے جس میں توحید الوہیت اور رسالتِ محمدی کو پیش کیا جا رہا ہے جن کا جان کر اقرار کرنا ایمان کے لیے ضروری ہے، فرض اول ہے اِلٰهَ اس م صفت ہے اور باجماع اہل علم اس کے معنی "معبود" کے ہیں اور اس پر آیاتِ قرآنی دلیل ہیں ان میں سے بعض پر غور کرو۔

(۱) وَهُوَ الَّذِي فِي السَّمَاءِ إِلَهُ وَ  
فِي الْأَرْضِ إِلَهُ  
یعنی وہی ذات پاک آسمان اور زمین کا  
معبود ہے۔

(۲) أَوْ هُمْ إِلَهُ غَيْرَ اللَّهِ سُبْحَانَ اللَّهِ  
عَمَّا يُشْرِكُونَ  
یعنی کیا اللہ کے سوا ان کا کوئی معبود ہے؟

(۳) وَجَاءُورُؤُا بِنِي رَسُولِ اللَّهِ  
فَأَتَوْا عَلَى قَوْمٍ يَعْكُفُونَ عَلَى  
ہم نے بنی اسرائیل کو دریائے پارا تار دیا۔ پس ان  
لوگوں کا ایک قوم پر گز رہا جو اپنے چند بتوں کو لگے بیٹھ

لہ آپ کہہ دیجیے کہ لوگوں میں تم سب کی طرف اس اللہ کا بھیجا ہوا ہوں جس کی بادشاہی تمام آسمانوں اور زمین میں اس کے سوا کوئی عبادت نہ کرے لائق نہیں وہی زندگی دیتا ہے اور وہی موت دیتا ہے، سوا اللہ پر ایمان لاؤ اور اس کے رسول پر۔ لہ ہم نے آپ سے پہلے کوئی ایسا پیغمبر نہیں بھیجا جس کے پاس ہم نے یہ وحی نہیں بھیجی کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں، پس میری عبادت کیا کرو۔

أَصْنَامٍ لَهُمْ قَالُوا مَوْسَى اجْعَلْ  
ہیں کہنے لگے موسیٰ ہمارے لیے بھی ایک معبود ایسا  
لَنَا إِلَهًا كَمَا لَهُمْ آلِهَةٌ قَالَ اتَّكُمُ  
ہی مقرر کر دیجیے جیسے ان کے یہ معبود ہیں، آپ نے  
قَوْمٌ يَجْهَلُونَ (پ ۶۷)

(۴) وَالنَّظْرَ إِلَىٰ إِلَهِكَ الَّذِي ظَلْتَ  
اور تو اپنے معبود کو دیکھ جس پر توجہ ہوا بیٹھا تھا ہم  
عَلَيْهِ عَاكِفًا لَّنُحَرِّقَنَّهُ ثُمَّ لَنَنْسِفَنَّهُ  
اس کو جلا دیں گے پھر اس کو دریا میں بکھیر دیں گے بس  
فِي الْيَمِّ نَسْفًا إِنَّمَا إِلَهُكُمُ اللَّهُ  
تمہارا معبود تو صرف اللہ ہے جس کے سوا کوئی  
الَّذِي لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ وَسِعَ كُلَّ  
عبادت کے قابل نہیں، وہ علم سے تمام چیزوں کو  
شَيْءٍ عِلْمًا  
احاطہ کیے ہوئے ہے۔

(۵) حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش سے کہا تھا کہ اگر تم ایک کلمہ کا اقرار کر لو تو تمام عرب تمہارا  
مطیع ہو جائے اور تمام عجم تمہاری خدمت گزاری کرنے لگے۔ ابو جہل نے خوش ہو کر کہا کہ بتلائیے وہ کلمہ  
کیا ہے، ہم ایسے دس کلمے ماننے کے لیے تیار ہیں۔ فرمایا دس نہیں بس ایک ہی کلمہ ہے لَا إِلَهَ إِلَّا  
اللَّهُ۔ یہ سنتے ہی ان سب کو طیش آیا، کہنے لگے "أَجْعَلِ الْإِلَهَةَ الْهَاتَا وَاحِدًا إِنَّ هَذَا الشَّيْءُ  
عَجَابٌ" (پ ۱۰۶) یعنی اس نے تو اتنے معبودوں کی جگہ ایک ہی معبود رہنے دیا۔ واقعی یہ بہت ہی  
عجیب بات ہے۔ (ترمذی شریف کتاب التفسیر)

ان تمام آیات سے صاف ظاہر ہے کہ الہ سے مراد معبود ہے اور لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ سے اسی  
توحید الوہیت کو پیش کیا جا رہا ہے جس کو سائے انبیاء نے پیش کیا تھا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں  
وہی مستحق عبادت ہے اسی کی عبادت کی جانی چاہیے۔ اسی سے فقر و ذلت کی نسبت جوڑنی چاہیے۔  
افراد عبادتِ اللہ ہی تمام پیغمبروں کے پیام کا حاصل ہے یعنی صرف اللہ ہی الہ ہے، غیر اللہ بھیت  
إِلَٰهَ قَلْبٍ سَ فَا هُوَ جَلَّ ۵

دل عاشق روئے تست با عہدِ درت  
جان طالبِ وصل تست از روزِ نخست  
اُن کس کہ نہ حُبّت وصل تو بیچ نیافت  
وَأَلْ كَسْ كَهْ تَزَا يَافَتْ دَكْرًا بِيحِ نَجَسْتِ (شیخ عطاء)



توحید فی العبادت کی ضد تشریک فی العبادت! موصدا اللہ ہی کو الہ ماننا ہے، یعنی اللہ ہی کی عبادت کرتے ہیں اور مشرک غیر اللہ کو بھی الہ مانتے ہیں اور اس کی بھی عبادت کرتے ہیں۔ سورہ انعام میں اٹھارہ پیغمبروں کے نام لے کر یعنی ابراہیم، اسحق، یعقوب، نوح، داؤد، سلیمان، ایوب، یوسف، موسیٰ، ہارون، زکریا، یحییٰ، عیسیٰ، الیاس، اسمعیل، یسع، یونس علیہم السلام کا ذکر کر کے ارشاد ہوتا ہے کہ اگر یہ نفوس قدسہ حق تعالیٰ کی عبادت میں کسی کو شریک کرتے تو ان کی ساری طاعتیں باطل ہو جاتیں کیونکہ شرک کے ساتھ کوئی عمل مقبول نہیں۔ **وَلَوْ أَشْرَكُوا لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ** (پ ۱۵۶)

تصریحاتِ بالا سے یہ امر روز روشن کی طرح واضح ہے کہ اس عالم میں انسان کی تخلیق عبادتِ معرفت کے لیے ہوئی ہے، اسی لیے تمام انبیاء و رسل توحید ہی کی دعوت کے لیے مبعوث ہوئے، انہوں نے بنی نوع انسان کو توحید فی العبادت کی طرف بلایا، شرک سے ڈرایا، ہر ایک نے باوا زبند فرمایا:-

**لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ -**

نقطہ اودارِ عالم لا الہ انتہائے کارِ عالم لا الہ!

اور جب مقصودِ زندگی توحید فی العبادت ہے تو ہمیں عبادت کے مفہوم پر اچھی طرح غور کرنا چاہیے۔ شرک کی ماہیت کو بخوبی ذہن نشین کر لینا چاہیے تاکہ جس مقصد کے لیے ہم پیدا ہوئے ہیں اس کے تحقق میں کامیاب ہوں اور کامیاب عمل ہونا بغیر علم صحیح کے ممکن نہیں! یاد رکھو کہ یہ دور روزہ پر فریب زندگی اپنے مختلف ادوارِ طفلی و جوانی و پیری کی مخصوص نعمتوں اور بلاؤں سے گزر کر بہت جلد ختم ہو جاتی ہے اور آخری دور میں پہنچ کر ہم بیدل کے الفاظ میں کہہ اٹھتے ہیں:-

طفلی کہ زمانِ بازی می آراست	دامن افتنازد
انگاہ جوانی کہ داغش پیدا است	گل کرد و شامد
اکنوں پیری نفس شماری دارد	بیدل چه علاج
زین نسخه ہم آخر ورق چند بجانست	باید گرداند

لیکن ورق اُلٹنے کے بعد قصہ ختم نہیں ہو جاتا۔ اب دنیوی زندگی کے اعمال کی جزا و سزا کا دور شروع

ہوتا ہے اور یہ ابدی ہے، اس کی انتہا نہیں، یہاں تو سکھ ہی سکھ ہے یا پھر دکھ ہی دکھ۔ توحید پر خاتمہ  
ہوا تو سوائے سکھ کے کچھ نہیں اور اگر شرک پر دم توڑا تو سوائے دکھ کے کچھ نہیں۔ اسی لیے حضرت ابراہیمؑ  
اور حضرت داؤدؑ نے اپنی اولاد کو نصیحت فرمائی تھی کہ **فَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنتُمْ مُسْلِمُونَ!**  
اب ذرا عبادت کے تفصیلات پر تفصیل سے غور کرو۔

لغت میں عبادت نام ہے "غایت تذل" کا یعنی نہایت درجہ کی خاکساری و نیاز مندی کا  
اور شرع میں عبادت مراد ہر بندوں کے ان افعال و اقوال و احوال سے جن کا تعلق خاص طور پر حق  
تعالیٰ کی عظمت و جلالت کے ساتھ ہوتا ہے۔ عبادت اس کے جنس ہے اس کی بہت ساری انواع ہیں  
(۱) عبادت اعتقادی: یہ اصل ہے سب انواع کی، اس کا دوسرا نام "توحید الوہیت" ہے،  
جیسا کہ اوپر بتایا گیا۔ مجاورہ قرآن میں عبادت کے معنی اسی توحید کے ہیں۔ یہ اس امر کا اعتقاد ہے کہ  
اکبلا اللہ ہی الہ یعنی معبود ورب واحد ہے، وہی خالق ہے، اسی کی سب خلق ہے اور اسی کا امر وہی  
مالک ہے وہی حاکم، اسی کے ہاتھ میں نفع و ضرر ہے، وہی مولیٰ ہے۔ اسی طرح الوہیت کے دوسرے  
لوازم کا اعتقاد۔ لہذا دعا، ندا، استغاثہ، استعانت، التجا، رجا، خوف سب صرف اللہ ہی سے  
ہوں، غیر اللہ سے نہ ہوں۔

(۲) عبادت لفظی: کلمہ توحید **لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ** محمد رسول اللہ کا زبان سے اقرار جس نے  
دل سے اس کا اعتقاد رکھا لیکن زبان سے اقرار نہ کیا تو اس کا خون و مال محفوظ ہوگا اور جس نے

لَهُ ان الذين قالوا ربنا الله ثم استقاموا تتنزل عليهم الملائكة الا تخافوا ولا تحزنوا وابشروا  
بالجنة التي كنتم توعدون، نحن اولياءكم في الحياة الدنيا وفي الآخرة ولكم فيها ما تشتهي  
انفسكم ولكم فيها ما تدعون، نزلا من غفور الرحيم ربکا ۱۸۶: بن لوگوں نے اقرار کر لیا کہ ہمارا رب اللہ  
ہے، پھر مستقیم رہے، ان پر فرشتے اترینگے، کہ تم اندیشہ نہ کرو اور نہ رنج کرو، اور تم جنت پر خوش رہو، جس کا تم  
سے وعدہ کیا جا کرتا تھا، ہم تمہارے رفیق تھے دنیوی زندگی میں اور عقبی میں بھی رہینگے اور تمہارے لیے جس چیز کو تمہارا  
جی چاہیگا موجود ہے اور نیز تمہارے لیے اس میں جو مانگو گے موجود ہے۔

لَهُ انتم من يشرك بالله فقد حرم الله عليه الجنة وما اولئنا نار ربکا ۱۲۶: جو شخص اللہ تعالیٰ کے ساتھ  
شریک قرار دیکھا سو اس پر اللہ جنت کو حرام کر دیکھا اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے۔

زبان سے کہا گردل سے معتقد نہ ہوا تو اس کا خون و مال تو بیخ گیا لیکن وہ منافق ہے اور اس کا حساب اللہ پر ہے۔

(۳) عبادتِ بدنی: جیسے قیام و رکوع و سجود نماز میں۔

(۴) عبادتِ صوم و افعالِ حج و عمرہ جیسے طواف، ذبح، نحر، حلق وغیرہ

(۵) عبادتِ مالی: حق تعالیٰ کے انتہال امر میں انفاق مثلاً زکوٰۃ، صدقہ۔

اسی طرح واجبات و مندوبات کی افعال و اقوال، اموال و ابدان میں اور انواع ہیں جو عبادت میں داخل ہیں، ان کا حصر یہاں ضروری نہیں، صرف اہماتِ عبادت کی یہاں تصریح کر دی گئی۔ کلی طور پر یوں سمجھو کہ نبی نفع کے لیے مخلوق جو کام کرتی ہے وہ عبادت ہے۔ اگر اس کی اجازت اللہ تعالیٰ نے دی ہے (أذن بآذن اللہ) ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت ہے، اگر اس کی اللہ تعالیٰ نے اجازت نہیں دی وہ (فأذن بآذن اللہ) ہے تو وہ غیر اللہ کی عبادت ہے۔

خوب سمجھ لو کہ شرک واقع ہوتا ہے عبادت کے ان ہی افعال اور عقائد میں۔ بنی نوع انسان کے اکثر افراد عبادت ہی کے معاملہ میں شرک میں گرفتار ہوتے رہے۔ انہوں نے غیر اللہ کو اپنا الہ یا معبود قرار دیا، اپنے نفع کے لیے ان کی مرضی کا اتباع کیا یعنی اپنا نافع و ضار سمجھا، باعتبار نفع و ضرران کی تعظیم کی، وقت حاجت ان سے فریاد رسی چاہی، ان سے استعانت کی، ان کو پکارا ان سے التجا کی، استغاثہ کیا، رجا و خوف کا تعلق ان سے رکھا، ان کی نذر و نیاز میں اپنے مال کا ایک حصہ صرف کیا اور ذبح و نحر سے ان کا تقرب چاہا۔ غرض فقر و ذلت کی نسبت ان سے جوڑی، ان کے سامنے خضوع کیا اور جب انبیاء کرام نے انہیں افراد عبادت اللہ کی دعوت دی، تو حید فی العبادت کی تلقین کی انہیں لکارا کہ

تا چند گہ از چوب گہ از سنگ تراشی بگذر ز خدائے کہ بصد رنگ تراشی

تو ان مشرکین نے از راہ تکبر و عناد پلٹ کر پوچھا اِحْتِنَانًا لِنَعْبُدَكَ اللَّهُ وَحْدَهُ وَنَذَرْنَا مَا كَانَ يَعْْبُدُ آبَاؤُنَا؟ (پیر ۱۶۷) کیا تم اس لیے آئے ہو کہ ہم سے یہ کہو کہ ہم صرف اللہ ہی کی عبادت کریں اور اپنے

باپ داد کے معبودوں کو چھوڑ دیں؟ اَجْعَلُ الْاِلٰهَةَ الْهٰٓءَا وَّاحِدًا، اِنْ هٰذَا الشَّيْءُ عَجَابٌ رَّبِّعِ (۱۰) یعنی بڑے تعجب کی بات ہے کہ سب معبودوں کو اس شخص نے تو ایک معبود کر ڈالا۔

دیکھو ان مشرکین نے اللہ تعالیٰ کے وجود کا انکار نہیں کیا تھا، وہ اللہ تعالیٰ کے قائل تھے، مگر تھے اس پر ایمان رکھتے تھے، ان کو اس بات کا بھی اقرار تھا کہ اللہ ہی ہمارا خالق ہے

لَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ (پ ۱۳) زمین و آسمان کو بھی اللہ ہی نے پیدا کیا ہر لَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَيَقُوْلُوْنَ خَلَقَهُنَّ الْغَرِيْبُ الْعَلِيْمُ۔ رزاق بھی وہی ہے۔ محی و ممیت بھی وہی اور مدبر امر بھی وہی: قُلْ مَنْ يُرْزِقُكُمْ مِنَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَمَّنْ يَمْلِكُ السَّمْعَ وَالْاَبْصٰرَ وَمَنْ يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَمَنْ يُدَبِّرُ الْاٰمْرَ فَسَيَقُوْلُوْنَ اللّٰهُ فَقُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ (پ ۱۹) اسی کے ہاتھ میں تمام چیزوں کا اختیار ہے اور وہی ہر شے کی پناہ گاہ ہے: قُلْ مَنْ يَبْدِءُ مَلَكُوْتٍ كُلِّ شَيْءٍ وَهُوَ يُجَيِّدُ وَّلَا يُجَارِعٰلَيْكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ، سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ قُلْ فَاَنىٰ تُشْرِكُوْنَ (پ ۵۶) وہی آسمانوں کا اور عرش عظیم کا مالک اور رب ہے: قُلْ مَنْ رَبُّ السَّمٰوٰتِ اسْتَجِبْ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ، سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ، قُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ (پ ۵۶) زندگی گزارنے کے قانون میں اپنے کو آزاد سمجھتے تھے، ہدایت رب کا محتاج نہ جانتے تھے۔

فرعون جس کو کفر میں اتنا غلو تھا اس کے متعلق بھی حق تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کی زبانی کہلوا یا ہے۔ لَقَدْ عَلِمْتُمْ اَنْزَلَ هٰٓؤُلَآءِ الْاٰرَابِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ بَصٰٓءِرًا (پ ۱۲۶) تو یہ خوب جانتا ہے کہ یہ عجائبات فاص آسمان و زمین کے پروردگار نے بھیجے ہیں جو کہ بصیرت کے لیے ذرا نفع ہیں، اور تمام مشرکین کے بارے میں ابلیس لعین تک نے کہا۔ اِنىٰ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ۔ نیز رب النظر فی اور رب بما اغویتی؟

صاف ظاہر ہے کہ ان مشرکین کا جرم ”اشراک فی الذات“ نہیں تھا، یعنی یہ اللہ کی ذات کے برابر کسی غیر کو واجب الوجود یا ازلی وابدی نہیں مانتے تھے، اور نہ ان کو اللہ تعالیٰ کی الوہیت سے انکار تھا۔ سوالے ثنویہ کے دنیا میں کوئی فرقہ اس کا قائل ہی نہیں ملتا۔ مشرکین مکہ تو حیدر بوبیت تک، کے مقرر

تھے۔ وہ حق تعالیٰ کی خالقیت اور رزاقیت، مالکیت و حاکمیت و ربوبیت کو مانتے تھے اور غیر اللہ کو حق تعالیٰ ہی کا مربوب، مرزوق، مخلوق، مملوک و محکوم جانتے تھے چنانچہ وہ اپنے تلبیہ میں کہتے تھے۔ لَبَّيْكَ لَا شَرِيكَ لَكَ إِلَّا شَرِيكَ هَوْلًا تَمْلِكُهُ وَمَا لَكَ يَعْنِي "اے اللہ میں تیری خدمت میں حاضر ہوں، تیرا کوئی شریک نہیں مگر وہ شریک کہ تو اس کا مالک ہے اور وہ کسی شے کا مالک نہیں۔"

اس طرح وہ نہ صرف حق تعالیٰ کے وجود کا اقرار کر رہے ہیں بلکہ اسی کو مالک و حاکم قرار دے رہے ہیں اور اسی کی ربوبیت کے قائل ہو رہے ہیں۔ لیکن باوجود اس اعتراف و خودباری اور اس کی الوہیت و ربوبیت کے انہیں کافر و مشرک کیوں ٹھہرایا گیا، ان کے تمام نیک اعمال کیوں ضبط اور برباد قرار دیے گئے۔ خلود فی النار کی وعید ان کو کیوں سنائی گئی؟ ان کا یہ ایمان باللہ کیوں ان کی جان و مال کو مسلمانوں کے ہاتھ سے محفوظ نہ کر سکا؟ اس ایمان کے باوجود اعداء اللہ کیوں قرار پائے؟ ان کو کذاب، مسحور، ظالم کیوں کہا گیا؟ ان کا شمار "مملکین" میں کیوں ہوا؟ انہیں بے عقل حیوان بلکہ ان سے بدتر کیوں ثابت کیا گیا؟ اِنْ هُمْ إِلَّا كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ سَبِيْلًا؟ کا فیصلہ ان کے متعلق کیوں فرمایا گیا؟

اس کا جواب تم اوپر پڑھ چکے ہو وہ ایک لفظ میں صرف یہ ہے: اَشْرَاكٌ فِي الْعِبَادَةِ! ہر قوم اور ہر امت کے لیے ایک نبی مبعوث ہوا اور اس نے "توحید فی العبادت" ہی کی طرف اپنی قوم کو دعوت دی: وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اِنْ اَعْبَدُوْا اللّٰهَ (پ ۶) حَضْرًا وَاَوْرَاصًا عَلَیْهِ وَسَلَّمَ نے بھی لوگوں کو افراد عبادت الہی کی طرف بلایا کہ جس طرح تم افراد ربوبیت کے صمقر ہو، اللہ ہی کو رب جانتے ہو، اسی طرح اللہ ہی کو معبود جانو۔ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کے قائل ہو جاؤ اس کے معنی و مقصدی پر عمل کرو، اللہ کے سوا کسی کو نہ پکارو، تمہاری ساری عبادت سر اوعلانیۃ قلبی و قلبی طور پر خالص اللہ کے واسطے ہو۔ استعانت ہو یا استغاثہ، ذبح ہو یا نذر، دعا ہو یا عکوف، طواف ہو یا کوئی عبادت یا پرستش کی کوئی سی شکل صرف اللہ ہی کے لیے مخصوص ہو



اس وقت غیر کا تصور بھی تمہارے ذہن میں نہ آئے! تم اللہ ہی کے فقیر ہو، ذل وافتقار کی نسبت اللہ ہی سے جوڑ لو، جھوٹے معبودوں سے اپنی بندگی کی نسبت قطعاً توڑ لو، ان سے نفع و ضرر کی توقع مطلقاً چھوڑ دو، اللہ تمہارے لیے بہر حال کافی ہے۔ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدًا  
تمہیں صرف اللہ ہی کا ہو کے رہنا چاہیے۔ اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ  
باخلق آشنا نہ شود مبتلائے تو بیگانہ باشد از ہمہ کس آشنائے تو

میخواہم از خدا بد عاصد ہزاران جاں تا صد ہزار بار بمیرم ہائے تو

مشرکین نے اس پیغام کو سن کر کہا دیکھو ہم اللہ تعالیٰ کے وجود کے قائل ہیں، اس کا انکار نہیں کرتے، اپنے بتوں کو اللہ تعالیٰ کے برابر نہیں جانتے بلکہ ان کو اللہ ہی کا مخلوق اور بندہ مانتے ہیں اللہ ہی کو مالک و حاکم و رب سمجھتے ہیں مستقل معبود بھی اللہ ہی کو جانتے ہیں اور اپنے بتوں کو اللہ ہی کی ملک سمجھتے ہیں، ہم ان کو محض اپنا شفیع (دکیل اور سفارشی) جانتے ہیں۔ ہم ان کی عبادت اس لیے ضروری سمجھتے ہیں کہ یہ اپنی وجاہت کی وجہ سے ہماری سفارش یا شفاعت

اللہ تعالیٰ کے پاس کر سکتے ہیں ھُوَلَاءِ شَفَعَاءُ نَاعِدُ اللّٰهَ (پ ۵۶) ان کی عبادت ہمیں اللہ تعالیٰ کی ناراضی و خفگی سے چھڑا کر اس کا قرب عطا کر سکتی ہے۔ مَا نَعْبُدُھُمْ اِلَّا لِيُقْرِبُوْنَا اِلَى اللّٰهِ ذَلْفٰی (پ ۱۵۶) یہی ان کا کذب، کفر اور شرک تھا! اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ كَاذِبٌ كَفّٰرٌ (پ ۶) سُبْحٰنَہٗ وَتَعَالٰی عَمَّا يُشْرِكُوْنَ (پ ۶)

اب ذرا اسی موقع پر تحقیق کر لو کہ ان مشرکین کے معبود کون تھے جن کو وہ شفیع اور مقرب سمجھ رہے تھے؟ امام فخر الدین رازیؒ نے "تفسیر کبیر" میں اس موضوع پر روشنی ڈالی ہے ان کی تحقیق کی رو سے بت پرستوں (عابدان اوٹان) کے دین سے کوئی دین قدیم نہیں کیونکہ انبیاء میں سب سے پہلے نبی جن کی تاریخ ہم تک پہنچی ہے وہ حضرت نوح علیہ السلام ہیں اور جب انہوں نے ان بت پرستوں کو توحید معبودیت کی طرف متوجہ کیا اور فرمایا اَعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ وَاَطِيعُوْا (پ ۹۶) تو ان بت پرستوں نے ان کی دعوتِ شب و روند کے جواب میں اپنے ساتھیوں سے کہا کہ

لَا تَذَرُنَّ آلِهَتِكُمْ وَلَا تَذَرُنَّ وِدَّاءَ وَلَا سِوَاءًا وَلَا يَعْوَتُ وَيَعُوقُ وَتَسْرًا یعنی تم اپنے

معبودوں کو ہرگز نہ چھوڑنا اور نہ ود کو اور سواع کو اور نہ یعوث کو اور یعوق کو اور نہ سر کو چھوڑنا

اب ان کے یہ معبودانِ باطل و دوسواع وغیرہ کون تھے؟ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم

نے نشانِ دہی کی ہے کہ یہ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کے چند نیک بخت اور بزرگ لوگ

تھے، ان کی موت کے بعد ان کے بیٹھنے کی جگہ پر ان کے نشان قائم کیے گئے، ان کا بھی وہی

نام رکھا گیا اور پھر کچھ عرصہ بعد ان نشانوں کی پرستش شروع کر دی گئی۔ اعتقاد یہ تھا کہ جس طرح

یہ بزرگ زندگی میں مجاب الدعاء رہے ہیں، روزِ حشر بھی مقبول الشفاعت رہینگے، اور اللہ تعالیٰ

کے ہاں ہماری شفاعت کریں گے۔ ان ہی کے حال کی خبر ہمیں اس آیت میں دی گئی ہے:-

يَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ مَا لَا

یعنی یہ لوگ اللہ کو چھوڑ کر ایسی چیزوں کی عبادت

بَصُرْتَهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَيَقُولُونَ

کرتے ہیں جو نہ ان کو ضرر پہنچا سکیں اور نہ ان کو نفع

هُوَ إِلَّا شَفَاعَاؤُنَا عِنْدَ اللَّهِ قُلْ

پہنچا سکیں اور کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے پاس ہمارے

أَتُنَبِّئُونَ اللَّهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي

سنا رہی ہیں آپ کہہ دیجیے کہ کیا تم خدا کو ایسی چیز کی خبر

السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ سُبْحَانَ

دیتے ہو جو خدا کو نہیں معلوم، نہ آسمانوں میں اور نہ زمین

وَتَعَالَى عَمَّا يُشْرِكُونَ (پ ۴۶)

میں وہ پاک اور برتر ہے ان لوگوں کے شرک سے۔

اس تحقیق سے صاف ظاہر ہے کہ بت پرست اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر بالاستقلال بتوں کو معبود

نہیں سمجھتے تھے بلکہ ان کی بت پرستی کا نشانہ اولیاء انبیاء وغیرہ کی تعظیم تھی۔ انہوں نے اپنے بتوں

کو انہی کی صورت پر تراشا اور انہیں اللہ تعالیٰ کے ہاں اپنا شفیع سمجھ کر اپنا سر نیازان کے سامنے

جھکاتے تھے۔ اس طرح وہ اصل میں ولی پرست، صالح پرست اور نبی پرست تھے! اب ذرا فخر رازی کی

عبارت بھی سن لو جو اوپر کی آیت کی توجیہ و تفسیر میں انہوں نے لکھی ہے۔

اَتَّكُمُ وَضَعُوا هَذِهِ الْأَصْنَامَ وَالْأَوْثَانَ

یعنی بت پرستوں نے یہ اصنام و اوثان اپنے انبیاء و

عَلَى صُورِ أَنْبِيَائِهِمْ وَآكَابِهِمْ وَزَعَمُوا

اکابر کی صورتوں پر تراشے تھے اور یہ خیال کرتے تھے کہ

انہم متی اشتغلوا بالعبادة هذه التامیل جب ہم ان کی عبادت میں مشغول ہونگے تو یہ کابر  
 فان اولئك الاکابر تکون شفعاء ہم اللہ کے پاس ہماری شفاعت کریں گے اس کی نظیر  
 عند الله تعالى ونظيره في هذا الزمان اس زمانہ میں اکثر لوگوں کی اپنے بزرگوں کی قبروں  
 اشتغال کثیر من الخلق بتعظیم قبور سے مشغولیت ہے اس اعتقاد سے کہ اگر ہم ان  
 الاکابر علی اعتقاد انہم اذا عظموا قبورهم قبروں کی تعظیم کریں گے تو یہ اللہ کے نزدیک ہمارے  
 فانہم یكونون شفعاء لهم عند الله شفیع ہونگے۔

اوپر کی توضیحات سے مندرجہ ذیل چار امور صاف طور سے لازم آتے ہیں۔ انہیں خوب

ذہن نشین کر لو:-

(۱) زمانہ قدیم کے بت پرست حقیقت میں انبیاء پرست اور اولیاء پرست تھے جن تعالیٰ نے

انہیں "مشرک" قرار دیا۔

(۲) وہ خود اس امر کے قائل تھے کہ بت ہمارے بالاستقلال معبود نہیں بلکہ بالاستقلال ہمارا

معبود اللہ ہی ہے اور یہ صرف ہمارے سفارشی ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی کو شفیع یا سفارشی  
 جان کر بھی اس کی عبادت کرنا موجب شرک ہے (یعنی کسی کو سفارشی یا شفیع سمجھنا یہ شرک نہیں  
 ہے بلکہ ان کی عبادت اس لیے کرنا کہ ہماری سفارش کریں گے یہ شرک ہے۔

(۳) جو افعال عبادت ان مشرکین سے صادر ہوئے اگر کسی کلمہ گو سے بھی صادر ہوں تو اس

پر بھی شرک کا اطلاق کیا جائیگا اور اس کا دعویٰ اسلام اور اس کی کلمہ گوئی اطلاق شرک سے  
 مانع نہ ہوگی چنانچہ اسی وجہ سے امام رازیؒ نے گور پرستوں کو بت پرستوں کا نظیر قرار دیا۔

(۴) جب غیر اللہ کو شفیع جان کر ان کی عبادت کرنا شرک ہوا تو پھر ان کو بالاستقلال عالم

میں متصرف جان کر پوجنا تو بدرجہ اولیٰ شرک ہوگا۔ مثلاً اولیاء و انبیاء سے اولاد مانگنا، رزق کی  
 کشادگی چاہنا، قضاء حاجات کی دعا کرنا وغیرہ۔

۱۰ تفسیر کبیر ج ۴ ص ۵۵۲ سورہ یونس تحت آیہ ھولاء شفعاء نا عند الله۔

مشرکین کی عبادت بس یہی تھی کہ وہ اپنے اصنام و اوثان (غیر اللہ) کو مقرب و مشفیع اور نافع و ضار جان کر ان کے سامنے ذلیل و خوار بن کر کھڑے ہوتے اور

(۱) ان سے وقت حاجت فریادرسی چاہتے تھے یعنی ان کو پکارتے یا استغاثہ کرتے تھے۔  
(۲) اپنے مال کا ایک حصہ ان کی نذر و نیاز کے لیے صرف کرتے تھے، ان سے منتیں مانگتے ان کے لیے جانور ذبح کرتے اور ان کے ارد گرد پھرتے یا طواف کرتے تھے۔ گو وہ حق کی ربوبیت کے قائل تھے اور اس کو خالق و رازق، محی و ممیت، مدبر زمین و آسمان مانتے تھے: یا یومن اکثرہم باللہ الا وہم مشرکون!

اب قرآن کریم کی طرف رجوع کرو اور دیکھو کہ نداء، دعاء، استغاثہ، استعانت، نذر، طواف وغیرہ سب افعال عبادت ہیں، جب حق تعالیٰ ہی معبود و رب واحد و احد ہیں تو پھر ان افعال کا تعلق صرف انہی سے ہونا چاہیے اور کسی غیر سے نہیں **اعْبُدُوا اللَّهَ وَلَا تُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا** (پہ ۳۶) یہی ہے "افراد عبادت اللہ فاعبد اللہ مخلصاً للدين، الا للہ الدین الخالص" (پہ ۱۵۶) مشرکین نے ان کا تعلق غیر اللہ سے روار کھا تھا اور اسی لیے انہیں تہدید کی گئی تھی کہ **فَلَا تَجْعَلُوا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَاَنْتُمْ تَعْمَلُونَ** یعنی تم جانتے ہو کہ حق تعالیٰ کا کوئی نداء ہم سے نہیں پھر تم کیوں غیر اللہ کی عبادت کیے کہ ان کو معبود قرار دے کر انہیں حق تعالیٰ کا ہمسر بنا رہے ہو؟ تمہارا یہ عقیدہ کہ اگر تم ان کا تقرب ندا و دعا، نذر و نیاز، ذبح و نحو طواف و عنکوف کے ذریعہ حاصل کرو گے تو یہ تمہیں حق تعالیٰ کے "قرب" کر دینگے اور تمہارے شفع بن جائینگے قطعاً باطل ہے کفر بحت ہے، شرک محض ہے!

دعا عبادت ہے دعا (دعوت، دعا، دعویٰ) کے معنی ندایا پکارنے کے ہیں۔ اس پر ائمہ لغت کا اجماع ہے۔

چنانچہ امام رابع نے اپنی مفردات میں تصریح کی ہے کہ **الدعاء** کا لنداء یعنی دعا ندا کے معنی میں ہے۔ صراح میں بھی دعا بمعنی خواندن ہے۔ مدارک میں ندا اور دعا کافرق و امتیاز اس طرح ظاہر کیا گیا ہے: **الدعاء ما یسمع والدعاء قد یسمع وقد لا یسمع**۔ اس سے دعا وظیفہ لسانی قرار پاتی ہے۔ مجمع البحار میں بتلایا گیا

لہ سو آپ خالص اعتقاد کر کے اللہ کی عبادت کرتے رہیں، یاد رکھو عبادت ہو کہ خالص ہو اللہ ہی کے لیے سزا دار ہے۔

کہ الدعاء الغوث یعنی دعا فریاد کرنا اور دہائی مانگنا ہے اور بطور شہادت آیت اُدْعُونِي اَسْتَجِبْ لَكُمْ مِثْلَ كُنْتُمْ لِي وَرَبِّي اذْ نَزَلَ بِكُمُ الضَّرْبُ يَعْنِي جِبْتُمْ بِرُكُونِي مَصِيبَتِ نَازِلٍ هُوَ تَوْجُّهٌ مِّنْ فَرَادِ رَسِيٍّ چاہو۔ قرآن کریم کی اس آیت سے بھی وَ اٰخِرُ دَعْوَاهُمْ اِنَّ الْحَمْدَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ دعا کے معنی پکارنے کے ثابت ہوتے ہیں۔ نیز اس آیت سے لَا تَجْعَلُوْا دُعَاءَ الرَّسُوْلِ بَيْنَكُمْ كَدُعَاءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا۔ اگر یہاں دعا کے معنی عبادت کے لیے جائیں (جیسا کہ بعض کا زعم ہے) تو لازم آتا ہے کہ صحابہؓ ایک دوسرے کی عبادت کرتے تھے۔ وحاشا ہم عن ذلک۔ دعا شرع میں عبادت کا حکم رکھتی ہے کیونکہ اس سے عجز عباد اور قدرت رب العباد کا اظہار ہوتا ہے، مانگنا، گڑگڑانا، عجز کا ظاہر کرنا لوازم عبودیت سے ہے جس طرح عظمت و کبریا، ہیبت و قدرت، جلال و استغنا لوازم مہرودیت سے ہیں۔ لوازم عبودیت ظاہر ہے کہ عبادت ہیں۔ چنانچہ صاحب تفسیر نیشاپوری نے اُجِيبْ دَعْوَةَ الدَّاعِ کے ذیل میں خوب تصریح کر دی ہے۔

اعلم ان الدعاء مصدر، دعوت ادعو، وقد تكون اسما تقول سمعت دعاء كذا تقول سمعت صوتا، وحقيقة الدعاء استدعاء العبد برجل جلاله العناية والاستمداد والمعونة، وقال جمهور العقلاء: ان الدعاء من اعظم مقامات العبودية وانه من شعائر الصالحين وداب الانبياء والمرسلين والقران ناطق بصحة عن الصديقين والاحاديث مشحونة بالدعية لما ثورته بحيث لا يساغ

للاذكار ولا مجال للعناد (مطبوعہ ایران ۱۳۲۵ھ ج ۱ ص ۱۹۳)

خلاصہ یہ کہ دعا مصدر ہے اور کبھی اسم بھی ہوتا ہے جیسے کہا جاتا ہے کہ میں نے دعا کو سنا جس طرح کہ آواز کو سنا اور دعا کی حقیقت یہ ہے کہ عبد اپنے رب سے استدعا کرتا ہے اور اس مدد و معونت و عنایت کا خواستگار ہوتا ہے۔ جمهور عقلا کا اس امر پر اتفاق ہے کہ دعا بلند ترین مقامات عبودیت سے ہے یہ صالحین کا شعار اور انبیاء و مرسلین کا طریقہ رہا ہے۔ قرآن ناطق ہے کہ وہ صدیقین سے ثابت ہے، اور احادیث ادعیۃ ما ثورہ سے بھری ہوئی ہیں، یہاں مجال انکار نہیں



جب دعا عبادت ہے تو پھر غیر اللہ سے دعا کرنا شرکِ صریح قرار پائیگا۔ لیکن قرآن کریم نے مخلوق سے مدد و معونت اور استغاثہ اس صورت میں جائز رکھتا ہے کہ جب یہ ایسے امور میں کیا جائے جو ان کی قدرت و قوت کے احاطہ میں ہوں، دیکھو قرآن میں اس اسرائیلی کا قصہ مذکور ہے جس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کسی قبطی کے خلاف استغاثہ کیا تھا۔ فَاسْتَغَاثَهُ الَّذِي مِنَ شَيْعَتِهِ عَلَى الَّذِي مِنْ عَدُوِّهِ (پ ۵۶) کسی دوسری جگہ دین کے کاموں میں مدد چاہنا اور مدد دینا واجب قرار دی گئی ہے: وَإِنْ اسْتَنْصَرُواكُمْ فِي الدِّينِ فَعَلَيْكُمْ النَّصْرَةُ (پ ۱۶) اسی طرح نیکی اور تقویٰ میں استغاثت کا حکم دیا گیا ہے: تَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ (پ ۶) جب مظلوم کسی ظالم کے خلاف حاکم کے پاس فریاد کرتا ہے، یا بیمار حکیم سے کہتا ہے کہ تم میرا علاج کرو یا کسی مقدمہ میں وکیل سے مدد لیجاتی ہے تو اس طرح کی استغاثت و استغاثہ منع نہیں۔ ایسا دنیویہ کا استعمال نہ صرف جائز بلکہ مامور بہ ہے۔ لیکن بنیادی عقیدہ یہ ہوتا ہے کہ اسباب بالذات مؤثر نہیں حق تعالیٰ ہی ان میں اثر پیدا کرتے ہیں، ہر چیز اپنے اثر کے ظہور میں اللہ تعالیٰ کے اذن کی محتاج ہے۔ یہ عقیدہ باطل ہے کہ اشیاء کی وجود بخشی کے وقت ہی ان میں اثرات رکھ دیے گئے ہیں اور اسی راہ سے وہ اثر کرتی ہیں اور اب حق تعالیٰ کے حکم و امر کی حاجت نہیں، یا ان میں یہ قوت ہے کہ کبھی بھی اپنے آثار و احکام سے تخلف نہ کریں! دیکھو جب حضرت ابراہیم آگ میں ڈالے گئے تو حق تعالیٰ نے آگ میں اثر اِحراق پیدا نہ کیا اور نہ جلے!

غرض آثار اشیاء حق تعالیٰ ہی کے ہاتھ میں ہیں اور باران صفت اشیاء پر برتے رہتے ہیں۔ اسی طرح مخلوق میں فعل کی جو قدرت ہوتی ہے وہ فعل کے وقت ہی عنایت ہوتی ہے اور اس سے فعل کا صدور ہوتا ہے، یہ نہیں کہ فعل کی قدرت پہلے ہی سے مخلوق میں موجود ہے جس کی وجہ سے وہ اپنے افعال پر قادر ہے اور خالق کا محتاج نہیں، ورنہ یہ لازم آئیگا کہ تمام مخلوقات وجود میں آنے

۱۔ سو وہ جو ان کی برادری کا تھا اس نے موسیٰ سے اس کے مقابلہ میں جو کہ ان کے مخالفین ہیں سے نکھار دیا ہے۔  
 ۲۔ اگر وہ تم سے دین کے کام میں مدد چاہیں تو تمہارے ذمہ مدد کرنا واجب ہے۔ ۳۔ نیکی اور تقویٰ میں ایک دوسرے کی اعانت کرتے ہو اور گناہ اور زیادتی میں ایک دوسرے کی اعانت مت کرو۔

کے بعد حق تعالیٰ سے مستغنی ہوں اور بے پرواہ، مستقل ہوں اور غیر محتاج، واللہ لازم باطل فالملزوم مثلاً  
ملا علی قاری نے شرح فقہ اکبر میں اسی چیز کی طرف اشارہ کیا ہے :-

ثم اعلم ان اعادة العبد التي تقارن یعنی جان لینا چاہیے کہ بندہ کا ارادہ جو فعل کے ساتھ  
فعله وقدرة عليه حال صنعہ ہوتا ہے اور اس فعل کی قدرت وقت وقوع فعل،  
مخلوقتان مع الفعل لا قبل ولا بعدہ دونوں فعل کے ساتھ ہی مخلوق ہوتے ہیں پہلے ہوتے

یعنی ارادہ، قدرت اور فعل سب مخلوق الہی ہیں، یہی عقیدہ ہے اہل سنت و جماعت کا، اور معنی ہے  
اس آیت صریح پر: وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُونَ (پ ۶، ۷) نیز اس آیت پر مَا تَشَاءُونَ اِلَّا اَنْ  
يَشَاءَ اللّٰهُ (پ ۶، ۷) نیز لا قوة الا باللہ پر۔

اس طرح عقیدہ کی تطہیر ہونے کے بعد ہی یہ سمجھ میں آتا ہے کہ حق تعالیٰ کے سوا نہ کوئی مغیث  
ہے اور نہ غیاث، نہ کوئی معین ہے اور نہ مستعان، ہماری ہر فریاد رسی علی الاطلاق حق تعالیٰ ہی سے  
ہے۔ دیکھو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ایک منافق تھا جو مسلمانوں کو دق کیا کرتا تھا  
حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا پلو حضرتؓ سے استغاثہ کریں۔ آپ نے سن کر فرمایا کہ مجھ سے استغاثہ نہ کرنا چاہیے  
استغاثہ تو اللہ ہی سے کرتے ہیں (رواہ الطبرانی) اگر کسی غیر کے ہاتھ سے کوئی چیز حاصل ہو جائے تو  
وہ مجاز ہے نہ کہ حقیقت، کیونکہ حقیقت اللہ ہی کے لیے ہے اور اسی کا اسم مبارک غیاث و مغیث ہی  
تاہم امور اختیار میں خلق سے استعانت جائز ہے مگر اسی عقیدہ کے ساتھ جس کا بھی ذکر ہوا۔

جن امور میں سوا حق تعالیٰ کے کسی اور کو قدرت نہیں ان میں کسی اور کو پکارنا اور ان سے  
استغاثہ کرنا، یا اعانت چاہنا حرام یا شرک ہے جیسے رزق کا دینا، مینہ کا برسانا، بیمار کو شفا بخشنا، ہدایت  
کرنا، گناہ کا بخشنا وغیرہ۔ اب پہلے بعض ان آیات قرآنی پر بھی غور کر لو جن سے دعا کا عبادت ہونا صاف

لَهُ هَلْ مِنْ خَالِقِ غَيْرِ اللّٰهِ يَرْزُقُكُمْ مِنَ السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ - ۱۰۰ وَهُوَ الَّذِي يَنْزِلُ الْغَيْثَ مِنْ  
بَعْدِ مَا قُنُوتُوا وَيُنْزِلُ رَحْمَتَهُ - ۱۰۱ وَ اِذَا مَرَضْتَ فَهَوِّئْ لِنَفْسِكَ - ۱۰۲ اِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ اَحْبَبْتَ  
وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ - ۱۰۳ وَمَنْ يَغْفِرِ الذُّنُوبَ اِلَّا اللّٰهُ - ۱۰۴ صَفْحَةٌ مِّنْ مَّغْزٰتِ اللّٰهِ

ثابت ہوتا ہے۔

دیکھو حق تعالیٰ اپنے بندوں کو دعا کا حکم فرما رہے ہیں۔ اَدْعُوا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَخُفْيَةً إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ (پ ۱۳ ع ۱۳) دوسری جگہ ارشاد ہے: - وَادْعُوهُ خَوْفًا وَطَمَعًا إِنَّ رَحْمَةَ اللَّهِ قَرِيبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِينَ (پ ۱۳ ع ۱۳) ان آیات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ اپنے بندوں سے دعا چاہتے ہیں ماسی سبب سے دعا عبادت ہے۔ اس کی مزید توثیق اس امر سے ہوتی ہے کہ غیر کو پکارنے سے منع فرما رہے ہیں فَلَا تَدْعُوا مَعَ اللَّهِ أَحَدًا (پ ۱۱ ع ۱۱) وَلَا تَدْعُ مِن دُونِ اللَّهِ (پ ۱۶ ع ۱۶) پھر دعا کو اپنے ہی لیے مخصوص کر رہے ہیں۔ لَدَعْوَةِ الْحَقِّ (پ ۸ ع ۸) اس طرح اثباتاً و نفیاً دعا کو حق تعالیٰ اپنی ہی ذات کے لیے مخصوص فرما رہے ہیں اور اپنے سوا کسی کو اس کے لائق نہیں قرار دے رہے ہیں یعنی منادی صرف حق تعالیٰ ہی ہیں! پھر دعا کا حکم دے کر اس کو صاف طور پر عبادت قرار دیا گیا ہے: اَدْعُونِي اسْتَجِبْ لَكُمْ (پ ۶)

اسی طرح جب دعا کا عبادت ہونا آیات قرآنیہ سے ثابت ہوا تو اب احادیث نبویہ پر ایک نظر ڈالو، جو دعا کو عین عبادت قرار دے رہی ہیں۔

(۱) عن نَعْمَانَ بْنِ بَشِيرٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: الدُّعَاءُ هُوَ الْعِبَادَةُ ثُمَّ قَرَأَ وَقَالَ رَبُّكُمْ اَدْعُونِي اسْتَجِبْ لَكُمْ (رواه احمد والترمذی ابوداؤد والنسائی وابن ماجہ) یعنی دعا عبادت ہی تو ہے، پھر آپ نے یہ آیت پڑھی اَدْعُونِي اسْتَجِبْ لَكُمْ۔ اس آیت کے پڑھنے سے مراد یہ ہے کہ دعا کے عبادت ہونے کا سبب یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے اس کا حکم کیا ہے۔

(۲) عن انسٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الدُّعَاءُ هُوَ الْعِبَادَةُ (رواه الترمذی) یعنی دعا مغز ہے عبادت کا، جس طرح مغز شے کی حقیقت ہوتا ہے اسی طرح دعا یعنی خضوع و خشوع و تذلل کے ساتھ پکارتا عبادت کی حقیقت ہے اور اس لیے مخصوص ہے حق تعالیٰ ہی کے ساتھ جو محیب الدعوات ہیں۔

۵۸

لہ تم لوگ اپنے پروردگار سے دعا کیا کرو تو ذلل ظاہر کرتے بھی اور چپکے چپکے بھی اور واقعی اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو ناپسند کرتے ہیں

(۳) عن ابی ہریرۃ قال قال رسول رسول اللہ صلعم: من لم یسأل اللہ یغضب علیہ (رواہ الترمذی) یعنی جو اللہ سے نہ مانگے اس سے اللہ ناراض ہوتا ہے، جب اللہ سے نہ مانگنا غصہ کا باعث ہوتا ہے تو اس سے نہ مانگ کر اوروں سے مانگنا تو اور زیادہ غضب ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دعا اللہ تعالیٰ کو کس قدر محبوب ہے۔

جب دعا کا عبادت ہونا ثابت ہو گیا تو اب صاف ظاہر ہے کہ غیر اللہ سے دعا مانگنا شرک ہے، شرک فی العبادت ہے۔ اس مقصد کے لیے آیات قرآنیہ کا پیش کرنا ضروری نہیں لیکن مزید تقویت کے لیے چند آیات پر غور کر لو:

(۱) وَلَا تَدْعُ مِنْ دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَنْفَعُكَ وَلَا يَضُرُّكَ فَإِنْ فَعَلْتَ فَإِنَّكَ إِذَا مَنَّ الظَّالِمِينَ یعنی مت پکار اللہ کے سوا ایسے کو کہ نہ بھلا کرے تیرا اور نہ نقصان پھر اگر تو ایسا کرے تو تو بھی اسی وقت ظالموں میں ہو جائیگا۔ (پ ۱۶۶)

طلبِ منفعت و دفعِ مضرت کے لیے غیر اللہ کو درود سے پکارنا، اپنی حاجتوں اور ضرورتوں کو ان سے عرض کرنا اور اس طرح ان کی پرستش کرنا بڑے ظلم و ستم کی بات ہے، کیونکہ جس اللہ کی قدرت میں بندہ کا نیک و بد نفع و نقصان سب کچھ ہے اس پروردگار کو چھوڑ کر، اس سے منہ موڑ کر ایسی ہستیوں کی طرف متوجہ ہونا اور ذلت و فقر کی نسبت ان سے جوڑنا جو نہ کسی کے نفع پر قادر ہیں اور نہ نقصان پر، اس سے بڑھ کر دنیا میں ظلم و ستم کیا ہو سکتا ہے! شرک ہی سب سے بڑا ظلم ہے: إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ (پ ۱۱۷)

یہاں ایک شبہ کا ازالہ ضروری ہے بعض مفسرین نے ”دُونِ اللَّهِ“ اور ”غَيْرِ اللَّهِ“ کی توجیہ میں اصنام و اوثان کا ذکر کر دیا ہے۔ اس لیے بعض شرک پسندوں نے یہ سمجھ لیا کہ شرک اس وقت ہوگا جب بتوں سے دعا کی جائے۔ انبیاء و اولیاء سے دعا کرنا، مرادیں مانگنا شرک نہیں۔ یہ صریحاً غلط ہے اور اس کی دو وجہیں ہیں۔

(۲) علمِ اصول کا یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ ”العبرة بعموم الالفاظ لا بخصوص الموارد“ یعنی اعتبار

عموم الفاظ کا ہوتا ہے نہ کہ خصوص موارد کا، غیر اللہ اور دون اللہ دونوں عام الفاظ ہیں۔ اللہ کے سوا جتنی مخلوقات ہیں سب ان میں داخل ہیں، خواہ ولی نبی ہو، یا بھوت پری۔ چنانچہ بیضاوی اس آیت کی تفسیر میں کہ قُلِ ادْعُوا الَّذِينَ زَعَمْتُمْ مِنْ دُونِهِ لَكُم بِهِمْ قُلُوبُ الَّذِينَ ادْعُوا الَّذِينَ زَعَمْتُمْ اِنَّهُمْ اِلَهَةٌ مِنْ دُونِ كَالْمَلَائِكَةِ وَالْمُسِيحِ وَعِزْرٍ۔ یعنی ان لوگوں کو پکارو جن کو تم نے معبود سمجھ رکھا ہے اللہ کے سوا جیسے ملائکہ، مسیح و عزیر۔ اس سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ جو ملائکہ اور انبیاء کو پکارے وہ بھی مشرک ہے اور اللہ تعالیٰ نے ان کی ویسی ہی زبرد تو بیخ کی ہے جیسی کہ بت پرستوں کی کی ہے۔ اس عموم الفاظ کے اعتبار سے صاحب جلالین نے اکثر مقامات پر دون اللہ کا ترجمہ غیر اللہ سے کیا ہے۔

(۲) جیسا کہ ہم نے اوپر تصریح کی ہے، کفار نے اپنے بت اپنے اکابر (انبیاء و اولیاء) ہی کے نام پر تالشے تھے اور ان کی بت پرستی کا منشا ان ہی اکابر کی تعظیم تھی، لہذا وہ دراصل بت پرستوں اور درختوں کی عبادت نہیں کر رہے تھے بلکہ انبیاء و اولیاء و صلحاء کو پوج رہے تھے۔

غرض غیر اللہ و دون اللہ سے مراد نہ صرف بت ہیں بلکہ انبیاء و اولیاء سب اس میں شامل ہیں۔ اعتبار عموم الفاظ کا ہوتا ہے نہ کہ خصوص موارد کا۔ اور عقلاً غور کرو کہ انبیاء و اولیاء غیر اللہ ہیں کہ عین اللہ؟ جب غیر اللہ کی عبادت مشرک ہے تو صنم و شن، نبی ولی، پیر، شہید، بھوت پری سب حرمت عبادت میں مساوی ہیں اور ان میں تفریق باطل ہے۔ اگر ہم تفریق کے قائل ہو جائیں کہیں کہ عبادت من دون اللہ کی حرام و مشرک ہے بخلاف عبادت اولیاء و انبیاء کے تو لازم آتا ہے کہ انبیاء اور اولیاء عین اللہ میں اللہ لازم باطل فالملزوم مثلہ۔

(۱) اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ عِبَادٌ اَمْثَالُكُمْ فَاَدْعُوْهُمْ فَلَيْسَ تَعْبُدُوْا اللّٰهَ اِنَّكُمْ كُنْتُمْ صَادِقِيْنَ (پہ ع ۱۳) یعنی واقعی تم خدا کو چھوڑ کر جن کو پکارتے ہو وہ بھی تم ہی جیسے بندے ہیں سو تم ان کو پکارو، پھر ان کو چاہیے کہ تمہارا کہنا کر دیں اگر تم سچے ہو!

اس آیت میں اس امر کی صاف طور پر تصریح ہے کہ مشرکین اللہ کے سوا بعض اولیاء



انبیاء اور ملائکہ کو دفع مضرت و جلب منفعت کے لیے پکارا کرتے تھے اس لیے ان سے کہا گیا کہ جن کو تم امداد کے لیے پکارتے ہو وہ بھی تمہارے مانند بندے ہیں محض اصنام و اوثان پر عباد کا اطلاق نہایت بعید معلوم ہوتا ہے اور اگر مجازاً اصنام بھی مراد لیں تو امثالکم کا لفظ اس سے ابا کرنا ہے۔ اسی لیے مقاتل نے اس کی تفسیر میں کہا ہے کہ مراد ان عباد سے ملائکہ ہیں اور اس آیت کے مخاطب وہ ہیں جو ملائکہ کو پوجتے تھے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ مقبول بندوں سے دعا کرنے والا بھی مشرک ہے اور مردود، اس لیے کہ وہ من دون اللہ سے دعا کرتا ہے اور من دون اللہ عام ہے اور اس میں تمام مخلوقات شامل ہیں، مقبول ہوں یا مردود (۲) قُلِ ادْعُوا الَّذِينَ زَعَمْتُمْ مِنْ دُونِ فَلَا يَمْلِكُونَ كَشْفَ الضُّرِّ عَنْكُمْ وَلَا تَحْوِيلًا أُولَئِكَ الَّذِينَ يَدْعُونَ يَبْتَغُونَ إِلَىٰ رَبِّهِمُ الْوَسِيلَةَ أَيُّهُمْ أَقْرَبُ وَيَرْجُونَ رَحْمَتَهُ وَيَخَافُونَ عَذَابَ إِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ مَحْذُومًا یعنی جن کو تم خدا کے سوا قرار دے رہے ہو ذرا ان کو پکارو تو سہی سو وہ تم سے نہ تکلیف کو دور کرنے کا اختیار رکھتے ہیں نہ ان کے بدل ڈالنے کا، یہ لوگ جن کو مشرکین پکار رہے ہیں وہ خود ہی اپنے رب کی طرف ذریعہ ڈھونڈ رہے ہیں کہ ان میں کون زیادہ مقرب بنتا ہے اور وہ اس کی رحمت کے امیدوار ہیں اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں۔

اس آیت میں اس امر کی خوب تصریح کی گئی ہے کہ حق تعالیٰ کے سوا کسی کو قدرت نہیں کہ کسی کی مصیبت اور تکلیف کو دور کر سکے یا اس کو راحت و نعمت میں بدل دے، کوئی نبی، ولی، فرشتہ وغیرہ کسی کی مصیبت و ضرر کو دور کرنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ اور یہ احمق مشرک جن ہستیوں کو اچھے بُرے کا مختار جان کر پکارتے ہیں ان کا خود یہ حال ہے کہ وہ حق تعالیٰ ہی سے امید رکھتے ہیں اور اسی کے عذاب سے لرزاں و ترساں ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان سے مراد خدا کے مقبول بندے ہیں نہ کہ اصنام و اشرارِ عباد، کیونکہ حق تعالیٰ سے امید و رجاء رکھنا، اس کے قرب کا طالب ہونا اشرار سے ممکن نہیں اور اصنام سے تو اور زیادہ غیر ممکن ہے پھر جب مقبول بندوں کو پکارنے اور ان سے اپنے مصائب کا دفعیہ چاہنے والوں پر یہ عتاب ہو رہا ہے تو مردودین کے

ماننے والوں کا کیا حال ہوگا۔

تفسیر بیضاوی میں اس آیت کی تفسیریوں کی گئی ہے۔ قل ادعوا الذين زعمتم انهم  
الهة من دونك لعلهم يسمعون ولا يملكون فلا يستطيعون كشف الضر  
عنكم كالمرض والفقر ولا تحويلا ولا تحويلا ذلك منكم الى غيركم (دیکھو بیضاوی نے صراحت  
کردی ہے کہ ملائکہ اور مسیح اور عزیز تک "کشف ضر" یعنی مرض و فقر و قحط یا مصائب و آفات کے رفع  
کرنے کی طاقت نہیں رکھتے اور نہ اس کو بطور خود پھیر سکتے ہیں۔ جب ان ابرار کا یہ حال ہو تو  
ان سے کم درجہ کے لوگوں کا کیا پوچھنا!

(۳) يَا أَيُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاستمعوا له إِنَّ الَّذِينَ تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ لَنْ  
يَخْلُقُوا ذُبَابًا وَلَوْ اجْتَمَعُوا لَهُ وَإِنْ يَسئلبهم الذُّبَابُ شَيْئًا لَا يَسْتَفِيدُونَ مِنْهُ طَمَعًا الطَّالِبِ  
وَالْمَطْلُوبِ فَأَقْدَرُ اللَّهُ حَقَّ قَدْرِهِ إِنَّ اللَّهَ لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ (پ ۱۷۶) یعنی اے لوگو! ایک عجیب  
بات بیان کی جاتی ہے اس کو کان لگا کر سنو، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جن کو تم لوگ خدا کو چھوڑ کر  
پکارنے ہو، وہ ایک مکھی کو تو پیدا کر ہی نہیں سکتے گو سب کے سب بھی جمع ہو جائیں اور اگر ان سے  
مکھی کچھ پھین لے جائے تو اس کو اس سے چھڑا نہیں سکتے، ایسا عابد بھی پھر اور ایسا معبود بھی پھر ان  
لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی جیسی تعظیم کرنا چاہیے تھی وہ نہ کی۔ اللہ تعالیٰ بڑی قوت والا سب پر غالب  
ہے۔

ان آیات سے یہ امر روز روشن کی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ جو لوگ حق تعالیٰ کے سوا کسی سے  
دعا مانگتے اور اس کی عبادت کرتے ہیں وہ صریح گمراہی اور ضلالت میں مبتلا ہیں، ان کا مذہب  
باطل ہے، کیونکہ

د۱ جن کی یہ عبادت کر رہے ہیں خواہ وہ اصنام ہوں یا ملائکہ عظام یا انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ  
والسلام وہ ایک مکھی تک کو پیدا نہیں کر سکتے، پھر ان سے کسی ایک چیز کا مانگنا اور اس کے لیے

۱۷ تفسیر بیضاوی ص ۷۰۲ مطبوعہ دارالطباعة عامر قسطنطنیہ ۱۳۰۳ھ

گرا کر مانا جس کو پیدا کرنے کی ضرورت ہو کیسی جہالت ہے! جب وہ سب کے سب جمع ہو کر حیرت سے  
 حیرت چیز کو پیدا کرنے کے قابل نہیں تو پھر غور کرو کہ انفرادی حیثیت سے وہ کس قدر عاجز ٹھہرتے ہیں  
 (۱) اب رہا ان سے ایسی چیز کا طلب کرنا جس کے پیدا کرنے کی ضرورت نہیں سو یہ بھی باطل  
 ہے، کیونکہ حق تعالیٰ نے جو چیز جس کے لیے مقرر کر دی ہے اس میں نہ وہ ایک ذرہ کا اضافہ کر سکتے  
 ہیں اور نہ اس سے ایک ذرہ کی کمی، وہ کسی چیز کو ایک مکھی سے بھی چھین کر دوسرے کو دینے کی  
 سکت نہیں رکھتے اور نہ آپ ہی لینے کی قوت تو پھر ان سے عرضِ حاجات اور طلبِ مرادات  
 کرنا کتنی حماقت ہے! اور آخر میں یہ بھی فرما دیا گیا کہ ان مشرکین نے حق تعالیٰ کی قدر جیسی چاہیے  
 ویسی نہ سمجھی، اگر سمجھتے تو حق تعالیٰ کو چھوڑ کر ان بیچاروں سے کہ جن سے ایک مکھی تک نہیں بن  
 سکتی کاہے کو حاجتیں مانگتے اور مرادیں طلب کرتے ”خاک پڑے ایسی سمجھ پر جو بادشاہ کے  
 روبرو فقیر سے بھیک مانگے“ ۱۷

شرمت باد کہ من بسویت نگران      باشم تو نہی چشم بسوئے دگران (جامی)  
 یہاں من دون اللہ سے محض اصنام اور بت مراد لیتا کسی طرح درست نہیں جیسا کہ ہم نے  
 اوپر کہا ہے کہ یہ لفظ عام ہے۔ اللہ کے سوا جتنی مخلوق ہے سب اس میں شامل ہے۔ علاوہ ازیں  
 حق تعالیٰ نے انہیں قابلِ عبادت اور لائقِ دعا اس سے نہیں قرار دیا کہ وہ کسی شے کی تخلیق  
 پر قادر نہیں۔ لن یخلقوا میں کن اصل میں نفی مستقبل کے لیے آیا ہے اور اس کی نفی موکد ہوتی ہے  
 جس طرح تمام اہل لغت اور مفسرین نے اس کی تصریح کی ہے اور ظاہر ہے کہ یہ علت عام  
 ہے تمام مخلوق کو خواہ انبیاء ہوں یا اولیاء، اغنیاء ہوں یا اشقیاء، ان میں سے کسی کو تخلیق کی  
 قابلیت نہیں۔ اور یہ تو ہم بتا چکے ہیں کہ بت پرست اپنے بتوں کو بذاتہ معبود نہیں سمجھتے  
 تھے بلکہ مقصود ان کی تعظیم سے اولیاء و انبیاء کی تعظیم تھی جن کی صورتوں پر وہ مورتیں بنائی  
 گئی تھیں۔ چنانچہ امام رازی نے اس کی صراحت ان الفاظ میں کی ہے۔

”فالقوم كانوا يعتقدون فيها انها طلسمات موضوعة على صورة الكواكب

وانها تامل الملائكة والانبیاء المتقدمین وكانوا يعظمونها علی ان  
تعظیمها یوجب تعظیم الملائكة واولئک الانبیاء لہ

اس سے صاف ظاہر ہے کہ جو تعظیم و عبادت مخصوص بحضرت حق تعالیٰ جل شانہ ہے اس کو  
انبیاء و اولیاء کے ساتھ متعلق کرنا ایسا ہی شرک ہے جیسا کہ بتوں کے ساتھ کرنا ان وجوہ کی  
بنیاد پر ان آیات کی تخصیص بتوں کے ساتھ باطل ہے اور نتیجہ ظاہر ہے کہ جس طرح بتوں  
سے دعا کرنا شرکِ جلی ہے بالکل اسی طرح نبی و ولی سے دعا کرنا بھی شرکِ جلی ہے۔

(۵) لَدْ دَعْوَةُ الْحَقِّ وَالَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ لَا يَسْتَجِيبُونَ لَهُمْ شَيْءٌ إِلَّا كِبَاسِطٍ  
كَفِيَّةٍ إِلَى الْمَاءِ لِيَبْلُغَ فَاهُ وَمَا هُوَ بِبَالِعِنْدِ وَمَا دَعَاءُ الْكَافِرِينَ إِلَّا فِي ضَلَالٍ (پ ۸۶) ”سچا پکارنا  
اسی کے لیے خاص ہے اور خدا کے سوا جن کو یہ لوگ پکارتے ہیں وہ ان کی درخواست کو اس سے زیادہ  
منظور نہیں کر سکتے جتنا کہ پانی اس شخص کی درخواست کو منظور کرتا ہے جو اپنے دونوں ہاتھ  
پانی کی طرف پھیلائے ہوتا ہے کہ وہ اس کے منہ تک آجائے اور وہ اس کے منہ تک آنے والا  
نہیں اور کافروں کی جتنی پکار یا درخواست ہے سب گمراہی ہے“

یعنی پکارنا اسی کو چاہیے، درد و مصیبت میں دعا اسی سے کرنی چاہیے جو ہر قسم کے نفع و  
ضرر کا مالک ہو، عاجز و فقیر کو پکارنے اور اس کے سامنے گڑ گڑانے سے کیا حاصل؟ حق تعالیٰ کے  
سوا کون ہے جس کے قبضہ میں اپنا یا دوسروں کا نفع و ضرر ہے۔ غیر اللہ کو اپنی مدد کے لیے بلانا ایسا  
ہے جیسے کوئی پیاسا کنوئیں کے منہ پر کھڑا ہو کر پانی کی طرف ہاتھ پھیلائے اور خوشامد کرے کہ میرے  
منہ میں پہنچ جا۔ ظاہر ہے کہ قیامت تک پانی اس کی فریاد کو پہنچنے والا نہیں، بلکہ اگر پانی اس  
کی مٹھی میں ہو تب بھی خود چل کر منہ تک نہیں جاسکتا۔

غور کرو کہ اس آیت میں ”دعوت“ یعنی دعا کی تخصیص حق تعالیٰ ہی کے ساتھ کی گئی ہے اس  
لیے کہ جار مجرور جو معمول ہے ”دعوت“ کا وہ اپنے عامل پر مقدم ہے اور تقدیم معمول کی مفید ضرورت ہے۔

لہ دیکھو تفسیر کبیر اور مقامات کے لیے ج ۱ ص ۲۲۳- نیز ج ۲ ص ۶۸- نیز ج ۸ ص ۲۳۲۔







غیر حق ہرچہ دلت را بر بود      ستریاہ توہماں خواہد بود  
غیر حق یک ذرہ کاں مقصود تست      تیغ لا برکش کہ آن معبود تست

مشرکین کے طریقے کے خلاف موحّد کا شیوہ یہ ہوتا ہے کہ وہ حق تعالیٰ ہی سے مانوس ہوتا ہے،  
سرخ و غم، درد و الم میں اسی کو پکارتا ہے، اسی سے اُمید و رجاء رکھتا ہے، اسی سے سکون و بردِ قلبی  
حاصل کرتا ہے۔

مرا بیگانگی از خلق با حق آشنا کردہ      بطبع من بکس کم ساختن بسیار می سازد!

مومن موحّد کی اسی شان کو حق تعالیٰ اس طرح ادا فرما رہے ہیں: وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ الَّذِينَ إِذَا  
أَصَابَتْهُمْ مُصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِلَىٰ إِلَهِهِ رَاجِعُونَ (پطع ۳) یعنی ”ایسے صابرین کو بشارت سنا  
دیجئے کہ ان پر جب کوئی مصیبت پڑتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم تو اللہ تعالیٰ ہی کی ملک میں اور ہم  
سب اللہ تعالیٰ ہی کے پاس جانے والے ہیں“ غور کرو یہاں ”مصیبت“ ام نکرہ ہے اور اذ ابھی عام  
ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہر مصیبت و آفت میں، ہر درد و الم میں، ہر سرخ و غم میں حق تعالیٰ ہی کو یاد  
کرتے ہیں، اسی کو پکارتے ہیں، اسی سے فریاد کرتے ہیں کہ ”اللهم انک الحمد والمیک المشتکی و بک  
المستغاث وانت المستعان ولا حول ولا قوۃ الا باللہ“ حق تعالیٰ آپ ہی کے لیے تمام تعریف  
سزاوار ہے آپ ہی کی طرف ہماری شکایت ہے اور آپ ہی سے فریاد ہے اور آپ ہی مددگار ہیں، ہمیں  
کوئی دوسرا نہ بچا سکتا ہے اور نہ سوائے آپ کے کسی میں حرکت ہے نہ قوۃ“

یارب ز تو یافت صورت آب گل من      الطاف تو شد پناہ جان دل من

آسانی کار از تو بد حاصل من      ہم از کریم تو حل شود مشکل من! (درد)

اسی آیت میں آگے صابرین کو جو بشارت دی گئی ہے اس کی تفصیل فرماتے ہیں: **لَوْلِيكَ**

**عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ** یعنی ”ان ہی لوگوں پر خاص خاص

رحمتیں ہیں ان کے پروردگار کی طرف سے اور عام رحمت بھی ہے اور یہی لوگ ہیں ہدایت یافتہ“ اسی

لے دعائے موسوی ہے۔ دیکھو مجمع الزوائد کتاب الادعیہ ص ۱۸۳ ج ۱۰ طبع مصر ۱۳۵۲ھ

سے تفریحاً لازم آتا ہے جو مصیبت و غم کے وقت غیر اللہ کو یاد کرتے ہیں، ان ہی سے فریاد کرتے ہیں اور ان ہی کو اپنا مددگار اور پناہ گاہ سمجھتے ہیں وہ نہ خاص رحمتوں کے لائق ہیں اور نہ عام رحمت کے مستحق اور نہ ہدایت کے قابل، یعنی درد و غم میں غیر اللہ کی طرف شکایت لے جانے والے، ان ہی کو اپنی جان و دل کی پناہ سمجھنے والے حق تعالیٰ کی نفیس کے لائق، غضب کے قابل اور ضلالت میں گرفتار ہیں! ذرا الفاظ کی نزاکت پر بھی غور کرو: **اُولَئِكَ** کے بعد ضمیر مفصل لائی گئی ہے اور ہم المہتدین فرمایا گیا ہے، علماء و بیان کا اتفاق ہے کہ ضمیر جہاں ابتدا و خبر میں آتی ہے ابتدا کو خبر میں منحصر کر دیتی ہے۔ اب اس سے یہ لازم آتا ہے کہ ہدایت سے وہی لوگ منحصر ہیں جو وقت غم و ہنگام مصیبت حق تعالیٰ ہی کو یاد کرتے ہیں اور ان ہی سے فریاد کرتے ہیں اور جب ہدایت کا انحصار ان ہی پر ہوا تو ضلالت یا گمراہی ان کے غیر میں منحصر ہوئی! **ذٰلِكَ هُوَ الْخَسِرَانِ الْمُبِينِ**۔

انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی زندگی پر غور کرو۔ جب ان پر مصائب کا نزول ہوتا (اور بھجوائے اشد للناس بلاء الانبیاء مصائب ان ہی پر زیادہ نازل ہوئی ہیں) تو ان کا رخ حق تعالیٰ ہی کی طرف پلٹا، ان کے ہاتھ حق تعالیٰ ہی کے سامنے پھیلتے، ان کا سر حق تعالیٰ ہی کے قدموں پر جھکتا تھا۔ دیکھو حضرت آدم علیہ السلام اپنی لعزیز سے واقف ہو کر انتہائی حزن و الم کی حالت میں حق تعالیٰ ہی کو پکارتے ہیں:-

رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ (پ ۹۶) ہمارا بڑا نقصان ہو جائیگا۔

یارب اگر از جہل خطا شد کارم جاں از کرمت شاد بود بسیارم  
 ز امید تو بس کہ دل بود بسیارم گویند کہ نیست از گنہ آزارم (ورد)

اور حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی سرکش قوم کے جو رو قسم سے عاجز اور تنگ آ کر حق تعالیٰ ہی سے فریاد کیا کہ **اِنِّیْ مَغْلُوْبٌ فَاَنْصُرْ** (پ ۸۷) میں در ماندہ ہوں میرے پروردگار آپ انتقام لیجیے۔

اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی تھکن، عجز و در ماندگی کی حالت میں حق تعالیٰ ہی کی طرف توجہ کی اور  
پکارا:

رَبِّ اِنِّیْ لِمَا اَنْزَلْتَ اِلَیَّ مِنْ خَيْرٍ فَفِیْئُوْا (پت ۶۴) اے میرے پروردگار جو نعمت بھی آپ مجھ کو بھیج دیں میں اس کا حاجتمند ہوں۔

غم ناکم وازدر تو با غم نہ روم جز شاد و امیدوار و خرم نہ روم  
از در گہم چو تو کیسے ہرگز نو امید کسے نہ رفت و من ہم نہ روم (سرد)  
اور حضرت ایوب علیہ السلام نے ہجوم غم و الم کے وقت حق تعالیٰ ہی کو اپنی پناہ گاہ سمجھا اور التجا کی۔  
اِنِّیْ مَسْنِیَ الضُّرِّ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرَّاحِمِیْنَ (پت ۶۴) مجھ کو یہ تکلیف پہنچ رہی ہے اور آپ سب مہربانوں سے زیادہ مہربان ہیں۔

یا رب کرم تو گر نباشد دم خون جگر از دیدہ رود تا ابدم!  
اور حضرت یونس علیہ السلام نے غم و اندوہ کی تاریکیوں میں حق تعالیٰ ہی کو پکارا کہ  
لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ (پت ۶۴) ہیں میں بیشک قصور وار ہوں !!  
آپ کے سوا کوئی معبود نہیں، آپ پاک

یا رب ز کرم بخش تقصیر مرا مقبول بکن ناله شہگیر مرا  
پیری و گناہ ماجراست عجیب لطف تو کند چارہ تدبیر مرا (سرد)

اور حضرت یونس علیہ السلام کے متعلق ارشاد ہے: فَلَوْلَا اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُسٰبِقِیْنَ لَلَبِثَ فِیْ بَطْنِهَا اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ (پت ۹۴) یعنی اگر وہ تسبیح کرنے والوں میں سے نہ ہوتے تو قیامت تک اسی (مچھلی) کے پیٹ میں رہتے۔ دیکھو لبث کو لام تاکید سے موکد فرمایا گیا ہے اور مناط نجات تسبیح الہی کو قرار دیا گیا ہے کہ کسی نبی، ولی کے نام کا ختم پڑھنے، ان کو پکارنے اور اپنا درد و غم ان کے سامنے رکھنے کو! قرآن کریم میں ایک جگہ (پت ۱۲) حق تعالیٰ ہیں جنتیوں کی حالت کی خبر دے رہے ہیں کہ جب وہ عالم شہادت، عالم برزخ اور عالم حشر کی ہزاروں مصیبتوں اور بلاؤں، آفتوں اور

مشکلوں کو اٹھا کر بالآخر جنت میں داخل ہونگے تو کہینگے: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي هَدٰنَا لِهٰذَا وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَا اَنْ هَدٰنَا اللّٰهُ۔ یعنی حق تعالیٰ ہماری ہدایت نہ کرتے تو اس مقامِ راحتِ ابدی تک ہماری رسائی کبھی نہ ہوتی! زندگی کے ہر قدم پر اور موت کے بعد ہر مرحلہ پر حق تعالیٰ ہی کا دستِ کرم ہماری تائید کرتا ہے اسی لیے نصیحت فرمائی: وَاعْتَصِمُوا بِاللّٰهِ هُوَ مَوْلَاكُمْ فَنِعْمَ الْمَوْلٰی وَ نِعْمَ النَّصِيْرُ (پ ۶، ۱۱) یعنی حق تعالیٰ ہی کو مضبوط پکڑے رہو وہی تمہارے کارساز ہیں کیسے اچھے کارساز ہیں اور کیسے اچھے مددگار! اب انہیں چھوڑ کر کسی اور کی طرف رخ کرنا بے شرمی نہیں تو کیا؟

اے آنکہ قبیلہ بتاں روست ترا  
بر مغز چرا حجاب شد پوست ترا  
دل در پے این دآن نیکوست ترا  
یک دل داری بس است یکدوست ترا (جانی)

قرآن کریم کی ان تمام تصریحات کے بعد ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کی طرف توجہ کرتے ہیں اور نہایت اختصار کے ساتھ چند دعاؤں کو پیش کر کے واضح کرتے ہیں کہ درد و رنج، غم و ہم، آفت و مصیبت کے وقت سوائے حق تعالیٰ کے کسی کو یاد نہ کرنا چاہیے، ان ہی کی طرف توجہ کرنی چاہیے اور ان ہی کا نام زبان پر آنا چاہیے، اس کے بعد اقتبالِ امر میں اسبابِ دنیویہ کا استعمال کیا جاسکتا ہے۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت تھی کہ جب بھی کسی قسم کی پریشانی لاحق ہوتی تو نماز پڑھتے، چنانچہ مروی ہے کہ اذ احزننا من فرغنا الى الصلوة (راہ احمد) اور ظاہر ہے کہ نماز میں سوائے تسبیح و تہلیل، تحمید و تقدیس کے اور کیا ہوتا ہے۔ ترمذی میں ہے کہ آپ کو جب کوئی سخت کام پیش آتا تو فرماتے: يَا حَتِّي يَا قِيَوْمَ بِرَحْمَتِكَ اسْتَغِيثُ اور دوسری حدیث میں ترمذی کی مذکور ہے کہ جب کسی امر کے متعلق فکر ہوتی تو آسمان کی طرف نظر کرتے اور کہتے: سبحان الله العظيم! جب دعائیں کوشش کرتے تو فرماتے: يَا حَتِّي يَا قِيَوْمَ۔ آپ نے فرمایا کہ غمگین کی دعا یہ ہے: اللّٰهُمَّ رَحْمَتَكَ اَرْجُو اَفْلا تَكْلِنِي اِلَى نَفْسِي طَرَفَةَ عَيْنٍ وَاَصْلِحْ لِي شَأْنِي كُلَّهُ اِلَّا اَنْتَ۔ عمیس کی صاحبزادی اسما در جو حضرت

صلی اللہ علیہ وسلم تیری رحمت ہی کا آسرا ہے، تو مجھے پل بھر کے لیے بھی میرے نفس کے حوالہ نہ کر اور میرے سکام درست کر دے

عائشہ صدیقہؓ کی بہن تھیں) کو فرمایا، کیا تجھے چند ایسی باتیں بتلا دوں جو غم کے وقت کہا کرے؟ کہہ اللہ  
 اللہ ربی لا اشرك به شيئاً (سات بار) آپ نے ایک انصاری کو جن کا نام ابو امامہؓ تھا۔ غیر وقت  
 نماز مسجد میں دیکھ کر پوچھا کہ اس وقت تم کیا کر رہے ہو؟ انہوں نے کہا کہ قرض کے بارے کے بچے دبا جا رہا  
 ہوں، متفکر اور پریشان ہوں۔ فرمایا صبح و شام اس دعا کو پڑھا کرو: اللّٰهُمَّ اِنِّى اَعُوذُ بِكَ مِنَ الْهَمِّ وَالْحَزَنِ  
 وَاَعُوذُ بِكَ مِنَ الْعَجْزِ وَالْكَسَلِ وَاَعُوذُ بِكَ مِنَ الْحَبْنِ وَالْبَخْلِ وَاَعُوذُ بِكَ مِنْ غَلْبَةِ الدِّينِ وَقَهْرِ  
 الرِّجَالِ۔ ایک مرتبہ فرمایا۔ من لزم الاستغفار جعل الله له من كل هم فرجاً ومن كل ضيق مخرجاً و  
 رزقه من حيث لا يحتسب۔ یعنی جو ہمیشہ استغفار پڑھا کرے تو اللہ اس کی ہر مصیبت کو دفع کر دیتا  
 ہے اور ہر تنگی سے اس کو نکال لیتا ہے اور ایسی جگہ سے رزق دیتا ہے جہاں سے گمان تک نہ ہو (رواہ  
 احمد و ابو داؤد و ابن ماجہ عن ابن عباس) ایک اور موقع پر فرمایا کہ جب کسی پر غم و مشکل ٹوٹ پڑے تو کہا  
 کرے لا حول ولا قوة الا بالله (کذا فی مشکوٰۃ)

دیکھو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ہے کہ ما اودى نبى ما اوديت یعنی جتنی اذیت مجھے  
 پہنچی اتنی کسی نبی کو نہیں پہنچی مگر کیا کسی اذیت یا تکلیف کے وقت آپ نے کسی نبی کو یاد کیا کہ یا آدم  
 ابونا، یا نوح نبینا، یا ابراہیم خلیل اللہ؟ یا ہر وقت اسی ذات پاک سے فریاد کی جو تمام مشکلات کو رفع  
 کرتی ہے جو فاسخ ہم ہے، کاشف غم ہے، جو مجیب دعوة المضطربین ہے۔ حضرت ابن عباسؓ کو آپ نے  
 تعلیم فرمائی تھی کہ: یا غلام احفظ الله يحفظك احفظ الله تجده تجاهك، و اذا سالت فاسئل  
 الله و اذا استعنت فاستعن بالله و اعلم ان الامم لو اجتمعت على ان ينفعوك بشئ لم  
 ينفعوك الا بشئ و كتب الله لك ولو اجتمعوا على ان يضروك بشئ لم يضروك الا بشئ و قد  
 كتب الله عليك رفعت الاقلام و جفت الصحف (اخرجہ الترمذی عن ابن عباس) یعنی  
 اے لڑکے اللہ کو یاد رکھو وہ تجھ کو یاد رکھیگا۔ اللہ کو یاد رکھو کہ تو اس کو اپنے سامنے پائیگا اور جب تو کچھ

اللہ ہمیشہ کے الفاظ ہیں۔ مصیبت زدہ یہ دعا پڑھے: اللّٰهُمَّ فَارِحِ الْهَمَّ، كَاشِفِ الْعَمْرَةَ، مُجِيبِ دَعْوَةِ  
 الْمُضْطَرِّينَ، رَحْمَنَ الدُّنْيَا وَرَحِيمَهَا، اَنْتَ تَرْحَمُنِي، فَارْحَمْنِي بِرَحْمَةِ تَغْنِينِي بِهَا عَنْ رَحْمَتِي مِنْ سِوَاكَ  
 (رواہ الحاکم و ابن مردويه عن ابی بکر صدیقؓ)



منگے تو اللہ ہی سے مانگ اور جب تو مدد چاہے تو اللہ ہی سے چاہ (ایاک نعبد وایاک نستعین)  
 اور یقین کر لے کہ اگر سب بندے مل کر کوشش کریں کہ تجھے اس چیز سے فائدہ پہنچائیں جو اللہ نے  
 تیرے لیے مقدر نہیں کی تو وہ ایسا کرنے کی قدرت نہ پائینگے مگر جتنا کہ اللہ نے تیرے لیے لکھ دیا،  
 اور اگر سب بندے مل کر تجھے کسی چیز سے ضرر پہنچانے کی کوشش کریں جو اللہ نے تیرے لیے مقدر  
 نہیں کی تو اس پر قدرت نہ پائینگے، قلم اٹھالیے گئے اور خشک ہو گئیں کتابیں، دیکھو اس حدیث  
 میں کس وضاحت و صراحت کے ساتھ استعانت عن غیر اللہ سے منع کیا گیا ہے اور کس طرح سمجھوں سے توڑ کر  
 صرف حق تعالیٰ ہی سے جوڑا گیا ہے! کفی باللہ وکیلا!

از خدا خواہم و ز غیر نخواہم بخدا کہ نیم بندہ دیگر نہ خدا کے درگست!  
 یہ کہہ کر کہ ساری دنیا تجھے فائدہ نہیں پہنچا سکتی (کیونکہ وہ ایک مکھی کی تخلیق پر بھی قادر نہیں)  
 احتیاج کی ساری نسبتوں کو جو غیر اللہ کے ساتھ قائم کی جاسکتی ہیں ایک ہی ضرب میں کاٹ دیا  
 گیا ہے اور پھر یہ سنا کر کہ ساری دنیا تجھے ضرر پہنچانے پر قادر نہیں (کیونکہ وہ مکھی سے بھی کوئی شے چھین  
 نہیں سکتی) غیر اللہ کے خوف کو سینے سے بالکل دور کر دیا گیا ہے اور اس طرح ہمیں خوف و حزن کی ان  
 زنجیروں سے بالکل آزاد کر دیا گیا ہے جو غیر اللہ ہمارے جہل و شرک کی وجہ سے ہماری گردن میں  
 ڈال سکتا تھا! اب میں توحید ہی کی بدولت آزادی و حرأت کے ساتھ باواز بلند کہہ سکتا ہوں:

لوالثقلان الانس و الجن اجمعوا یريدون ایلاما لا صغر منة  
 یكون لها رب السموات ناصرا لما ظفروا منها باء دنی مضرة  
 کیا یہ آزادی بے خوفی یا استقلال ان بشرک پسندت پرستوں یا گور پرستوں کو حاصل ہو سکتا  
 ہے جو ہر پیر اور شہید کو نافع و ضار سمجھ کر ان سے اپنے فقر و احتیاج کی نسبت کو جوڑتے ہیں، ان ہی کے  
 آگے سر نیاز خم کرتے ہیں اور ان ہی کے سامنے دست سوال پھیلاتے ہیں اور اپنے رسول کی

لے اگر جن و انس دونوں جمع ہو کر چھوٹی سی چھوٹی چوٹی کو دکھ پہنچانا چاہیں اور حق تعالیٰ اس کے ناصر مددگار ہوں  
 تو وہ اس کو ادنیٰ مضرت بھی نہیں پہنچا سکتے۔

اس نصیحت کو بھول جاتے ہیں کہ

یسأل احدکم رب حاجتہ کلھا حتی ہر کسی کو چاہیے کہ اپنی ساری حاجتیں اپنے پروردگار

یسأل الملئحہ حتی یسألہ شمع ہی سے مانگے یہاں تک کہ تک بھی اسی سے مانگے

نعلہ اذا انقطع (ازہم الترمذی عن النبی) اور جوتی کا تسمہ بھی اگر ٹوٹ جائے!

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ (جنہیں افسوس ہے کہ قادریہ کی ایک بڑی تعداد نے اپنا معبود مقرر کر رکھا ہے) مصائب میں ان ہی کو پکارتی ہے، آفات کے دور کرنے کے لیے ان ہی کے نام کا جھنڈا اپنے گھروں میں کھڑا کرتی ہے) حدیث ابن عباسؓ کو جو اوپر مذکور ہوئی اپنی فتوح الغیب میں نقل فرماتے ہیں اور اس کے بعد نصیحت کرتے ہیں کہ: فینبغی لكل مؤمن ان يجعل هذا الحدیث مرآة لقلبہ و شعارہ و دثارہ و حدیثہ فیعمل بہ فی جمیع حرکاتہ و سکناتہ حتی یسلم فی الدنیا و الاخرۃ و یجد العزۃ فیہما برحمتہ اللہ تعالیٰ۔ یعنی ہر مومن کو چاہیے کہ اس حدیث نبوی کو اپنے قلب کے لیے آئینہ بنالے تاکہ اس کے مضمون میں اپنے دل کا حال دیکھے اور اس کی خوبی و زشتی راستی و سچی کو معلوم کرے، بلکہ اس حدیث کو اپنے اندر اور باہر کا جامہ بنالے اور ہر وقت کے لیے اس کو ایک سخن و حکایت کھڑائے کہ اپنے دل سے اس کی تکرار کرتا ہے اور اپنے تمام حرکات و سکناات میں اس پر عمل کرے تاکہ دنیا و آخرت میں تمام آفات نفسی و آفاقی سے محفوظ رہے اور اللہ کی رحمت سے دونوں جہان میں عزت پائے۔

شیخ جیلانی توحید کے آفتاب تھے، آپ کی کتاب مستطاب "فتوح الغیب" کی ہر سط سے توحید کی تعلیم مترشح ہوتی ہے اور سلسلہ عالیہ قادریہ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کے الفاظ میں "اتباع کتاب و سنت و اجتناب از وقوع در جمادی بدعت" کے سوا کچھ نہیں! اسی لیے محدث دہلویؒ آگے چل کر فرماتے ہیں: "پیرا فرمود کہ در سلاسل دیگر از چیزاے دیگر پرسند اما دریں سلسلہ از مشرعیّت زنتار کہ تا مشرعیّت مطہرہ شکایت نہ کند از تو!"

۱۔ فتوح الغیب مترجمہ شاہ عبدالحق دہلویؒ ص ۲۵۰۔

اشراک فی العلم | مشرکین کی "عبادت" کے پہلے جزو سے ہم نے صفحات بالا میں تفصیل سے بحث کی کہ یہ غیر اللہ کو مقرب و شفیع، نافع و ضار جان کر ان سے اپنی حاجت کے وقت زیادہ سی چاہتے تھے، یعنی ان کو پکارتے یا استغاثہ کرتے تھے، یہی ان کا شرک تھا "اشراک فی التصرف" تھا، اگر ان ہی افعال کا ارتکاب کسی کلمہ گو سے ہو تو اس پر بھی شرک کا اطلاق کیا جائیگا اور اس کی کلمہ گوئی اطلاق شرک سے مانع نہ ہوگی۔ دیکھو اس "اشراک فی التصرف" میں "اشراک فی العلم" بھی لازماً شامل ہوتا ہے۔ درد و مصیبت کے وقت غیر اللہ کو پکارنے والا نہ صرف سمجھتا ہے کہ وہ اس درد و غم کو دور کرنے کی قدرت رکھتے ہیں بلکہ اس کا قطعی یہ بھی یقین ہوتا ہے کہ وہ اس کے استغاثہ اور پکار کو ہر وقت اور ہر جگہ سے سن بھی سکتے ہیں اور ظاہر ہے کہ بغیر سنے اور بغیر مطلع ہونے وہ اس کی مدد کر کیسے سکتے ہیں؟ اس طرح وہ غیر اللہ کے لیے علم غیب بھی ثابت کرتا ہے، حالانکہ علم غیب خصائص الہیہ سے ہے اور غیر اللہ سے قطعاً مسلوب! یہی اس کا "اشراک فی العلم" ہے! اور اس سے زیادہ ضلالت اور گمراہی اور کیا ہو سکتی ہے! وَمَنْ أَضَلُّ مِمَّن يَدْعُوا مِنْ دُونِ اللَّهِ مَنْ لَا يَسْتَجِيبُ لَهُ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ وَهُمْ عَنْ دُعَائِهِمْ غَافِلُونَ (پطع ۱۷) "اس شخص سے زیادہ کون گمراہ ہوگا جو خدا کو چھوڑ کر ایسے معبود کو پکارے جو قیامت تک بھی اس کا کہنا نہ کرے اور ان کو ان کے پکارنے کی بھی خبر نہ ہو"

یہ امر کہ علم غیب خاصہ حق سبحانہ تعالیٰ ہے، اس کے سوا کسی کو نہیں، قرآن میں نہایت صراحت و وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اس میں کسی قسم کا اشتباہ نہیں پہلے چند اجالی آیات پر غور کرو۔

وَاللَّهُ غَيْبُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَ أَسْمَانُونَ اور زمینوں میں جتنی غیب کی باتیں ہیں ان کا  
الْبَيْتِ يُرْجَعُ الْأُمُورُ كُلُّهَا (پطع ۱۷) علم خدا ہی کو ہے اور سب امور اسی کی طرف رجوع ہونگے۔

۱۔ مختصر لفظوں میں غیب کی حقیقت سمجھ لو۔ قاضی بیضاوی کہتے ہیں کہ غیب وہ امر ہے جس پر نہ عقلی دلیل قائم ہو سکتی ہے نہ وہ بدیہی ہو نہ حواس کی رسائی اس تک ہو۔ (تفسیر انوار التنزیل)

اسی مفہوم کو نفیاً اس طرح بیان کیا گیا ہے :-

قُلْ لَا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ الْغَيْبَ إِلَّا اللَّهُ وَمَا يَشْعُرُونَ أَيَّانَ يُبْعَثُونَ (پ ۱۷)

آپ کہہ دیجیے کہ جتنی مخلوقات آسمانوں اور زمین میں ہیں جو ہر کوئی بھی غیب کی بات نہیں جانتا بجز اللہ تعالیٰ کے اور ان کو یہ خبر نہیں کہ کب دوبارہ زندہ کیے جائیں گے۔

(۲) لَدَغَيْبِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالْبَصِيرِ وَأَسْمِعْ (پ ۱۷)

تمام آسمانوں اور زمین کا علم غیب اسی کو ہے وہ کیسا کچھ دیکھنے والا اور کیسا کچھ سُننے والا ہے۔

(۳) فَقُلْ إِنَّمَا الْغَيْبُ لِلَّهِ (پ ۱۷)

آپ فرمادیجیے کہ غیب کی خبر صرف خدا کو ہے۔

مندرجہ ذیل آیات میں غیر اللہ سے علم غیب کی مطلق نفی کی جا رہی ہے۔

(۴) وَعِنْدَهُ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَا إِلَّا هُوَ (پ ۱۷)

اور اللہ ہی کے پاس کنجیاں ہیں تمام مخفی اشیاء کی، نہیں جانتا ہر انہیں لیکن وہی۔

خود آنحضرت صلعم نے غیب کی کنجیوں کی تفسیر ان پانچ چیزوں سے فرمائی جن کا ذکر صراحت سے سورہ لقمان میں آیا ہے :-

إِنَّ اللَّهَ عِنْدَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ وَيُنزِلُ الْغَيْثَ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْأَرْحَامِ وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ قَدْ آتَتْكَ سُبُغَاتٌ وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ بِأَيِّ أَرْضٍ تَمُوتُ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ (پ ۱۷)

بیشک اللہ ہی کو قیامت کی خبر ہے اور وہی مینہ برساتا ہے اور وہی جانتا ہے جو کچھ رحم میں ہے، اور کوئی شخص نہیں جانتا کہ وہ کل کیا عمل کرے گا اور کوئی شخص نہیں جانتا کہ وہ کس زمین میں مرے گا۔ بیشک اللہ سب باتوں کا جاننے والا باخبر ہے۔

جتنے حوادث کوئیہ اور وقائع غیبیہ ہیں سب ان پانچ میں داخل ہیں (۱) حوادث سماویہ کو انزل غیث میں شامل کیا جا سکتا ہے جس کا تعلق آسمان سے ہے (۲) حوادث ارضی "علم ما فی الارحام" میں داخل ہیں اور (۳) حوادث حیات کا تعلق لازماً "ما اذا تکسب غذا سے ہوگا اور (۴) حوادث موت و ما بعد موت ظاہر ہے کہ "ما تدری نفس بائی ارض تموت" میں شامل ہیں۔ جب ان تمام حوادث

وامورِ غیبیہ کا علم صرف حق تعالیٰ ہی کے لیے مخصوص ہے اور کسی فرد بشر کو عطا نہیں کیا گیا تو ظاہر ہے کہ کسی حادثہ غیب کا علم انسان کو نہیں ہو سکتا اور جب (۵) علم قیامت (یعنی اس کے خاص وقت وقوع کا علم) کسی نبی کو نہیں حالانکہ سب اس کی خبر دینے میں متفق ہیں۔ تو اور حوادثِ آتیہ کا علم بدرجہ اولیٰ ان کو نہ ہوگا۔ غرض جب ان پانچ کا علم کسی کو نہ ہو تو اوپر چڑھ کر کا علم بدرجہ اولیٰ نہ ہوا، اسی لیے ان کو "مفاح غیب" کہا گیا ہے، گویا جملہ امورِ غیبیہ ان کے اندر ہیں اور یہ تمام خزائنِ غیب کی کنجیاں ہیں اور جب خزانہ کی کنجی ہی کسی کو نہ ملے تو اس میں سے ایک جیب بھی نہیں مل سکتا۔

اور میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے تمام خزانے ہیں اور نہ میں تمام غیب کی باتیں جانتا ہوں اور نہ یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں۔

(۵) وَلَا أَقُولُ لَكُمْ عِندِي خَزَائِنُ اللَّهِ وَلَا أَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَا أَقُولُ إِنِّي فَلَكُ (پ ۳۶)

آپ کہہ دیجئے کہ میں خود اپنی ذات خاص کے لیے کسی نفع کا اختیار نہیں رکھتا اور نہ کسی ضرر کا مگر اتنا ہی جتنا کہ خدا تعالیٰ نے چاہا ہو اور اگر میں غیب کی باتیں جانتا ہوتا تو میں بہت سے منافع حاصل کر لیا کرتا اور کوئی مضرت ہی مجھ پر واقع نہ ہوتی، میں تو محض بشارت دینے والا اور ڈرانے والا ہوں ان لوگوں کو جو ایمان رکھتے ہیں۔

(۶) قُلْ لَا أَفْلِكُ لِنَفْسِي نَفْعًا وَلَا ضَرًّا إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ وَلَوْ كُنْتُ أَعْلَمُ الْغَيْبَ لَا سْتَكْبَرْتُمْ مِنَ الْخَيْرِ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوءُ إِنْ أَنَا إِلَّا نَذِيرٌ وَبَشِيرٌ لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ (پ ۲۳)

یعنی میں ایک بندہ ناتواں ہوں اپنے لیے جلبِ نفع و دفعِ ضرر کی قوت نہیں رکھتا مگر جو میرا مالک چاہے نفع و دفع سے، پھر اس بیان کو اس طرح موکد کیا جا رہا ہے کہ اگر میں غیب کو جانتا تو جو بات بھلائی اور نفع کی ہوتی اس کو اپنے لیے حاصل کرتا۔ اور جو بات بُری اور نقصان کی ہوتی اس سے دور رہتا تا کہ وہ بُرائی مجھے نہ لگے، لیکن میں تو ایک بندہ عاجز ہوں، میں کیا جانوں کہ میرے رب میرے مالک کے علم میں میرے لیے اچھا کیا ہو اور بُرا کیا، میرے حق میں اس کا حکم کیا ہو اور کوئی



چیز میرے لیے مقدر کر رکھی ہے، جب مجھے اتنا بھی معلوم نہیں تو پھر کسی اور بات کا معلوم ہونا کیسا ایسا بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بطور تواضع و ادب نہیں فرما رہے ہیں بلکہ بطریق اعتقادِ قلبی پیش فرما رہے ہیں کیونکہ علمِ غیب حق تعالیٰ ہی کی خصوصیتِ خاصہ ہے **عَالِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلَىٰ غَيْبِهِ أَحَدًا** (پہلے ۱۲۷) سے صاف طور پر اس کی وضاحت ہو رہی ہے اور اوپر جو آیات پیش کی گئیں وہ اس کی تائید کر رہی ہیں، ہر قسم کے اشتباہ و مغالطہ کو رفع کر رہی ہیں۔

اب سب سے معجزات تو جیسے ملا علی قاری نے شرح فقہ اکبر میں تصریح کر دی ہے وہ مخصوص ہیں اس قضیہ عمومی سے **الْأَمِنَ اَرْضِي مِنَ رَسُولٍ** (پہلے ۱۲۷) یعنی جب حق تعالیٰ چاہتے ہیں کسی نبی یا رسول کو بذریعہ وحی کسی غیب پر مطلع کر دیتے ہیں۔ انبیاء سے علمِ غیب کی نفی عقائدِ اسلام میں داخل ہے اور اؤ کا فہ اہل اسلام کا اس پر اتفاق ہے۔ یہ عقائد خود انبیاء علیہم السلام کے تعلیم کردہ ہیں۔ لہذا انبیاء سے علمِ غیب کی نفی کرنے میں ان کی کسی طرح تحقیر نہیں ہوتی، ایسا سمجھنے والا مجنوں ہے، کتابِ سنت سے جاہل! دیکھو سورہ نمل میں حق تعالیٰ ہدہ کا قول نقل فرما رہے ہیں **اِحْطٰتْ بِمَا لَدَتْ تُحِطُّ بِهٖ** یعنی ہدہ حضرت سلیمان علیہ السلام سے مخاطب ہو کر کہہ رہا ہے کہ ”میں ایسی بات معلوم کر کے آیا ہوں جو آپ کو معلوم نہیں ہوئی“ اس آیت کو سن کر کوئی ہدہ کا بچہ بھی ایسی بیوقوفی نہ کرے گا کہ انبیاء و اولیاء کو علمِ غیب سے متصف سمجھ کر دور دور سے استعانت کے لیے پکارے اور سمجھے کہ وہ اس کے پکارنے کو سن لیتے ہیں، آدمی کے بچے کا تو کیا ذکر ہے!

اب ذرا چند ان حدیثوں کو بھی سن لو جن سے غیر اللہ سے علمِ غیب کی کلی نفی ہوتی ہے اور حق تعالیٰ ہی سے یہ منحصر کیا جاتا ہے۔

(۱) واللہ لا ادری واللہ لا ادری وانا یسی باوجودیکہ میں خدا کا نبی ہوں پھر نہیں جانتا کہ میرے ساتھ

رسول اللہ ما یفعل بی ولا یکرہ کیا معاملہ پیش آئے اور تمہارے ساتھ کیا معاملہ پیش آئے۔

(۲) عن عائشۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہا قالت من حضرت عائشہ صدیقہ فرماتی ہیں کہ جو تجھ سے یہ کہے کہ

اشہوک ان ھم راصلی اللہ علیہ وسلم یعلم آنحضرتؐ وہ پانچ باتیں جانتے تھے جن کا اللہ نے

انحس التي قال الله تعالى ان الله عنده  
علم الساعة فقد اعظم الفريضة  
طوفان باندھا۔

رس) عن الربيع بنت معوذ بن عفراء قالت  
جاء النبي صلى الله عليه وسلم فدخل  
مکان میں تشریف لائے جب میری شادی ہو رہی تھی  
حين بنى على فجلس على فراشي بجلساك  
پھر میرے پاس مسند پر بیٹھ گئے۔ ہماری کچھ لڑکیاں  
منى فجعلت جویريات لنا يضرن بالذ  
گانے لگیں دف بجا کر اور ہمارے ان بزرگوں کا ذکر  
وبين من قتل من ابائى يوم بدر  
کرنے لگیں جو بدر میں مارے گئے تھے۔ ان میں سے  
اذ قالت احدهن وفينا نبى يعلم ما  
ایک کہنے لگی کہ ہم میں ایک ایسا نبی ہے جو جانتا ہے کہ  
فى غد فقال دعى هذه وقولى بالذ  
کل کیا ہوگا۔ آپ نے فرمایا کہ ایسا مت کہہ بلکہ جو  
كنت تقولين  
پہلے کہہ رہی تھی وہی کہے جا

ان تینوں احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ کائنات بزرگترین اور کامل ترین ہستی اپنی ذات مقدس سے علم  
غیب کی نفی فرما رہی ہے، پھر آپ کی امت سے کسی کی یہ مجال کیسے ہو سکتی ہے کہ وہ علم غیب کو اپنی جانب نسبت  
کرے۔ امور غیبیہ کا علم بذاتہ کسی انسان کو حاصل نہیں وہ مخصوص ہر حق تعالیٰ ہی کی ذات کے لیے انما الغیب  
للہ، کوئی شخص خواہ وہ نبی ہو یا ولی یہ بھی نہیں جان سکتا کہ خود وہ کل کیا کر گیا: وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ مَّا ذَاتُكَ سِوَا  
حدیث اول کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ یہ مناقض ہے آیت کریمہ لِيَغْفِرَ لَكَ اللَّهُ مَا تَقَدَّمَ  
مِنْ ذُنُوبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ کے اور نیز منافی اس آیت کے وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضَى۔ اس لیے یہ  
حدیث منسوخ ہے اور اگر اس کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو آپ کا ایسا فرمانا محض خوف و خشیت الہی  
کے لحاظ سے تھا نہ کہ واقعہ کے لحاظ سے۔

طیبی نے اس حدیث کی تشریح میں بتلایا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد  
اس قول سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ اپنی ذات سے علم غیب کی نفی فرمانا چاہتے ہیں اور صاف  
طور پر ظاہر فرمانا چاہتے ہیں کہ آپ ہرگز غیب پر مطلع نہیں، نہ اپنی تقدیر سے واقف ہیں نہ کسی

اور کی تقدیر سے، نہ اپنے پوشیدہ کاموں سے واقف ہیں نہ غیر کے۔ آپ کا مطلب یہ نہیں کہ آپ اپنی نجات کا بھی یقین نہیں رکھتے اس لیے کہ یہ امر تو بہت ساری دوسری حدیثوں سے ثابت ہو چکا ہے اور آیات قرآنیہ بھی اس پر دلالت کرتی ہیں۔ لہذا اس حدیث کو کسی آیت کا معارض قرار دینا کسی طرح درست نہیں۔ رہا احتمال نسخ وہ بھی دو وجوہ سے درست نہیں: (۱) نسخ کا حکم اس وقت تک نہیں لگایا جاسکتا جب تک کہ تاخر نسخ کا معلوم نہ ہو اور ظاہر ہے کہ یہاں تقدم حدیث کا اور تاخر آیت کا معلوم نہیں (۲) نسخ "احکام" میں جاری ہوتا ہے "اخبار" میں جاری نہیں ہوتا، اخبار میں نسخ کا حکم لگانا گویا شارع پر کذب کی تہمت لگانی ہے۔

دوسری حدیث تو آیت قرآنی ہی کی ترجمان ہے اس کا انکار قرآن میں انکار ہے۔ یہاں حجت یہ تراشی جاتی ہے کہ علم غیب کے اقسام میں امتیاز کیا جانا چاہیے۔ ایک علم غیب مطلق ہے دوسرے علم غیب اضافی غیب مطلق یا غیب حقیقی کا تو علم حق تعالیٰ ہی کو ہوتا ہے لیکن غیب اضافی کے علم کی نسبت انبیاء و اولیاء کی طرف کی جاسکتی ہے۔

دیکھو غیب اضافی کے معنی تو یہی ہوئے کہ بعض پر ظاہر ہوتا ہے اور بعض پر پوشیدہ رہتا ہے۔ مثال کے طور پر لذت جماع کو لو یہ رجولیت والے پر غیب نہیں، نامرد یا عینین کے لیے غیب ہے۔ یارنگوں پر غور کرو، یہ مادر زاد اندھے کے لیے غیب ہیں لیکن آنکھوں والے کے لیے غیب نہیں، یہی حال آوازوں کا ہے، سننے والے کے لیے یہ غیب نہیں، مادر زاد بہرے کے لیے ضرور غیب ہے۔ اسی طرح حیدرآباد کا حال حیدرآباد والوں پر غیب نہیں، بریلی والوں کے لیے غیب ہے۔ تو ظاہر ہے کہ غیب اضافی کے جاننے میں کچھ اولیاء و انبیاء کی تخصیص نہیں۔ لذت جماع جو عینین کے لیے غیب ہے اس کو بہر مرد خواہ وہ کافر ہو یا مومن جانتا ہے، اسی طرح آوازوں کو بہر کان والا خواہ وہ نیک ہو یا بد جانتا ہے اور یہ مادر زاد بہرے کے لیے غیب ہیں۔ انبیاء و اولیاء کو جو قائلے یا حوادث حق تعالیٰ بذریعہ وحی والہام بتلا دیتے ہیں وہ ضرور ان کو معلوم ہو جاتے ہیں لیکن حق تعالیٰ کے بغیر خبر

دینے کے یہ ہرگز معلوم نہیں ہو سکتے اور حق تعالیٰ نے اس بات کی خبر نہیں دی کہ زمین و آسمان میں جتنے حوادث و واقعات ظہور پذیر ہوتے رہتے ہیں، ان کی اطلاع کسی نبی یا ولی کو اس نے دے رکھی ہے۔ لہذا ان کے علم کا دعویٰ کسی نبی یا ولی کے لیے کرنا محض بے دلیل ہے اور آیات قرآنیہ کا صریح انکار۔ اور اس امر کا بھی انکار ہمیں کیا جاسکتا کہ اخبار بالوحی میں غلطی کا کوئی احتمال نہیں ہوتا، شیطان کے تصرف سے یہ قطعاً محفوظ ہے، لیکن الہام میں عصمت شرط نہیں، الہام کبھی شیطانی ہوتا ہے اور کبھی رحمانی۔ اس لیے اولیاء کرام الہام پر اس وقت تک اعتماد نہیں کرتے جب تک کہ وہ کتاب و سنت کے مطابق نہ ہو۔

تیسری حدیث کی تاویل میں مرضیاتی ذہنیت کا استعمال کیا جاتا ہے۔ پہلے تو یہ کہا جاتا ہے کہ قرآن مجید میں جمیع علوم موجود ہیں اور ان سب کا علم رسول کو ہونا ضروری ہے ورنہ جہل لازم آئیگا اور جہل منافی شان رسول ہے! یہاں ایک کھلا مغالطہ ہے۔ قرآن میں جمیع علوم کے موجود ہونے سے مراد جمیع علوم دینیہ کے سوا کچھ نہیں، ان علوم کا تعلق سعادت انسانی سے ہوتا ہے جس کے حصول کا انسان مکلف ہے۔ قرآن کریم میں نہ ملائکہ کی جملہ تعداد موجود ہے نہ ذرات زمین کے اعداد اور نہ نجوم کی گنتی۔ نہ انجینئرنگ کی تفصیلات اور نہ حیوانات، مصریات کی کلی توضیحات! نہ ان چیزوں کا کتاب الہی میں ہونا ضروری ہے اور نہ ہم ان کی تحصیل پر مامور ہیں اور نہ رسول پر ان کی تبلیغ ضروری اور نہ ان سے جہل منافی شان رسول! خود حق تعالیٰ نے اس امر کی توضیح کر دی ہے کہ بہت سی باتوں کا ہم نے قرآن میں ذکر نہیں کیا۔ مثلاً، **وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّن قَبْلِكَ مِنْهُمْ مَن قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَن لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ** (پہ ۱۳۶) یعنی بہت سے رسولوں کا ذکر ہم نے کیا ہے اور بہتوں کا ذکر نہیں کیا!

بعض دفعہ یہ کہا جاتا ہے کہ رسول اللہ صلعم کا یہ کہنا کہ دعویٰ ہذا و قولی بالذی کنت

ہم نے آپ سے پہلے بہت سے پیغمبر بھیجے تھے جن میں بعض تو وہ ہیں کہ ان کا قصہ ہم نے آپ سے بیان کیا ہے اور بعض وہ ہیں جن کا ہم نے آپ سے بیان نہیں کیا۔

تقولین محض اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ آپ کو ان لڑکیوں کی باتوں کے سُننے کا اشتیاق تھا جو وہ شہداء بدر کے متعلق کہہ رہی تھیں، علم غیب کا انکار کرنا مقصود نہ تھا۔

اس توجیہ میں بالکل اسی قسم کی ہوشیاری و ذہانت سے کام لیا گیا ہے جو ہمیں اس اہم حق میں ملتی ہے جس کی شانگ میں تیر لگا تھا اور خون بہہ رہا تھا وہ اور اس کی عورت دونوں خون پونچھ رہے تھے اور اہم عقل کا دشمن برابر کئے جا رہا تھا کہ خدا کرے تیر نہ لگا ہو! حضور انور صلعم تو ان لڑکیوں کی اتنی بات سن کر کہ ہم میں ایک نبی ایسا ہے جو کل کی بات جانتا ہے فرماتے ہیں کہ یہ بات چھوڑ دو اور اپنا پہلا قصہ جاری رکھو۔ اور اس کی تاویل یوں کی جا رہی ہے کہ علم غیب کا انکار مقصود نہیں! "کل کی بات جاننے کی" نفی تو قضیہ کلیہ کے طور پر خود قرآن مبین میں حق تعالیٰ فرما رہے ہیں: **وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ قَاذًا تَكْسِبُ غَدًا** یعنی کوئی شخص نہیں جانتا کہ وہ کل کیا کریگا! اب اس صریح تردید کے بعد تاویل کا کونسا دروازہ کھلا رہتا ہے؟ ہشدار کہ رہ خود بخود گم نہ کنی!

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ان اقوال کی تصدیق ان احوال و واقعات سے بھی کر لو جو آپ کی زندگی میں رونما ہوئے۔ ان میں سے صرف تین کا ذکر یہاں کافی ہوگا۔

(۱) **واقعة افك**: آپ کی محبوبہ عاتکہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا پر لوگوں نے ہمت لگائی آپ کو سخت صدمہ ہوا۔ آپ نے اس کی تحقیق و تفتیش فرمائی، اکابر صحابہ سے مشورے کیے، لیکن حقیقت کا انکشاف نہیں ہوا، آپ کے غم و حزن میں اضافہ ہوا اور تیس دن اسی حال میں گزر گئے، بالآخر حق تعالیٰ ہی نے بذریعہ وحی آپ کو بتلایا کہ عاتکہ صدیقہ اس ہمت سے پاک ہیں۔

(۲) **واقعة بیومعونہ**: اس واقعہ کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک شخص نے حضور انور صلعم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ میں آپ سے التجا کرتا ہوں کہ آپ چند لوگ میرے ساتھ کر دیں جو میری قوم کو دین کی تبلیغ کریں اگر وہ حلقہ بگوش اسلام ہو جائیں تو میں بھی مسلمان ہو جاؤنگا۔ آپ نے اس کی بات کو صحیح جان کر ستر صحابہ جلیل القدر اس کے ہمراہ کر دیے۔ راستہ ہی میں اس غدار کی بیوفا قوم نے ان بزرگوں کو شہید کر دیا! جب حضور اکرم کو اس کی اطلاع ہوئی تو آپ کو ہنایت رنج



ہوا، اور ایک مہینے تک قائلین کے حق میں صبح کی نماز میں آپ نے بددعا فرمائی!  
 (۳) سورۃ تخریج کی شان نزول۔ حضور انور کو شہد نہایت مرغوب تھا، آپ حضرت  
 زینبؓ کے ہاں تشریف لیا کر شہد نوش فرماتے تھے حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ نے  
 آپس میں مشورہ کیا کہ کوئی ایسی ترکیب نکالنی چاہیے کہ آپ کا حضرت زینبؓ کے ہاں زیادہ ٹھہرنا  
 کم ہو جائے، سو حج پجار کے بعد بات یہ ٹھہری کہ ہم میں سے جس کے پاس پہلے آپ کی تشریف آوری  
 ہو وہ آپ سے کہے کہ آپ کے منہ سے تو مغایر کی بو آتی ہے۔ آپ کے قلب مبارک میں یہ شبہ پیدا  
 کیا جائے کہ جو شہد آپ نوش فرماتے ہیں شاید ان کھبوں کا ہو جو مغایر پر بیٹھی ہوں۔ چونکہ بد کو سے  
 آپ کو نفرت ہے اس لیے شہد پینا ترک فرمادینگے اور اس طرح حضرت زینبؓ کے پاس کی نشست  
 کم ہو جائیگی۔ ان بیویوں کی یہ بات چل گئی اور حضور انورؐ نے قسم کھالی کہ اب شہد کبھی نہ پیونگا!

جس بات کی قرآن مبین نے صاف صریح الفاظ میں وضاحت کی، جس بات کو رسول اکرم صلعم  
 نے خوب کھول کر بیان کیا، جس بات کی تائید آپ کی زندگی کے مختلف و متعدد واقعات سے ہوتی  
 ہے وہ صرف اتنی ہے کہ حق تعالیٰ ہی عالم غیب ہیں ان کے سوا مخلوقات میں کوئی ہستی عالم غیب  
 نہیں، ان ہی کے علم عطا فرمانے پر انبیاء و اولیاء کو غیب کے بعض واقعات کا علم ہوتا ہے، یہ ان کی  
 اختیاری چیز نہیں کہ جب چاہا معلوم کر لیا، یہ حق تعالیٰ ہی کا اختیار ہے کہ جب چاہا اور جتنا  
 چاہا کسی نبی و رسول کو بذریعہ وحی غیب پر مطلع کر دیا! اسی بات کو حضرت سعدیؒ نے اپنے مشہور

اشعار میں حضرت یعقوب علیہ السلام کے الفاظ میں اس طرح ادا کر دیا ہے۔

یکے پر سید زان گم کردہ فرزند	کہے روشن گہر پر خرد مند!
زمصرش بوئے پیرا ہن شمدی	چرا در چاہ کنگانش ندیدی!
بگفتا حال من برق جہاں است	دے پیدا و دیگر دم نہاں است!
گے بر طارم اعلیٰ نشینم	گے بر شیت پلے خود نہ بینم!
اگر درویش بر حالے باندے	دو دست از ہر دو عالم بر فاندے

لے یہ نینوں واقعات صحاح ستہ کی ہر کتاب میں موجود ہیں۔

اشراک فی التصرف اور اشراک فی العلم کو اچھی طرح سمجھ جانے کے بعد اب یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ نذ او صد اکی مندرجہ ذیل تمام صورتیں قطعاً ناجائز اور حرام قرار پاتی ہیں کیونکہ یہ کفر و شرک تک پہنچا دیتی ہیں۔

(۱) درد و مصیبت کے وقت اولیاء اللہ کو اس عقیدہ سے بچانا کہ یہ ہر جگہ سے ہماری ندائے درد کو سن لیتے ہیں اور ہماری اعانت کر سکتے ہیں، یہ قطعاً اشراک فی العلم و اشراک فی التصرف ہے۔ تمام فقہانے اس کی تکفیر کی ہے۔ قرآن کریم اور احادیث نبوی سے اس کا تفصیلی ثبوت اوپر دیا جا چکا ہے۔

(۲) اولیاء اللہ کی قبروں پر جا کر ان کو پکارنا۔ اس کی دو صورتیں ہیں: (ا) قبر کے نزدیک جا کر ان سے یہ کہنا کہ ”آپ میری فریاد کو سنیے، میری بلا کو ٹال دیجیے، میری حاجت کو رو کیجیے“ یہ استغاثہ و استعانت دعا اور طلب حاجت ہے خواہ قریب سے کی جائے یا دور سے اور یہ سراسر شرک اور کفر ہے۔ دعا کی تفصیل میں اوپر اس کا ثبوت دیا جا چکا ہے۔ (ب) قبر کے نزدیک جا کر ان سے یہ کہنا کہ آپ میرے لیے دعا کیجیے کہ اللہ میری بلا کو ٹال دے اور میری حاجت کو رو کرے“ یہ قطعاً بدعت ہے، قرون مشہود لہما بانحیر میں کسی نے ایسا نہیں کیا۔

امام ابو حنیفہ نے ایک شخص کو دیکھا کہ صاحبین کی قبروں پر آ کر کہہ رہا ہے کہ ”ہل لکم من خبر و ہل عندکم من اثرانی ایتکم و نادیتکم من شہور و لیس سوالی منکم الا الدعاء، فہل دریتم او غفلتم“ اے اہل قبور کچھ تم کو خبر بھی ہے اور کیا تم پر کچھ اثر بھی ہوتا ہے کہ کئی ماہ سے میں تمہارے پاس آتا ہوں اور تم کو پکارتا ہوں؟ میرا سوال تم سے صرف اتنا ہے کہ تم میرے لیے دعا کرو، کیا تم کو میرے حال کی خبر بھی ہے یا تم غافل ہو میرے حال سے؟ یہ سن کر امام اعظم نے اس شخص سے پوچھا ”ہل اجابوا لک؟“ کیا انہوں نے تجھ کو کوئی جواب دیا۔ اس نے کہا ”نہیں“ آپ نے عتاب آمیز لہجہ میں فرمایا ”سحقاً لک و تربت یدک! کیف تکلم اجساداً لا یستطیعون جواباً ولا یملکون شیئاً ولا یسمعون صوتاً“ یعنی ”پھٹکار ہو تجھ پر! خاک آلود ہوں تیرے دونوں ہاتھ! ایسے جسم کیسے بات کر سکتے ہیں جو

جواب کی طاقت ہی نہیں رکھتے، جو کسی شے کے مالک نہیں، جو کوئی آواز بھی نہیں سن سکتے! پھر آپ نے یہ آیت پڑھی: "وَمَا آنتَ بِمَسْمُوعٍ مِّنْ فِي الْقُبُورِ" یعنی حق تعالیٰ حضور انور صلعم کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں "آپ ان لوگوں کو جو قبریں ہیں کچھ نہیں سنا سکتے"۔

امام اعظم کے اس عتاب سے مندرجہ ذیل امور کی وضاحت ہو رہی ہے:-

(۱) اولیاء و صالحین کی قبروں پر اگر ان سے خطاب کسی طرح جائز نہیں۔ آپ نے ایسے لوگوں کو بد دعا دی ہے جو اہل قبور سے دعا کے طالب ہوتے ہیں! اگر آپ کو ان جہال کا حال معلوم ہوتا جو اہل قبور سے رزق، صحت و اولاد مانگتے ہیں اور ان کو مستقل یا غیر مستقل طور پر قادر جانتے ہیں تو یقیناً ان کو کافر و مشرک و ملعون قرار دیتے اور گردن مارنے کا حکم دیتے!

(۲) مرے زسن سن سکتے ہیں اور نہ جواب دے سکتے ہیں۔ پھر بلاؤں کا ٹالنا، مصیبتوں کا دور کرنا ان سے کیا ہو سکتا ہے! اور جب یہ نزدیک سے سن نہیں سکتے تو دور کی کب سینگے؟ محققین حنفیہ سماع موتی کے قائل نہیں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے کشتگان بدر سے جو خطاب فرمایا تھا اس کی توجیہ مختلف طریقوں سے کی گئی۔ بہترین توجیہ یہ ہے کہ:-

یہ آپ کا معجزہ تھا، حق تعالیٰ نے آپ کی بات کفار موتی کو سنادی تھی، چنانچہ کفایہ میں ہے "ومن اجوبہم انہ لو صحہ فذاک معجزۃ لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ کافی شرح وافی میں صراحت کی گئی ہے کہ "والمقصود من الکلام الافہام وذا بالاسماع وذا لا یتحقق بعد الموت یعنی مقصود کلام سے افہام ہے اور یہ سماع کے ذریعہ ہوتا ہے اور سماع موت کے بعد محقق نہیں" اسی طرح عینی شرح ہدایہ میں: "قولہ لان المقصود من الکلام الافہام ای افہامہ فلانا و الموت ینافیہ ای ینافی الکلام الاسماع والمیت لیس باہل السماء الا تری الی قولہ تعالیٰ انک لا تسمع الموتی والی قولہ تعالیٰ و ما انت بمسمع من فی القبور۔"

شرح مواقف میں تشریح کی گئی ہے کہ علم و قدرت و ارادہ، سمع بصر میت کے لیے ثابت

۱۰ غرائب فی تحقیق المذائب ۱۱ شرح مواقف تذیل فی ذکر فرق بعد موقف سادس ص ۵۰ مطبوعہ نول کشور۔

کرنا فرقہ صاحبیہ کا عقیدہ ہے جو معتزلہ کا ایک گروہ ہے۔ الصالحیہ اصحاب الصالحی و مذہبہم انہم جو زواقیہم العلم والقدرة والارادة والسمع والبصر بالمیت و یلزمہم جواز ان یكون الناس مع اتصافہم بھذہ الصفات امواتا وان لا یكون الباری تعالیٰ حیاً یعنی صاحبیہ گروہ ہے صاحبی کا اور مذہب ان کا یہ ہے کہ انہوں نے میت کے لیے علم و قدرت و ارادہ و سمع و بصر کو جائز قرار دیا ہے، ان کے مذہب کی رو سے تو یہ لازم آتا ہے کہ جو لوگ ان صفات سے متصف ہیں وہ سب مردہ ہیں اور حق تعالیٰ بھی زندہ نہیں! اس قول سے معلوم ہوتا ہے کہ اکثر گورپرست مشائخ اسی فرقہ ضالہ کے عقیدہ پر قائم ہیں لغوذاً بشئ من ذلک۔

غرض جب مردے سُن نہیں سکتے اور اسی وجہ سے حق تعالیٰ نے کافروں کی تشبیہ عدم سمع میں مردوں سے دی اور اثبات سمع عقیدہ ہے صاحبیہ مفسدین کا جو معتزلہ کا گروہ ہے تو پھر قبروں کے پاس جا کر مردوں کو پکارنا اور ان سے دعا کی درخواست کرنا ایسا ہی ہے جیسے کہ کوئی بے عقل پتھر کو پکارے اور اس سے دعا کی خواہش کرے! یہ فعل کسی پاگل سے تو صادر ہو سکتا ہے عاقل و ہوشمند سے کیسے ممکن ہے؟ عموماً ایسے ہی پاگل مردوں کو قبروں میں نہ صرف زندہ اور توانا سمجھتے ہیں بلکہ ان کو حق تعالیٰ کے ہاں اپنا شفیع اور مقرب بھی جانتے ہیں، اسی لیے وہ ان کی عبادت کرتے ہیں یعنی ان کے سامنے ذلیل و خوار بن کر کھڑے ہوتے ہیں، ان کی قبروں کو بوسہ دیتے ہیں اور ان کا طواف بھی کرتے ہیں اور کفر و شرک میں مبتلا ہو جاتے ہیں! اذکٰ ہوا الخسران اللہین! یہاں غلط فہمی رفع کرنے کے لیے اس امر کا تذکرہ ضروری ہے کہ جو شخص حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم پر دو سے درود بھیجتا ہے اس کو آپ تک فرشتے پہنچاتے ہیں، آپ اس کو نہیں سنتے البتہ بزرگان دین اور محققین شرع متین نے اس امر کی تصریح کی ہے اور روایات مرفوعہ میں بھی یہ امر مذکور ہے کہ جو شخص آپ کے مزار مبارک کے قریب درود بھیجتا ہے اس کو آپ بخوبی سنتے ہیں چنانچہ ابو بکر احمد بن حسین بیہقی نے شعب الایمان میں ابو ہریرہ سے روایت کی ہے کہ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من صلی علی عند قبری سمعتم من صلی علی نائبا ابلاغتہ یعنی جو درود

۱۰ مشکوٰۃ باب الصلوٰۃ علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فصل ثالث۔

بھیجتا ہے میری قبر کے نزدیک اس کو میں خود سنتا ہوں اور جو درود بھیجتا ہے مجھ پر دور سے وہ مجھ تک پہنچایا جاتا ہے۔ یعنی بذریعہ ملائکہ اور میں خود براہ راست نہیں سنتا، ورنہ پہنچانے کی ضرورت نہ ہوتی جیسا کہ قبر کے پاس کے درود کے متعلق پہنچانے کا ذکر نہیں کیا!

اسی طرح ابن حجر مکی نے شرح ہمزیم میں ذکر فرمایا ہے: "اذا صلی وسلم علیہ عند قبرہ سمعہ

سماً حقیقیاً ویرد علیہ من غیر واسطہ وان صلی وسلم علیہ من بعد لا یسمعہ الا بواسطہ" پیدل علیہ احادیث کثیرہ "یعنی جب کوئی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر کے پاس سے آپ پر درود و سلام بھیجتا ہے تو آپ اس کو حقیقت میں سنتے ہیں اور جواب دیتے ہیں اس کا بلا واسطہ، اور اگر کوئی دور سے آپ پر درود و سلام بھیجتا ہے تو آپ اس کو ہمیں سنتے مگر بواسطہ (یعنی فرشتے آپ تک پہنچاتے ہیں) بہت سی حدیثیں اس پر دلالت کرتی ہیں۔

اس چیز کی شاہ عبدالحق محدث دہلوی نے شرح مشکوٰۃ میں یوں تصریح کی ہے: "سخن درازاں

ماند کہ این فضیلت رد سلام از آن حضرت صلی اللہ علیہ وسلم مخصوص بنائراں قبر شریف اوست صلی اللہ علیہ وسلم مثل داخل در مجلس کہ سلام گوید یا عام است بر ہر کسے را کہ سلام فرستد چنانکہ در شہد و غیراں، و ظاہر ہمین است الا آنکہ سلام زائراں بنفس شریف خود بے واسطہ سماع فرماید در و سلام نمایند و دیگر اں بواسطہ ملائکہ سیاحین بود"

خوب سمجھ لو کہ یہ امر یعنی رد و بلوغ سلام وغیرہ روایات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے لیے آیا ہے، باقی ہے اور انبیاء اگرچہ حیات و صلوات ان کی قبر میں مسلم ہے مگر تبلیغ سلام ورد جواب کی کوئی تصریح نہیں کی گئی۔ المؤمن و قاف

بیان بالا سے صاف ظاہر ہے کہ ندائے بعید کو نبی ہو یا ولی کوئی نہیں سنتا اور ندائے قریب کا سنتا مخصوص ہے انبیاء کے لیے، کسی ولی یا غوث و قطب کو یہ نصیب نہیں!

لہ ان لله ملائکہ سیاحین فی الارض یبلغون عن امتی السلام (سفیان ثوری کی حدیث عبد اللہ

بن مسعود سے رواہ النسائی و ابو حاتم فی صحیحہ)

۱۰ شرح مشکوٰۃ ج ۱ ص ۳۱۹ باب فضل الصلوٰۃ علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم طبع کلکتہ ۱۲۵۳ھ



ہماری اس تصریح کے خلاف بعض کم عقل ضعیف احادیث کو پیش کرتے ہیں، اپنی ضعفِ عقلی اور کتاب و سنت سے عدم مزاوت کی وجہ سے ان احادیث کا صحیح مفہوم نہیں سمجھتے اور دعویٰ کرتے ہیں کہ انبیار و اولیاءِ خدا کے بعد کو بھی سن سکتے ہیں، نہ صرف سن سکتے ہیں بلکہ ہماری مدد بھی کر سکتے ہیں، لہذا ہمیں پکارنا چاہیے یا محمد، یا عوث، یا خواجہ، یا نقشبند، یا بدوی یا شاذلی ہماری مدد کرو۔ اس میں انہیں نہ اشراک فی العلم کا کوئی شائبہ نظر آتا ہے اور نہ اشراک فی التصرف کا! انا لله وانا الیہ راجعون!

ذرا ان کی پیش کردہ احادیث پر غور کرو "ابن سنی کتاب عمل الیوم واللیلہ میں دو روایتیں بیان کرتے ہیں۔ عبد اللہ بن عمر کے پیر میں چونٹیاں بھر گئی تھیں ان سے کسی نے کہا کہ آپ اپنے محبوب ترین شخص کو پکارے۔ انہوں نے یا محمد پکارا اور کھڑے ہو کر چلنے لگے یہی حال عبد اللہ بن عمرو بن العاص کا ہوا۔ انہوں نے یا محمد کاعزہ مارا اور ایسے ہو گئے جیسے پیر سے بندھی رسی کھل گئی ہو۔" یہ حدیث حسن حصین میں ان الفاظ میں ہے: واذا خدمت رجلاً فلیذکوا حب الناس الیہ اس کو موقوفاً ابن سنی نے نقل کیا ہے اور ظفر جلیل میں تحت الفائدہ یہ لکھا ہے کہ "یاد کے محبوب کوتاہی حاصل ہو خوشی پس کے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کہ سب سے زیادہ محبوب ہیں۔" علماء حق نے اس حدیث کے متعلق جو تحقیق کی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے :-

(۱) یہ حدیث مرفوع نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قول یا فعل ہو بلکہ موقوف ہے اور حدیث موقوف حجت نہیں خصوصاً جس وقت کہ صدہا آیات قرآنیہ اور احادیث نبویہ کے خلاف اور معارض ہو! چنانچہ علمائے اصول نے تصریح کر دی ہے کہ قول الصحابی لیس بجزئی صحابی کا قول حجت نہیں۔ (۲) اس حدیث کو اگر تسلیم بھی کر لیا جائے تو اس سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ پیر کے سن ہو جانے کے وقت کسی محبوب کو یاد کرنا چاہیے، یاد کرنے سے خوشی حاصل ہوتی ہے اور خون جوش میں آتا ہے اور نتیجہ کے طور پر "حذر" دور ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک علاج طبی اور عمل نفسیاتی ہے اور ادویہ طبیہ و

لہذا اس وجہ سے کہ ان کا علم فردیہ مذاہب پر منحصر ہے۔

اعمالِ نفسیاتی کو دین میں کیا دخل؟ اطباء نے اس امر کی تصریح کی ہے کہ خدر کا سبب اخلاطِ بلغمیہ و ریاحاتِ غلیظہ ہیں، خوشی و فرحت سے خون میں جوش ہوتا ہے اور ریاحِ تخلیل ہو جاتی ہیں۔ دوست کا یاد کرنا خوشی پیدا کرتا ہے خوشی خون میں تغیر پیدا کرتی ہے اور نتیجہ کے طور پر مرضِ رفع ہوتا ہے، اس سلسلہ علت و معلول کا تعلق نہ نذائے بعید کے سننے سے نظر آتا ہے نہ اولیاء و انبیاء کی اعانت و مدد سے؛ مزید تحقیق سے مندرجہ ذیل امور قابلِ لحاظ نظر آتے ہیں:-

(۳) اس حدیث کی بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی تعلیم کسی نبی سے تو کیا صحابی سے بھی نہیں ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ کسی صحابی کے پیرسٹن ہو گئے تو کسی نے کہا کہ تم اپنے محبوب ترین دوست کو یاد کرو، انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یاد کیا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا معلم کوئی معمولی شخص ہے اور تعلیم معمولی حجت نہیں۔ چنانچہ نووی نے اذکار میں جو روایت کی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں عن الھیثم بن جثش قال کنا عند عبد اللہ بن عمر فحدث رجلہ فقال لہ رجل اذکوا حب الناس الیک فقال یا محمد صلی اللہ علیک وسلم فکانما نشط من عقال یعنی ہم عبد اللہ بن عمر کے ہاں تھے، ان کا پیرسٹن ہو گیا۔ ایک شخص نے کہا کہ یاد کرو احب الناس کو تو انہوں نے کہا کہ محمد رحمت کے خدا آپ پر اور سلام نازل کرے۔ سو اسی وقت ان کا پیرسٹن کھل گیا جیسے اونٹ رسی سے کھل جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس روایت سے بھی پتہ نہیں چلتا کہ اس نسخہ کا بدلنے والا کون تھا۔

(۴) اس سلسلہ میں یہ امر نہایت ضروری ہے کہ ہم یاد کرنے کے صحیح معنی کا تعین کریں حضورؐ انور صلی اللہ علیہ وسلم کا یاد کرنا دو طرح پر ہو سکتا ہے:-

- ۱۔ ایک وہ جس کا ثبوت شریعت میں ملتا ہے وہ یہ کہ آپ کے فضائلِ صحیحہ جو احادیث اور قرآن کریم میں وارد ہوئی ہیں ہم ان کا تذکرہ کریں جو مصائب اور آفات آپ نے ہماری ہدایت اور رہبری کی خاطر اٹھائی ہیں ان کو یاد کریں، آپ کے فضائلِ محمودہ، اخلاقِ حمیدہ، عاداتِ پسندیدہ کا چرچا کریں۔
- ب۔ دوسرا طریقہ جو قطعاً خلافِ شرع ہے یہ ہے کہ آپ کو دور سے پکاریں، ندادیں، مدد مانگیں، استغاثہ کریں۔ یہ موہم شرک ہے اور قطعاً ناجائز، اس روایت سے تذکیر یا یاد کرنے کے معنی خلافِ شرع

مراد لینا مشرکانہ ذہنیت کا پتہ دیتا ہے۔ موجد حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی یاد آپ پر درود بھیج کر کرتا ہے جو حق تعالیٰ کا تعلیم کردہ طریقہ ہے، آپ کی احادیث کا چرچا کرتا ہے جو نزول رحمت کا باعث ہے۔  
 (۵) دیکھو بعض روایتوں میں لفظاً "مذکور ہی نہیں، اس سے واضح ہوتا ہے کہ نہ ضروری نہیں اور تذکیر بغیر خدا کے ہی ہو سکتی ہے۔ چنانچہ مجاہد کی روایت اسی پر دلالت کرتی ہے۔ عن مجاہد فقال حدث رجل رجلاً عن ابن عباس، فقال ابن عباس اذكروا احب الناس اليك فقال محمد صلی اللہ علیہ وسلم فذهب خدماً۔ یعنی مجاہد سے روایت ہے کہ ابن عباس کے پاس ایک شخص کا پیر سن ہو گیا تو آپ نے فرمایا کہ اپنے محبوب ترین دوست کو یاد کرو انہوں نے کہا "محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔ ان کا خدر جاتا رہا۔ اور خطاب جو مقرون بصلوٰۃ ہو وہ شرعاً جائز بھی ہے کیونکہ حدیث میں وارد ہے کہ درود کے پہنچانے کے لیے ملائکہ مقرر ہوتے ہیں۔ ان کے ذریعہ درود کی اطلاع حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہو جاتی ہے۔ یا پھر شوق و محبت میں پکارا جاسکتا ہے اس میں آپ کے حاضر و ناظر ہونے کا عقیدہ منضم نہیں ہوتا جو صریحاً شرک ہے۔

(۶) اخیر میں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ یہ آثار نہ قولی ہیں نہ فعلی کہ ان کی تعبیر کی جائے اور ان سے یہ ثابت کیا جائے کہ ہر تکلیف یا مصیبت کے وقت احب الناس کو یاد کیا جائے نیز یہ امر سلف سے ثابت بھی نہیں کہ مصیبت کے وقت ایسا کیا کرتے تھے! اور نہ یہ کسی مجتہد مسلم الاجتہاد کا مذہب ہے کہ مصیبت کے وقت احب الناس کو یاد کیا جائے تاکہ مشکل حل ہو جائے آفت ٹل جائے اور مصیبت دور ہو جائے۔ اس کے برخلاف ہم نے اوپر قرآن کریم سے اس بات کا ثبوت دیا ہے کہ مصیبت کے وقت ہر نبی نے حق تعالیٰ ہی کو پکارا، ان ہی سے اعانت چاہی اور غیر اللہ کا اس سلسلہ میں خیال بھی نہ آنے دیا، باوازل بند کہا ہے

ایں بسکہ دلم جز تو ندارد کامے تو خواہ بدہ کام دلم خواہ مدہ!

جن لوگوں کے قلوب میں غیر اللہ سے مدد سما گئی ہے اور یہ ان کی طبیعتوں میں رچ گئی ہے وہ

لہ جامی کا پہلا شعر یہ ہے یا من ملکوت کل شئی بیدہ: طوبی لمن ارتضاک ذخراً لغدہ۔

ایک دوسری حدیث اپنی تائید میں پیش کرتے ہیں: "حسن حصین میں حضرت سے مروی ہے کہ آپ نے اس شخص کے متعلق جو راہ گم گشتہ ہو فرمایا کہ پکارے اعیوننی یا عباد اللہ۔" اے بندگانِ خدا تم میری مدد کرو" اس حدیث سے استناد کر کے کہا جاتا ہے کہ "ہم راہ گم گشتہ ہیں، ہم پکارتے ہیں: اعیوننی یا عباد اللہ! یا غوث! یا خواجہ! یا نقشبند! یا بدوی، یا شاذلی ہماری مدد کرو!"

حسن حصین کے الفاظ یہ ہیں: ان اراد عوناً فلیقل یا عباد اللہ اعیوننی یا عباد اللہ اعیوننی یا عباد اللہ اعیوننی (ردہ طبرانی) اس حدیث سے جو استدلال کیا گیا ہے اس پر علماء حنفی نے جو تنقید کی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے:-

(۱) اس حدیث کی سند میں ایک راوی ابن حسان ہے جو محدثین کے نزدیک منکر الحدیث ہے اور روایتی نے اس کو ضعیف قرار دیا ہے!

(۲) اس کی سند منقطع بھی ہے، بیچ میں ایک راوی چھوٹ گیا ہے اور منقطع کا حکم مثل مرسل ہے اور محدثین اور اہل اثر کی جماعت کے نزدیک یہ حجت نہیں!

(۳) اس حدیث کے راویوں میں ایک راوی عتبہ بن غزوان ہے جو مجہول الحال ہے یعنی اس کا تقویٰ اور عدل معلوم نہیں۔ چنانچہ تقریب ابن حجر میں اسی بنا پر استدلال کیا گیا ہے کہ جب

اس حدیث کا ایک راوی ضعیف اور مجہول الحال ہو تو یہ نہ قابلِ اعتماد ہے اور نہ لائقِ استدلال! (۴) جرح سے قطع نظر کر کے اگر ہم اس حدیث کو تسلیم بھی کر لیں تو ہم عقلِ سلیم کا واسطہ دے

کر پوچھتے ہیں کہ کیا یہ اموات سے استعانت پر دلیل ہو سکتی ہے؟ عباد اللہ سے مراد تو فرشتے ہیں جو حفاظت کے لیے معین و مقرر ہیں۔ چنانچہ فیض القدر شرح جامع لاصغیر میں اس کی یوں

توضیح کی گئی ہے۔ ان لله ملائکته فی الارض یسمون الحفظة یکتون ما یقع فی الارض من ورق الشجرة فاذا اصاب احدکم حرجة واحتاج الی عون بفلاة من الارض فلیقل

ابن بربیہ اور ابن مسعود کے درمیان - فیض القدر ج ۱ ص ۳۰، مطبوعہ مصر ۱۳۵۶ھ

اعینونی عباد اللہ رحمہ اللہ فانسان شاء اللہ یعان (مرہاہ ابن السنی والطبرانی من تہذیب  
الحسن بن عمر عن معروف ابن حسان عن سعید ابن ابی عمرو بن عن ابی بربیدہ عن ابن  
مسعود قال ابن حجر حدیث غریب و معروف قالوا منکر الحدیث وقد تضرع بہ وہ فیہ  
انقطاع بین ابی بربیدہ وابن مسعود یعنی اللہ کے کچھ فرشتے زمین میں مقرر ہیں جن کو حفظ اور  
نگہبان کہتے ہیں، جو درخت کا پتہ زمین پر گرنا ہی اس کو لکھا کرتے ہیں توحید ہم میں سے کسی کو  
تکلیف پہنچے اور مدد کا محتاج ہو زمین کے کسی صاف میدان میں تو اس کو چاہیے کہ یوں  
کہے کہ اے خدا کے بندو میری مدد کرو، اللہ تم پر رحم فرمائے، ایسے کہنے سے بیشک مدد حاصل ہوگی  
دیکھو عباد اللہ سے مراد فرشتوں کا ہونا خود حدیث ہی سے ثابت ہے جو زندہ ہیں، اب  
اہل استمداد کا اموات کو اپنی مدد کے لیے پکارنا ان کی مشرکانہ طبیعت کی ایجاد ہے، حدیث سے  
اس کی اجازت کہاں نکلتی ہے ہم اوپر بتائے ہیں کہ قرآن کریم نے مخلوق سے استعانت ان  
امور میں جائز رکھی ہے جو ان کی قوت و قدرت کے احاطہ میں ہوں، یہ استعانت بالمرئوبیت  
یا عون ما بین العباد ہے جب کسی کا گھوڑا بھاگ جائے یا کوئی چیز کھو جائے تو اس معاملہ میں  
ادنی لوگوں سے بھی مدد لی جاسکتی ہے جس امر میں مخلوق سے استعانت کر سکتے ہیں اس میں  
ملائکہ، ابدال اور جنوں سمجھی مدد لی جاسکتی ہے۔ یہ زندہ مخلوق سے ان امور میں استعانت  
کرنا ہے جو ان کے دائرہ قدرت میں شامل ہے۔ اب رہی وہ استعانت جو حق سے مخصوص ہے  
استعانت بالمرئوبیت وہ کسی طرح اس حدیث سے ثابت نہیں ہو سکتی اور نہ کسی ذی علم و  
ذی ہوش نے اس کے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ استعانت عن الاموات کا یہاں تو  
شائبہ بھی نہیں پایا جاتا۔

(۵) بفرص محال ہم مان لیتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح الاسناد ہے اور اس سے بات بھی ہی  
ثابت ہوتی ہے جو اہل استمداد سمجھتے ہیں! دعا و استعانت کے متعلق اوپر جو تصریحات پیش کی گئیں

لہ منکر الحدیث (میزان ذہبی)



ان کو پیش نظر رکھ کر یہ صاف ظاہر ہے کہ یہ حدیث جو خبر واحد ہے قرآن مبین کے معارض و مخالف ہے اور اسی وجہ سے رد کردی جانی چاہیے کیونکہ قرآن مقدم ہے، اس کا تقدم اس کی قطعیت اس کے متواتر انظم ہونے اور اس کا سند کے محتاج نہ ہونے پر مبنی ہے۔

(۶) اس حدیث کے مخالف و معارض دوسری حدیث بھی اسی کتاب حسن حسین میں ملتی ہے جس کو طبرانی اور ابن ابی شیبہ نے روایت کیا ہے: اِذَا ضَلَّكَ لَهْ شَيْئًا اَوْ اَبَقَ فَلْيَقُلْ: اَللّٰهُمَّ رَادِ الضَّالَّةَ وَهَادِ الضَّالَّةَ اِنَّكَ تَهْدِي مِنَ الضَّلَالَةِ اِرْجُوْهُ عَلٰى ضَالَّتِيْ بِقُدْرَتِكَ وَسُلْطَانِكَ فَاَنْهَا مِنْ عَطَاكَ وَفَضْلِكَ - یعنی "جب آدمی کی کوئی چیز گم ہو جائے یا اس کا غلام بھاگ جائے تو یوں دعا کرے: "اے خدا جو پھیر لاتا ہے گم ہوئی چیز کو، اے بھولے بھٹکے کی راہ بتلانے والے تو ہی راہ بتلاتا ہے بھول اور گمراہی سے، واپس دلادے مجھ کو میری گم ہوئی چیز اپنی قدرت اور غلبہ سے کہ وہ چیز تیری بخشش اور احسان سے تھی؟"

علاوہ بریں ابن عباس سے جو حدیث مروی ہے اور جس کا ذکر ہم نے اوپر کیا ہے اس میں صاف طور پر حکم دیا ہے فاذا استعنت فاستعن بالله یہ معارض و مخالف ہے حدیث اعمینونی کے اور ظاہر ہے کہ حدیث ابن عباس موافق ہے فحوائے کلام مجید کے لہذا اس کو دوسری حدیث پر ترجیح ہونی چاہیے۔

کیا غضب ہے یہ اموات کے پرستار زندہ خدا کو چھوڑ کر مردوں سے استعانت کرتے نہیں شرتے اور اپنی بے شرمی کو رفع کرنے کے لیے کتاب و سنت سے دلائل تلاش کرنے کی فکر میں لگے رہتے ہیں! لیکن کتاب و سنت سے تو بس یہی ثابت ہوتا ہے کہ مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ (بقرہ ۱۰۷) دیکھو حضرت جامی نے اسی بات کو کس خوبی سے ادا کر دیا ہے:-

حق فاعل و ہرچہ جز حق آلات بود      تاثیر ز آلت از محالات بود  
ہستی کہ موثر حقیقی است بکیت      باقی ہمہ اوہام و خیالات بود

نہا اور استعانت کی تائید میں اہل استمداد ایک، اور حدیث پیش کرتے ہیں، سوال خور پیش

کر کے جواب دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ "یا رسول اللہ یا غوث! پکارنا بھی کیا ناجائز نہیں؟ شرک نہیں؟ ترمذی، نسائی، طبرانی، ابن خزمیہ، حاکم، ہیثمی نے یہ دعا روایت کی ہے: اللھم انی لسألك واتوجه الیک بحبیبک المصطفیٰ عندک یا حبیبنا یا محمد انا نتوسل بک الی ربک فاشفع لنا عند المولیٰ العظیم یا نعم الرسول الطاهر۔ اللھم شفعبینا بجاہ عندک۔ اس دعا میں یا محمد کی ندا ہے اور حضرت عثمان کے زمانہ میں بھی اس دعا کو صحابہؓ نے خود پڑھا اور دوسروں کو بھی اس کی تعلیم دی" تو سوال کا جواب یہ ہوا کہ یا رسول، یا غوث! پکارنا شرک نہیں جائز ہے اور ادھر بھی دو حدیثوں سے استدلال کر کے اہل استدلال کے اہل استدلال نے اپنی دانست میں ثابت کر دیا ہے کہ یا غوث یا بدوی، یا شاذلی، یا نقشبند پکارنا جائز ہے۔

اس حدیث کی تحقیق یہ ہے:-

(۱) مروی ہے ایک اندھے نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ آپ میرے لیے حق تعالیٰ سے دعا کیجیے کہ مجھے اس مرض سے شفا دیں۔ آپ نے فرمایا کہ اگر تو چاہے تو میں دعا کروں اور چاہے تو نابینا ہو کر تیرے حق میں یہی بہتر ہے۔ اس نے عرض کیا کہ میرے لیے دعا ہی کیجیے۔ آپ نے خود دعا نہیں فرمائی بلکہ حکم دیا کہ وضو کرے اور پھر ارشاد فرمایا کہ یہ دعا پڑھے:- اللھم انی اسألك واتوجه الیک بنبیک نبی الرحمتہ یا محمد انی اتوجه بک الی ربی فی حاجتی ہذا لتقضى لی فشفعبنی (ترمذی) نسائی، ابن ماجہ، حاکم نے روایت کی، اس نے یہ دعا پڑھی اور بینا ہو گیا۔ (کذافی المشکوٰۃ)

(۲) یہ حدیث اعتقاد کے بارے میں قابل استدلال نہیں کیونکہ اس کا ایک راوی عثمان بن خالد متروک الحدیث ہے۔ فقہاء و محدثین کے نزدیک ایسے راوی کی نقل قابل حجت نہیں۔ چنانچہ نووی کی تقریب اور اس کی شرح تدریب الراوی میں یہ مسئلہ مصرح ہے۔

لے یا اللہ میں تجھ سے مانگتا ہوں اپنی حاجت اور تیری طرف متوجہ ہوتا ہوں بذریعہ تیرے پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے کہ نبی رحمت ہیں۔ یا محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں متوجہ ہوتا ہوں اپنے پروردگار کی طرف آپ کے ذریعے اپنی اس حاجت میں تاکہ میرے حق میں حاجت روائی کی جائے۔ الہی تو ان کی شفاعت میرے حق میں قبول فرما۔

(۳) اگر ہم اس حدیث کو بفرض مجال قابل استدلال بھی مان لیں تو اس سے محض توسل ثابت ہوتا ہے نہ یہ کہ جب کوئی اس نذ اور خطاب سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا وسیلہ بارگاہِ خداوندی میں پیش کرتا ہے تو آپ اس کی آواز سنتے ہیں جیسا کہ اہل استدلال ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ توسل میں کیا ہوتا ہے؟ متوسل کرتا کیا ہے؟ وہ طلبِ حاجت کرنا ہے اسی ذات سے جو عطا و منع میں مستقل و منفرد ہے جو صاحبِ امر و نہی ہے، جس کے ہاتھ میں ہر شے کا "ملکوت" ہے اور طلب سے پہلے ایک سببِ اجابت کو آگے کر دیتا ہے جیسا کہ صحیحین میں قصہ ان تین آدمیوں کا آیا ہے جو ایک غار میں بند ہو گئے تھے۔ ان میں سے ہر شخص نے اپنے سب سے اچھے عمل کے ساتھ توسل کیا اور وہ پتھر غار کے منہ سے ہٹ گیا۔ اگر یہ توسل بـاعمالِ فاضلہ جائز نہ ہوتا یا شرک ہوتا تو حق تعالیٰ ان کی دعا کو قبول فرماتا نہ حضور انورؐ اس حکایت کے بعد سکوت فرماتے۔

لیکن اگر متوسل یہ سمجھے کہ انبیاء یا ملائکہ ایسا واسطہ اور وسیلہ ہیں کہ جن کو پکارنا اور ان پر بھروسہ کرنا ضروری ہے اور جلبِ نفع اور دفعِ ضرر کے لیے ان کی طرف رجوع کرنا چاہیے اور ان کی تعظیم بجالانا چاہیے تو یہ سب سے بڑا شرک ہے حق تعالیٰ نے اس کے رد میں بہت ساری آیتیں نازل فرمائیں۔ کفار و مشرکین مکہ نے اللہ کے سوا اوروں کو اپنا شفیع اور حمایتی قرار دے رکھا تھا، نفع حاصل کرنے اور ضرر دفع کرنے کے لیے ان ہی کی طرف رجوع کرتے تھے، مشرکین یہود و نصاریٰ، مسیح اور عزیز اور ملائکہ کو پکارتے تھے، استغاثہ کرتے تھے حق تعالیٰ نے ان کے متعلق صاف طور پر صراحت فرمادی کہ **فَلَا يَمْلِكُونَ كَشْفَ الضَّرِّ عَنْكُمْ وَلَا تَحْوِيلًا**۔

دیکھو بادشاہ اور رعایا کے درمیان عرض معروض کے لیے چوبدار عرض بیگی ہوتے ہیں جو بادشاہ کے کانوں تک رعایا کا درد دکھ پہنچاتے ہیں، اگر کوئی انبیاء و اولیاء کے متعلق یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ یہ بھی حق تعالیٰ کی جناب میں خلق کی حاجتوں کو پہنچاتے ہیں، ان کے درد دکھ کو سنا سکتے ہیں اور حق تعالیٰ اُخلاق کی جو حاجت روائی کرتے ہیں، ان کو رزق دیتے ہیں، ہدایت کرتے ہیں تو ان ہی کے واسطے سے لہذا خلق کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان ہی سے حاجت طلب

کریں اور وہ حق تعالیٰ سے عرض کریں جیسے کہ عرض بیگی بادشاہوں سے کرتے ہیں۔ تو ایسا عقیدہ رکھنے والا باتفاق اہل اسلام کافر و مشرک ہے۔ بعینہ ہی دین مشرکین کا ہر جوت پرست ہیں، وہ اپنے بتوں کو انبیاء و صالحین ہی کی صورتوں پر بناتے تھے اور ان کو اپنے اور حق تعالیٰ کے درمیان واسطہ اور وسیلہ قرار دیتے تھے جو ان کو حق تعالیٰ سے قریب کر سکتے تھے۔ (کما صرح ص ۱۵۸) اور یہی وہ شرک ہے جس کی وجہ سے نصاریٰ معتوب ہوئے۔ ان کے متعلق قرآن مبین نے صراحت کی ہے۔ اَتَّخِذُوا أَحْبَابَهُمْ وَرُحَمَاءَهُمْ أَدْبَابًا مِّنْ دُونِ اللَّهِ وَالْمَسِيحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَمَأْمُورًا بِالْإِيعَادِ إِلَهُهَا وَاحِدًا لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ سُبْحٰنَهُ عَمَّا يُشْرِكُونَ (پتھ ۱۱) عرض حق تعالیٰ نے اس توحید کو قرآن کریم میں جا بجا بیان فرمایا ہے اور شرک کو بیخ و بنیاد سے اکھاڑ پھینکا ہے اور اس کی اصل صرف اتنی ہے کہ حق تعالیٰ کے سوا کسی سے خوف نہ کرے اور نہ کسی سے اُمید رکھے اور نہ کسی کو ان کے سوا اپنے کاموں میں کافی جانے ۷

موجد کہ درپائے ریزی زرش      دگر آ رہ می نہی بر سرش

اُمید و ہراسش نہ باشد ز کس      ہمیں است بنیاد توحید و بس

ذرا اس واسطہ یا وسیلہ کے مسئلہ پر عقلی پہلو سے بھی غور کر لو، عالم خارجی کی بادشاہت پر نظر ڈالو، یہاں بادشاہ اور رعایا کے درمیان وسائط تین ہی قسم کے ہوتے ہیں (۱) چونکہ خود بادشاہ اپنی تمام رعایا کے احوال کی خبر نہیں رکھ سکتا اس کو ایسے وسائل کی ضرورت ہوتی ہے جو اس کو رعایا کے حال کی خبر دیتے رہیں۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کا کوئی واسطہ خدا اور بندوں کے درمیان فرض نہیں کیا جاسکتا کیونکہ حق تعالیٰ پر کوئی چیز مخفی نہیں ہے۔ زمین و آسمان کا کوئی ذرہ ان کے علم محیط سے باہر نہیں، وہ "سَمِيعٌ وَبَصِيرٌ عَلِيمٌ" ہیں اور بھولے ہو بکل شیء علیم ہر شے سے

لَهُ مَن جَعَلَ بَيْنَهُ وَبَيْنَ اللَّهِ وَسَائِطَ تَبَوَّلَ عَلَيْهِمْ وَيَدْعُوهُمْ كَذِبًا عَالَمًا لَّن ذَٰلِكَ كَفْعَلْ عَابِدِي الْأَصْنَامِ قَاتِلِينَ مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرَّبُوا إِلَى اللَّهِ زُلْفَىٰ - (اقناع اور اس کی شرح دیکھو) لہ انہوں نے خدا کو چھوڑ کر اپنے علماء و مشائخ کو رب بنا رکھا ہے اور مسیح ابن مریم کو بھی حالانکہ ان کو صرف یہ علم کیا گیا ہے کہ فقط ایک معبود کی عبادت کیا کریں جس کے سوا کوئی لائق عبادت نہیں۔ وہ ان کے شرک سے پاک ہے۔

واقف!

(۲) چونکہ بادشاہ اکیلا سارے ملک کا انتظام نہیں کر سکتا اور نہ ہی تنہا اپنے دشمنوں سے جنگ کر سکتا ہے، لہذا اس کو اعوان و انصار کی ضرورت ہوتی ہے لیکن حق تعالیٰ کو نہ کسی ناصر و مددگار کی ضرورت ہے اور نہ کسی معین و ظہیر کی، وہ کائنات کے تمام اسباب و آلات کے خالق، رب، مالک ہیں، ان کی ذات تمام اشیاء سے غنی و بے نیاز ہے، سارا عالم ان کا فقیر و محتاج ہے، مملوک و مرہوب ہے۔

(۳) چونکہ بادشاہ اپنی رعایا کی نفع رسانی اور خبر گیری میں مستی اور غفلت کر سکتا ہے، لہذا اس کو کسی ایسے محکم کی ضرورت ہے جو اس کو اپنے فرائض کی ادائیگی پر آمادہ کرے لیکن اس قسم کے کسی محکم کی حق تعالیٰ کو ضرورت نہیں کیونکہ وہ خود خلق پر ماں باپ سے زیادہ رحیم ہیں۔

عقائد کے ان بدہیئات کے ماننے کے بعد اگر کوئی یہ خیال کرے کہ حق تعالیٰ اور ان کے بندوں کے درمیان ان وسائل کی ضرورت ہے جو سلطان اور رعایا کے درمیان ضروری ہیں اور وہ وسائل انبیاء اولیاء ملائک یا اور موجودات ہیں تو وہ کھلا بُت پرست ہے جو اپنے اصنام اور اولیاء کو حق تعالیٰ کے دربار میں شفیع، وکیل، حمایتی، مقرب سمجھتا ہے اور اسی خاطر ان کی عبادت کرتا ہے، وہ خالق اکبر کو مخلوقِ ابر کے مشابہ سمجھتا ہے جو بغیر اپنے اعوان و انصار کے، بغیر اپنے معین و ظہیر کے کائنات کا انتظام ہی نہیں کر سکتا۔ **فَلَا تَضْرِبُوا لِلَّهِ الْأَمْثَالَ تَعَالَى اللَّهُ عَنِ ذَٰلِكَ عُلُوًّا كَبِيرًا۔**

**شفاعت** اسی سلسلہ میں شفاعت کا صحیح طور پر علم حاصل کرنا ضروری ہے۔ شفاعت کے معنی ہیں سفارش دنیا میں سفارش یا شفاعت کئی قسم کی ہوتی ہے۔

(۱) شفاعتِ دجاہت: بادشاہ کے دربار کا ایک امیر، بادشاہ کے پاس ایک چور کی سفارش کرے جس کی چوری ثابت ہے، بادشاہ سزا دینا چاہتا ہے لیکن اس امیر کی سفارش سے دب کر اس چور کی تقصیر کو معاف کر دیتا ہے تاکہ امیر کی ناخوشی کی وجہ سے امور سلطنت میں خلل نہ پڑے۔

لہٰذا ان امور کی مزید توضیح کے لیے دیکھو ابن تیمیہ کا رسالہ قاعدہ واسطیہ جو توسل پر ایک بے نظیر رسالہ ہے جس سے ہم نے یہاں استفادہ کیا ہے۔



ظاہر ہے کہ جو شخص کسی فرشتے یا نبی یا ولی کو حق تعالیٰ کی جناب میں اس قسم کا شفیع سمجھتا ہے وہ سخت جاہل اور کھلامشک ہے۔

(۲) شفاعتِ محبت :- اس چور کی سفارش بادشاہ کا کوئی محشوق یا منظور نظر کرتا ہے اور بادشاہ اس کی محبت سے ناچار ہو کر چور کو معاف کر دیتا ہے اور اپنا غصہ پی جاتا ہے۔

ظاہر ہے کہ اس قسم کی بھی شفاعت حق تعالیٰ کی بارگاہ میں تصور نہیں کی جاسکتی۔ بندہ اپنی عبودیت کی حد سے آگے نہیں بڑھ سکتا!

(۳) شفاعت بالاذن :- اس چور کی سفارش بادشاہ کی مرضی پا کر، اس کی اجازت سے کی جاتی ہے نہ اس وجہ سے کہ سفارش کرنے والا اس کا قرابتی ہو یا آشنا یا حمایتی۔ بس یہی ایک شفاعت حق تعالیٰ کی بارگاہ میں ممکن ہے۔ اسی کا ذکر قرآن کریم واحدیت نبوی میں آیا ہے شفاعت بالاذن کے متعلق مندرجہ ذیل چند امور کا ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔

(۱) شفاعت نہ ہوگی مگر حق تعالیٰ کے اذن سے! ان آیات سے اس کی توضیح ہوتی ہے :-

۱۔ یَوْمَئِذٍ لَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ إِلَّا لِمَنْ أَذِنَ لَهُ الرَّحْمَنُ وَرَضِيَ لَهُ قَوْلًا (پ ۱۵ ع ۱) اس روز سفارش نفع نہ دے گی مگر اس شخص کے لیے جس کے واسطے اللہ تعالیٰ نے اجازت دیدی ہو اور اس شخص کے واسطے بولنا پسند کر لیا ہو!

ب۔ مَنْ ذَا الَّذِي يَشْفَعُ عِنْدَهُ إِلَّا بِإِذْنِهِ (پ ۲ ع ۲) ایسا کون شخص ہے جو اس کے پاس سفارش کر سکے بدون اس کی اجازت کے۔

ج۔ لَا تَغْنِي شَفَاعَتُهُمْ شَيْئًا إِلَّا مِنَ بَعْدِ أَنْ يَأْذِنَ اللَّهُ لِمَنْ يَشَاءُ وَيَرْضَى (پ ۱۶ ع ۱) یعنی ان کی سفارش ذرا بھی کام نہیں آسکتی مگر بعد اس کے کہ اللہ تعالیٰ جس کے لیے چاہیں اجازت دیدیں اور راضی ہوں۔

ان آیات سے ظاہر ہے کہ شفاعت حق تعالیٰ کے حکم و اجازت سے ہوگی نہ شفیع کی مختاری خود رائی سے کہ اپنے جس دوست کے حق میں چاہا بغیر مرضی حق کے معلوم کرنے اور بدون اجازت سفارش کر دی۔

کفار و مشرکین ہی سمجھتے تھے کہ ان کے معبودان کی سفارش کریں گے اور عذاب سے بچالینگے اس سفارش کو حق تعالیٰ باطل کر رہے ہیں اور جس سفارش کو ثابت کر رہے ہیں وہ اس بندہ محکوم کی شفاعت ہے جو اپنے مالک و مولیٰ کے سامنے بدون اس کی اجازت و امر کے پیشقدمی نہیں کرتا پہلی قسم کی شفاعت "شربک" کی شفاعت ہے اور حق تعالیٰ کا کوئی شربک نہیں، دوسری قسم کی شفاعت بندہ محکوم کی ہے وشتان بین ذلک! جب یہ بات سمجھ میں آگئی ہے کہ حق تعالیٰ جس کو چاہیں گے اسی کے واسطے سفارش کا حکم دینگے تو یہ بات بھی کھل جاتی ہے کہ واقع میں سفارش حق تعالیٰ ہی کی ہوتی اور جو شخص ان کے سامنے سفارش کرے گا وہ ان کے امر و اجازت سے کرے گا۔ ابن قیم کے الفاظ میں "وہ ذات پاک خود اپنے نفس سے سفارش کریگی یعنی اپنے آپ ہی بندہ پر رحم کرنا منظور ہوگا۔ یہی معنی ہیں قُلْ لِلّٰهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيعًا کے اور نیز اس آیت کے قَالَهُمْ مِنْ دُونِ مَنْ وَّلِيٌّ وَّلَا شَفِيعٌ اِلَّا مَنْ سِوَا نَهْ كُوْنِي وَّلِيٌّ هُوَ اُوْر نَهْ شَفِيعٌ" اور جس نے کہ اللہ کے سوا کسی اور کو اپنا ولی و شفیع ٹھہرایا، اس کی مثال ایک مگڑی کی سی ہے جس نے ایک گھر بنایا جو سب سے زیادہ بودا اور کمزور ہے! اٹھوڑی دیر کے لیے اس آیت پر غور کرو، شرک فی التصرف اور شفاعت کو کس خوبی سے رد کیا جا رہا ہے۔

قُلْ اَدْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَمْلِكُوْنَ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ فِى السَّمٰوٰتِ وَّلَا فِى الْاَرْضِ وَّمَا لَهُمْ فِىْهَا مِنْ شَرِكٍ وَّمَا لَهُمْ مِنْهُمْ مِنْ ظٰهِرٍ وَّلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنْدَهُ اِلَّا مَنْ اِذِنَ لَكَ۔ یعنی آپ فرمائیے کہ جن کو تم خدا کے سوا سمجھ رہے ہو ان کو پکارو، وہ ذرہ برابر اختیار نہیں رکھتے، نہ آسمانوں میں اور نہ زمینوں میں اور نہ ان کی ان دونوں میں کوئی شرکت ہے اور نہ ان میں سے کوئی اللہ کا مددگار ہے اور خدا کے سامنے سفارش کسی کی کام نہیں آتی مگر اس کے لیے جس کی نسبت وہ اجازت دیدے (پ ۲۶) مشرک نے جس کو اپنا معبود قرار دے رکھا ہے اس سے وہ نفع کی امید کرتا ہے اور نفع اسی سے پہنچ سکتا ہے جس میں ان چار صفات میں سے کم از کم ایک صفت ہوتی ہے۔

۱۔ یا تو وہ اس شے کا مالک ہو جس کی امید یہ عابد کر رہا ہے اور جس کے لیے وہ دعا کر رہا ہے۔

۲۔ اگر مالک نہ ہو تو مالک کا "شربک" ہو۔

۳۔ اگر شریک بھی نہ ہو تو کم از کم اس کا معین و ظہیر یعنی مددگار ہو۔

۴۔ اگر زمین و ظہیر بھی نہ ہو مالک کے نزدیک شفیع ہو۔ (ابن قیم)

ان ہی چار صورتوں میں عابد کو اپنے معبود سے فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ اب حق تعالیٰ ان چاروں کی ترتیب وار نفی فرما رہے ہیں، اعلیٰ صفت سے شروع کر کے ادنیٰ صفت کی طرف رجوع فرما رہے ہیں، ملک و شہرت و مظاہرت (مددگاری) و شفاعت کی کلی نفی فرما رہے ہیں اور اس شفاعت کا اثبات کیا جا رہا ہے جس سے مشرک کو کوئی فائدہ نہیں اور یہ شفاعت حق تعالیٰ ہی کے اذن سے ہوگی۔ یہ آیت ایک نور ہے، برہان ہے۔ اس سے توحید کا قطعی اثبات ہوتا ہے اور شرک کی ساری جڑیں کٹ جاتی ہیں۔

(۲) اذن نہ ہوگا مگر اس شخص کے لیے جس کے قول و فعل کو حق تعالیٰ پسند فرمائینگے۔

حق تعالیٰ شفاعت کا حکم اسی شخص کی نسبت عطا فرمائینگے جو قول و فعل کے لحاظ سے ان کا پسندیدہ ہوگا۔ لَا يَشْفَعُونَ إِلَّا لِمَنْ ارْتَضَىٰ (پہ ۲۶) یعنی جن کو شفاعت کا اذن دیا گیا ہے وہ بخیر اس کے جس کے لیے خدا تعالیٰ کی مرضی ہو اور کسی کی سفارش نہیں کر سکتے۔

(۳) کسی کا قول و فعل پسند نہ ہوگا مگر توحید و اتباع رسول۔

ابو العالیہ فرماتے ہیں کلماتن یستل عنہما الاولون والآخرون، ماذا کنتم تعبدون وعاذا اجبتہم المرسلین یعنی دو باتوں کا تمام اولین و آخرین سے سوال کیا جائیگا، تم کس کی عبادت کرتے تھے اور تم نے رسولوں کی کن کن باتوں پر عمل کیا؟ حدیث ابو ہریرہ میں آیا ہے کہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ من اسعد الناس بشفاعتک یا رسول اللہ۔ آپ نے فرمایا من قال لا الہ الا اللہ خالصاً من قلبہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شفاعت اہل اخلاص کے لیے ہوگی جنہوں نے کوئی شرک نہیں کیا۔ بخاری نے ابو ہریرہ سے جو روایت کی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں کہ شفاعتی لمن قال لا الہ الا اللہ مخلصاً یصدق قلبہ لسانہ ولسانہ قلبہ۔ اس کو امام احمد نے صحیح کہا ہے۔ مسلم نے جو روایت ابو ہریرہ سے کی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں:-

انی لختبات دعوتی شفاعت لامتی یوم القیامتہ فہی نائلۃ ان شاء اللہ، من  
مات لا یشرک باللہ شیئاً۔

شفاعت کے متعلق ان تین اصول کو سمجھ جانے کے بعد شرک کا استیصال ہو جاتا ہے۔ بالفاظِ دیگر جس نے یہ سمجھ لیا کہ شفاعت حق تعالیٰ ہی کے حکم و اجازت سے ہوگی اور اسی کے لیے ہوگی۔ جس کے قول و فعل کو وہ پسند کرتے ہوں گے اور وہی قول و فعل ان کو پسند ہوگا جو شرک و بدعت سے مٹ رہا اور توحید و سنت کے مطابق ہو تو اب وہ حق تعالیٰ کے سوا کسی کو اپنا شفیع کیسے ٹھہرا سکتا ہے اور مشرکین کی طرح هُوَ لَا یُشْفَعُ وَ نَاعِنْدَ اللّٰهِ کَا کَب قائل ہو سکتا ہے، حق تعالیٰ کو چھوڑ کر کسی اور کی طرف کس طرح اپنے قلب کو رجوع کر سکتا ہے، وہ جانتا ہے کہ انصاف ترین مخلوقات حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم بارگاہِ خداوندی میں سجدہ ریز ہونگے، اپنے رب، اپنے مولیٰ و مالک کی حمد و ثنا میں رطب اللسان ہونگے لیکن سجدہ سے سر نہ اٹھائینگے اور شفاعت کے لیے اس وقت تک زبان نہ کھولینگے جب تک کہ حق تعالیٰ کی اجازت نہ ہوگی کہ "قل تسمع و اشفع تشفع و سل تعطہ۔ پھر آپ نے تصریح فرمادی کہ فیحدلی حدًا، کہ میرے لیے ایک حد مقرر کر دی جائے گی یعنی آپ شفاعت ان ہی کی فرمائینگے جن کا قول و فعل حق تعالیٰ کو پسند ہوگا، یعنی جو شرک نہ ہوگا، جس نے صدق دل سے توحید الوہیت کا اقرار کیا ہوگا! اسی کی شفاعت کا اذن ہوگا اور اس کی شفاعت کی جائیگی اور اسی پر حق تعالیٰ رحم کرنا منظور فرمائینگے!! اسی کی بالاخر نجات ہوگی! جب اذن شفاعت دینے والے حق تعالیٰ ہی ہیں، اور قبول کرنے والے بھی وہی ہیں، مشفوع کہ کو ایسے کاموں کی توفیق دینے والے بھی وہی ہیں جس کی وجہ سے وہ مستحق شفاعت ٹھہرتا ہے تو پھر صاف ظاہر ہے کہ شفاعت درحقیقت حق تعالیٰ ہی کی طرف سے ہوتی ہے! قُلْ لِلّٰهِ الشَّفَاعَةُ جَمِیْعًا کے یہی معنی ہیں! یہی وجہ ہے کہ جس شخص نے اپنے اللہ ہی کو معبود ٹھہرایا، اسی کے لیے اذن شفاعت ہوگا، اور جس نے غیر اللہ کو معبود ٹھہرایا اس کی نہ کوئی شفاعت کریگا اور نہ کوئی شفاعت اس کے.....

لہ متفق علیہ کہہ سنا جائیگا۔ شفاعت کُقبول کی جائیگی۔ مانگ دیا جائیگا۔

لیے مفید ہوگی۔ ان ہی متخذین شفعاء کو مخاطب کر کے فرمایا گیا ہے: قُلْ اتَّبِعُونِ اللَّهَ يُمَا لَا يَعْلَمُ السَّمَاوَاتِ  
وَلَا فِي الْأَرْضِ شَيْئًا وَتَعَالَى عَمَّا يُشْرِكُونَ۔ یعنی کیا تم خدا کو ایسی چیز کی خبر دیتے ہو جو خدا کو معلوم نہیں  
نہ آسمانوں میں اور نہ زمین میں، وہ پاک اور برتر ہے ان لوگوں کے شرک سے (پس ۷۷) اس طرح ان  
کے افترا و شرک کو ظاہر فرما دیا!

نذر لغير الله | مشرکین کی عبادت کا ایک اور عمل جس پر پہلے مقالہ کے آخر میں بحث کرنی باقی ہے  
وہ ”نذر لغير الله“ ہے مشرکین اپنے مال کا ایک حصہ غیر اللہ کی نذر و نیاز کے لیے صرف کرتے تھے، ان کے  
لیے جانور ذبح کرتے تھے، اس طرح ان کی تعظیم و تکریم کرتے تھے: وَجَعَلُوا لِلَّهِ مِثْلَ ذَرَّاتِ الْحَبِّ  
وَالْأَنْعَامِ نَصِيبًا فَقَالُوا هَذَا لِلَّهِ بِزَعْمِهِمْ وَهَذَا لِشُرَكَائِنَا (پس ۳۷) اور اللہ تعالیٰ نے جو کھیتی اور مویشی  
پیدا کیے ہیں، ان لوگوں نے ان میں سے کچھ حصہ اللہ کا مقرر کیا اور بزعم خود کہتے ہیں کہ یہ تو اللہ کا  
ہے اور یہ ہمارے معبودوں کا ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے:

وَيَجْعَلُونَ لِمَا لَا يَعْلَمُونَ نَصِيبًا ۖ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّبِعُوْا مَا يَتَّبِعُوْنَ اٰبَآءَ وَاٰبَآءَ  
مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ تَاللّٰهِ لَنتَسَلَّنَّ مِنْهَا ۚ اِنْ كُنْتُمْ تَفْقَهُوْنَ (پس ۱۳۷) ان افترا پردازوں کی ضرور باز پرس ہوگی۔

حضرت شاہ عبدالقادرؒ ان آیات کی تفسیر میں صراحت فرماتے ہیں کہ کافر اپنی کھیتی اور  
مویشی کے بچوں میں اور تجارت میں سے اللہ کی نیاز نکالتے اور بتوں کی بھی نیاز نکالتے تھے جنہیں  
وہ اپنی جہالت اور بے خبری سے معبود، یا مالکِ نفع و ضرر سمجھتے تھے حق تعالیٰ ان کے اس ظلم  
اور بے انصافی اور افترا پردازی کی مذمت فرما رہے ہیں۔

نذر و نیاز کا رواج اسلام کی ”غربت“ کے اس زمانہ میں اس کثرت سے ہو گیا ہے کہ ہمیں یہاں  
اس کی تحقیق ضروری نظر آتی ہے۔ ہر زمانہ کے مشرکین کے قلوب میں ایک نمایاں تشابہ ہوتا ہے، وہ وہی  
بات کہتے ہیں اور وہی عمل کرتے ہیں جو ان سے پہلے گزرنے والے مشرکین نے کھی تھی اور اس پر عمل  
کیا تھا: كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِثْلَ قَوْلِهِمْ تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ (پس ۱۳۷)



نذر (نیاز) لغت میں وعدہ کرنا ہے نیکی کا ہو یا بدی کا اور شرع میں کسی عبادت کا لازم کر لینا ہے جو لازم نہیں تھی۔ نذرات نذراً اذا اوجبت علی نفسک شیئاً تبرعاً من عبادة او صدقة او غیر ذلک (ہنایہ) تمام فقہار نے اس امر کی تصریح کی ہے کہ نذر اللہ کی قربت اور عبادت ہے۔ چنانچہ قاضی حسین اور متولی اور رافعی، اور سوان کے دوسرے علماء شافعیہ اور زین الدین بن نجیم اور علامہ قاسم وغیرہ علمائے حنفیہ نے اپنی تصانیف میں اسی کی صراحت کی ہے اور

وَمَا تَفْقَهُمْ مِنْ نَفَقَةٍ اَوْ نَذْرٍ مِمَّنْ

اور تم لوگ جو کسی قسم کا خرچ کرتے ہو یا کسی طرح کی نذر

نذیراتِ اللہِ یَعْلَمُ (پت ۵۷) مانتے ہو تو حق تعالیٰ کو سب کی یقیناً اطلاع ہے۔

سے بھی یہی بات مندرجہ ہوئی ہے۔ چنانچہ تفسیر ابوالمسعود میں وضاحت کی گئی ہے کہ اوند تم، النذر عقد الضمیر علی شیء والتزام یعنی نذر دل میں کسی چیز کا ارادہ کرنا اور اس کو لازم کر لینا ہے۔

جب نذر عبادت ہوئی تو غیر اللہ کے لیے اس عبادت کا بجالانا شرعاً صریح شرک ہے۔ عوام الناس بزرگوں کی جو نذر و نیاز کرتے ہیں وہ حاجت برآری کے خیال ہی سے کرتے ہیں یا تو کسی مقصد کا حصول پیش نظر ہوتا ہے یا پھر کسی بلا کا ٹالنا، گویا اس طرح وہ ان بزرگوں کو رشوت دینا چاہتے ہیں، اس خیال سے تو حق تعالیٰ کی نذر بھی روا نہیں کہ وہ ذات مقدس بھی اخذ رشوت سے پاک ہے۔ چنانچہ حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لا تذروا فان النذر لا یغنی من القدر شیئاً وانما یستخرج به من البخیل (متفق علیہ) یعنی نذر نہ مانو اس لیے کہ نذر تقدیر کے نوشتے کو نہیں مٹا سکتی، اس کے ذریعہ تو فقط بخیل کا مال نکالا جاتا ہے۔ طیبی نے اس حدیث کی شرح میں وضاحت کر دی ہے کہ ”جس نذر سے روکا گیا ہے وہ نذر مقید ہے جس کا لٹنے والا یہ خیال کرتا ہے کہ وہ تقدیر کے لکھے سے بچا لیتی ہے، جیسا کہ بہت لوگوں نے سمجھ رکھا ہے اور ہم اپنے زمانہ کی کتنی جماعتوں کو اسی اعتقاد پر پلتے ہیں۔“

غرض عوام جو بزرگوں کی نذر کرتے ہیں ان سے پوچھنا چاہیے کہ تمہاری اس نذر کا مقصد کیا ہے؟

۱۷۹ مقابلہ کر و شامی ج ۲ ص ۱۳۹، والنذر للمخلوق لا یجوز لانه عبادة والعبادة لا تكون للمخلوق۔

۱۔ تقرب اور عبادت؟ یہ تو صریحاً شرک ہے۔

۲۔ مقصود یابی اور حاجت براری؟ یہ بھی شرک و حرمت دونوں پر مشتمل ہے۔

۳۔ ایصالِ ثواب؟ ہاں یہ جائز ہے، لیکن یہاں نیت کی تصحیح سخت ضروری ہے، غور کرو،

تمہیں خود اپنی نجات کی فکر کرنی چاہیے، خود ثواب کمانے پر مائل ہونا چاہیے اس کو چھوڑ کر تمہیں

دوسروں کو ثواب پہنچانے کی فکر زیادہ دامن گیر معلوم ہوتی ہے اور پھر تمہارے آباؤ اجداد اس امر کے

زیادہ مستحق ہیں کہ تم انہیں ثواب پہنچاؤ، اس کا تم کو زیادہ خیال نہیں ہوتا، پیروں اور شہیدوں

کی نیاز اور فاتحہ التزام کے ساتھ کرتے ہو، ذرا اپنے قلب کی طرف ایمان کی روشنی میں دیکھو، کیا

تمہاری غرض یہ تو نہیں کہ ایسا کرنے سے تمہارے مال میں برکت ہوگی، بال بچے تندرست اور

عافیت سے رہینگے، تجارت میں خسارہ نہ ہوگا، زمانہ کے لکد کو ب سے نجات ملیگی یا اگر تم اس غرض

سے نذر و نیاز بزرگوں کی کیا کرتے ہو (مثلاً حضرت پیر کی گیارہویں یا کندوری دسترخوان یا سمرنی

تو مشرک کی طرح تم ان بزرگوں کو اپنا محبوب بنا رہے ہو، ان کو نفع و ضرر کا مالک سمجھ رہے ہو، اور یہ

کھلا شرک ہے! اس کی تصریح قرآن و حدیث سے اوپر تفصیل کے ساتھ کی گئی ہے۔ علامہ قائم شراح

درر کے اس بیان پر غور کرو۔

المنذر الذی ینذرہ اکثر العوام کان یقول یا سیدی فلان یعنی بدولیتا ونبیاً ان ردغائبی

او عوفی مرضی او قضیت حاجتی فلك من الذهب او الفضة او الطعام والشراب او الزيت کذا

فہذا باطل بالاجماع لان نذر مخلوق وھو لا یجوز، لان النذر عبادة و العبادۃ لا یكون لمخلوق

و المنذر دلہمیت و المیت لا یملك و انان ظن ان المیت یتصرف فی الامر کفر الا ان قال: یا اللہ

انی نذرت لک ان فعلت معی کذا ان اطعم الفقراء الذین بیاب السدۃ النفیسة او الامام

الشافعی و نحوہ فیجوز حیث یکون فیہ نفعاً للفقراء و المنذر اللہ۔

یعنی وہ نذر جو عوام الناس کرتے ہیں مثلاً کہتے ہیں کہ اے میرے بزرگ (کسی ولی یا نبی) کو مخاطب

کر کے، اگر میرا غائب واپس آجائے یا بیمار اچھا ہو جائے، یا میری حاجت برائے تو آپ کے لیے اتنا سونا

یا چاندی یا طعام و شربت یا تیل بطور نذر پیش کر ڈنگا۔ سو یہ باطل ہے بالاجملع، اس لیے کہ یہ مخلوق کی نذر ہے اور یہ جائز نہیں کیونکہ نذر عبادت ہے اور عبادت مخلوق کی روا نہیں، جس کے لیے نذر مانی ہے وہ میت ہے اور میت کسی چیز کا مالک نہیں، اور اگر اس کے ساتھ ساتھ وہ نذر مانتے والا بھی خیال کرے کہ میت کو کاموں میں اختیار حاصل ہے تو وہ کافر ہو جائے۔ ہاں اگر وہ یہ کہے کہ ”یا اللہ میں نے تیری نذر کی کہ اگر تو میرے ساتھ یہ معاملہ کرے تو میں سدہ نفیسہ والے فقیروں کو کھانا کھلاؤنگا، یا امام شافعیؒ کے دروازے والوں کو کھانا دوںگا“ تو یہ جائز ہے کیونکہ اس میں نفع ہے فقروں کا اور نذر ہے اللہ عزوجل کی۔“

دیکھو اس بیان کا تجزیہ کرنے سے مندرجہ ذیل امور واضح طور پر پیش ہو جاتے ہیں۔

۱۔ عوام کا لانعام جو نذر اپنے ہیروں بزرگوں کی حاجت براری کی خاطر کرتے ہیں وہ بالاجملع باطل ہے اور قطعاً شرک ہے، کیونکہ

۲۔ مخلوق کی نذر کسی معنی میں جائز نہیں اس لیے کہ وہ عبادت ہے اور سوائے خالق کے کسی کے لیے روا نہیں۔

۳۔ عوام کی غرض بزرگوں کی نذر و نیاز سے یہی ہوتی ہے کہ آفات و بلیات سے وہ محفوظ رہیں، مال و دولت میں اضافہ ہو، صحت و عافیت حاصل ہو، اگر وہ زبان سے اس امر کا اقرار بھی کریں کہ ہمیں صرف ایصالِ ثواب ہی منظور ہے تو بھی وہ اپنے نفس کو دھوکہ دے رہے ہیں، انہیں ایمانداری کے ساتھ اپنے نفس کا محاسبہ کرنا چاہیے۔

۴۔ یہ بھی کہنا درست نہیں کہ یہ فلاں ولی یا نبی کی نذر ہے بلکہ انہیں یہ کہتا چاہیے کہ یہ اللہ کی ہے اور ثواب اس کا فلاں کو پہنچے۔

اس سلسلہ میں یہ بھی یاد رکھنا ضروری ہے کہ کسی نبی یا ولی کی نذر مانی بھی جائے تو وہ منعقد نہیں ہوتی کیونکہ لاؤفاء لنذر فی معصیتہ یعنی نذر معصیت کی وفا ضروری نہیں۔ اور ظاہر ہے

۱۔ یہ حدیث مسلم بن عمران بن حصین سے مرفوعاً مروی ہے۔

کہ عبادت غیر اللہ معصیت ہے اور نذر منجملہ عبادات ہے۔ ام المؤمنین حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ من نذر ان یطیع اللہ فلیطعہ ومن نذر ان یعصیہ فلا یعصیہ جس نے اللہ کی اطاعت کی نذر کی اس کو چاہیے کہ اطاعت کرے اپنی نذر پوری کرے اور جو اللہ کی نافرمانی کی نذر کرے وہ نافرمانی نہ کرے۔

توحید الوہیت کی جو تفصیل اوپر پیش کی گئی اس کا خلاصہ صرف اتنا ہے کہ دعوتی کلمہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی رو سے اللہ تعالیٰ ہی ہمارے الہ قرار پاتے ہیں، اللہ کے معنی ہیں مجبور و رب، یعنی اللہ تعالیٰ ہی ہمارے مجبور ہیں اور ہمارے رب، اللہ تعالیٰ کے سوا ہمارا نہ کوئی مجبور اور نہ کوئی رب یا مستعان۔ توحید الوہیت میں یہی "توحید معبودیت" و "توحید ربوبیت" شامل و داخل ہیں۔ شرک واقع ہوتا ہے عبادت و استعانت ہی کی راہ سے یعنی اگر غیر اللہ کی عبادت کی جائے، یا اس سے استعانت کی جائے تو شرک پیدا ہوتا ہے۔ دیکھو قُلْ اِنَّمَا هُوَ الْوَّاحِدُ وَ اِنِّیْ بَرِّیْ مِمَّا تُشْرِكُوْنَ (پ ۸۶) سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ شرک الوہیت ہی کی راہ سے پیدا ہوتا ہے و اعبدوا اللہ ولا تشركوا به شیئا سے معلوم ہوتا ہے کہ غیر اللہ کی عبادت شرک ہے اور قُلْ اِنَّمَا ادعوا ربی ولا اشرك به احدا سے واضح ہوتا ہے غیر اللہ کو پکارنا (دعا و ندا) شرک ہے ایاک نعبد و ایاک نستعین کی تعلیم دے کر عبادت و استعانت کو بطریق حصر حق تعالیٰ ہی کے لیے مخصوص کر دیا گیا اور اس طرح توحید الوہیت کی کامل حفاظت کر دی گئی۔

توحید الوہیت کے اس معنی کو پیش نظر رکھ کر مشرکین عرب کی عبادت پر غور کیا گیا تو معلوم ہوا کہ یہ اپنے صننام و اوثان (غیر اللہ) کو مقرب و ضفیج جان کر ان سے وقت حاجت فرما دے یہ چاہتے تھے اور اپنے مال کا ایک حصہ ان کی نذر و نیاز کے لیے صرف کرتے تھے۔ قرآن کریم اور احادیث صحیحہ کی روشنی میں بتلایا گیا کہ استغاثہ استعانت، دعا و ندا، نذر و نیاز سب افعال عبادت ہیں۔ لہذا ان افعال کا تعلق صرف حق تعالیٰ ہی سے ہونا چاہیے مشرکین نے ان کا تعلق غیر اللہ سے روارکھا تھا اسی لیے انہیں تہدید کی گئی کہ قُلْ اَتَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ پس ان کا شرک بھی

غیر اللہ کی عبادت اور اس سے استعانت کے سوا کچھ نہیں تھا۔ وہ حق تعالیٰ کے وجود کے منکر نہ تھے اور نہ ان کی ذات ہی میں کسی غیر کو شریک کرتے تھے۔

غیر اللہ کی عبادت ہی شرکِ محض اور کفرِ بحت ہے، یہ شرکِ اکبر انسان کے خون و مال کو حلال کر دیتا ہے اور اس کو "مخلد فی النار" بنا دیتا ہے، جب کسی کے کانوں تک توحید کی دعوت پہنچ چکی اور اس پر حجت کا قیام ہو گیا اور اس کے باوجود وہ شرک پر جا رہا اور کفر کا اعلان کرتا رہا تو وہ کافر مشرک ہو گیا، اب اس کی نجات کی کوئی صورت اس کے سوا نہیں کہ وہ کفر و شرک سے توبہ کرے اور توحید پر ایمان لائے اور اگر نام کا مسلمان ہے تو تجدیدِ اسلام کرے۔

احادیثِ نبویہ میں کلمہ توحید کے چند فیود و شرائط بیان کیے گئے ہیں، مثلاً کسی قسم کا شبہ الوہیتِ الہی میں نہ کرے، متکبر نہ بنے، جائز نہ ہو، یہ کلمہ اس کو گناہوں سے روکے وغیرہ۔ انسان حیبان پر غور کرتا ہے تو اس کو اپنی ہلاکت کا خوف پیدا ہوتا ہے۔ پھر ان لوگوں کا کیا ذکر جو غیر اللہ کی عبادت بجالا کر کھلے شرک و کفر میں مبتلا ہیں۔ ائمہ اربعہ نے تارکِ صلوٰۃ، مانعِ زکوٰۃ، یا تارکِ اذان یا نمازِ عید سے قتال کرنا واجب قرار دیا ہے کیونکہ یہ شعائرِ اسلام ہیں، پھر اہل شرک و کفر سے قتال کا کیا ذکر بعض نے تو اس پر اجماع بھی نقل کیا ہے۔ جب نماز، روزہ، حج یا زکوٰۃ کے ترک کرنے سے کفر لازم آتا ہے تو ترکِ توحید و اخلاص سے کس طرح شرک لازم نہیں آئے گا۔ امرت ان اقاتل الناس حتی یشہدوا ان لا الہ الا اللہ وان محمد رسول اللہ ویقیموا الصلوٰۃ ویؤتوا الزکوٰۃ فاذا فعلوا ذلك عصموا منی دماءہم واموالہم الا بحق الاسلام وحسابہم علی اللہ!

مقالہ کے دوران میں جو آیتیں شرک و کفر کے رد میں پیش کی گئیں ان کو عجب ہی کے مشرکین و کفار اور عابدینِ اصنام و اوثان کے حق میں سمجھنا غلطی ہے۔ ان کا اطلاق ہر زمانہ کے مشرکین پر ہوتا ہے، ہر زمانہ کے مشرکوں کے درمیان ایک ہی امر جامع مناسبت ہے اور وہ شرک باللہ ہے لہذا حکم ایک ہی ہو گا کیونکہ جامع موجود ہے اور فارق معدوم، چنانچہ اصولِ فقہ کا قاعدہ بھی یہی ہے کہ العبرة

لہ اسی کو پیش نظر رکھ کر شاید اقبال نے کہا ہے یہ چو می گویم مسلمانم بلزوم بہ کہ دانم مشکلات لا الہ الا اللہ (ارمغان حجاز)



بعموم الا لفاظ لا بخصوص الموارد یعنی اعتبار عموم لفظ کا ہوتا ہے نہ کہ خصوص سبب کا اس کے احکام شرعیہ کا مدار اسی اصول پر ہے اور حدیث میں صراحت کی گئی ہے کہ حکمی علی الواحد حکمی علی الجماعۃ اس کے انکار سے یہ بات لازم آئیگی کہ جو حکم کسی خاص سبب کی بنا پر کسی گزشتہ واقعہ کے سلسلہ میں نازل ہوا ہے وہ اسی کی حد تک محدود ہے اور مستعدی نہیں، یہ قطعاً باطل ہے۔ اس سے احکام شرعیہ کا تعطل لازم آتا ہے۔ کیونکہ جتنی آیات حدود جنایات و مواریث ہیں وہ سب خاص خاص واقعات ہی کے سلسلہ میں نازل ہوئی ہیں لیکن ان کا حکم عام ہے اور قیامت تک باقی ہے۔ چنانچہ ابن عباسؓ نے ان آیات کی بابت جو بنی اسرائیل کے حق میں اتری ہیں فرمایا تھا: فَإِنزَلْنَا عَلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ وَأَنذَرْنَا مَثَلَهُمْ وَمَا أَشْبَهَ اللَّيْلَةَ بِالْبَارِحَةِ۔ اسی چیز کی طرف توجہ مبذول کرتے ہوئے کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ نَعْمَ الْاِخْوَةَ بَنِي إِسْرَائِيلَ إِذْ كَانَ كُلُّ حَلْوَةٍ لَكُمْ وَكُلُّ مَرَّةٍ لَهُمْ اور ائمہ ثلاثہ نے تو اس امر کی صراحت کر دی ہے کہ شرائع ماقبل ہمارے لیے بھی شرع ہیں اور امام شافعیؒ بھی اسی اصول کو تسلیم کرتے ہیں، لیکن اسی صورت میں جب کہ اس کی توضیح ہماری شرع میں بھی آچکی ہو۔ اب ہمارے شرعیہ نے بھی ان مسائل کی توضیح کر دی ہے۔ اور کتاب و سنت ان پر ناطق ہیں۔ ان کا تعلق اہم سابقہ اور مشرکین عرب ہی کے ساتھ سمجھنا کس قدر فاحش غلطی ہے۔

پھر ذرا غور تو کرو کہ جس چیز سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرکین عرب کو منع فرمایا، خلافت ورزی پر ان سے مقاتلہ فرمایا، جس پر قرآن مبین نازل ہوا وہ شرک ہی تو تھا اور کفر، ان کے متعلق ساری آیتیں محکم ہیں اور غیر منسوخ، اول و آخر ہر ایک کے لیے یکساں ہیں، علاوہ ازیں قرآن کریم میں ایسی آیتیں بھی ہیں جو خاص انبیاء بلکہ افضل انبیاء اور مومنین کے حق میں اتری ہیں ان میں شرک کو مجباً اعمال قرار دیا گیا ہے۔ سورہ انعام میں اٹھارہ پیغمبروں کے نام لے کر ارشاد ہوتا ہے کہ وَلَوْ أَشْرَكُوا لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ، کسی جگہ خطاب حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہوتا ہے يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّبِعُوا سُبُلَ الَّذِينَ كَفَرُوا سُبُلَهُمْ لِيُبْطَلُوا بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ اور يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّبِعُوا سُبُلَ الَّذِينَ كَفَرُوا سُبُلَهُمْ لِيُبْطَلُوا بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ۔ ایک جگہ اہل ایمان کے متعلق خبر دی گئی ہے کہ وَمَا يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُمْ بِاللَّهِ إِلَّا وَهُمْ مُشْرِكُونَ!

ہمکے اس زمانہ کے مومن مشرک بھجوائے حدیث لتتبعن سنن من قبلکم اپنے پیشرو مشرکین  
 عرب اور یہود و نصاریٰ کے نقش قدم پر "توحید الوہیت" ہی کا انکار کر رہے ہیں یعنی وہ اس امر کے  
 قائل نہیں رہے کہ حق تعالیٰ کے سوا اور کوئی لائق دعا و عبادت، خوف ورجا، استغاثت و استغاثہ  
 نہیں جس کے لیے جان و ذبح کیا جائے یا نذر مانی جائے بلکہ ان کا عقیدہ یہ ہو گیا ہے کہ حق تعالیٰ  
 کے سوا ان کے انبیاء و اولیاء بھی شائد و مصائب و آفات و بلیات میں ان کی فریاد سن کر، ان  
 کی حالت سے مطلع اور واقف ہو کر ان کی مدد کر سکتے ہیں، کشف ضرر کر سکتے ہیں۔

اسی لیے ان کے اہل علم و فضل بھی اس کی علی الاعلان تعلیم کرنے لگے ہیں کہ حالتِ درود  
 مصیبت میں پکارنا چاہیے، حضرت معروف کرخیؒ کو، حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کو، حضرت سالار  
 مسعود غازیؒ کو، حضرت شاہ بدیع الدین مدار کو، حضرت شیخ معین الدین چشتیؒ کو، حضرت قطب  
 الدین کاکئیؒ کو، اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ ان کے جاہل اور عالم دونوں غیر اللہ سے اس طرح استغاثت  
 ہر مصیبت کے وقت کرتے ہیں، ان کے لیے مرغ، بکری، گائے ذبح کرتے ہیں، نذر و نیاز لاتے  
 ہیں۔ منت مانگتے ہیں، چرغ روشن کرتے ہیں، ان کی قبروں کا طواف کرتے ہیں، سجدہ کرتے  
 ہیں۔ وہ ان بزرگوں کو اپنے پیش روؤں کی طرح اللہ کی ذات میں شریک نہیں کرتے بلکہ ان کو اللہ  
 کا مملوک و محکوم ہی مانتے ہیں، اللہ ہی کو حاکم و مالک و رب سمجھتے ہیں، مستقل معبود اللہ ہی کو جانتے  
 ہیں اور اپنے ان بزرگوں کو اللہ ہی کی ملک سمجھتے ہیں۔ لیکن پھر اپنے پیشروؤں کی طرح ان کا عقیدہ  
 یہ ہے کہ ان کے یہ بزرگ، صلحاء، مقرب الہی ہیں وہ ان کی نذر و نیاز، ان سے دعا و التجا و استغاثہ  
 اس لیے کرتے ہیں کہ ان کی وجاہت و شفاعت و قرب سے اللہ کے غصے اور خفگی و ناراضی سے  
 نجات پا کر قرب حاصل کر لیں۔

اس مختصر مقالہ میں یہ بتلانے کی کوشش کی گئی ہے کہ بعینہ ہی عقیدہ "شُرک فی اللوہیت"  
 ہے۔ یہی مذہب الجہل اور البولہب کا ہے سوا، لبوا، حضرت عیسیٰؑ و حضرت عزیرؑ و ملائکہ و انبیاء کے  
 پکارنے والے بعینہ اسی مسلک پر قدم زن تھے۔ کما قال اللہ تعالیٰ: وَالَّذِينَ اخَذُوا مِنْ دُونِهِ اَوْلِيَاءَ

مَا تَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَا إِلَى اللَّهِ زُلْفَىٰ - وَقَوْلُهُ تَعَالَىٰ: وَيَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَنْصُرُهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَيَقُولُونَ هَؤُلَاءِ شُفَعَاءُنَا عِنْدَ اللَّهِ!

محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم (فداہ الی وامی) نے دین حق کا پیغام لا الہ الا اللہ پیش فرما کر افرادِ عبادت اللہ کی طرف دعوت دی، ساری عبادت کو اللہ ہی کے لیے منحصر کر دیا خواہ استغانت ہو یا استغاثہ، ذبح ہو یا نذر، دعا ہو یا عکوف، طواف ہو یا کوئی عبادت، قلبی ہو یا قالیبی، مشرکین نے جن وسائل کو تقرب الی اللہ کا وسیلہ قرار دیا تھا ان کی نفی فرمائی، وضاحت فرمادی کہ توسط ان اولیاء وانبیاء و شہداء و ملائکہ کا اس اعتقادِ فاسد و زعم کا سد کے ساتھ کہ وہ ان کی شفاعت کریں گے، بغیر اذن و مرضی حق کے کارآمد نہیں ہوگا، جو چیز کہ نفع دے گی وہ یہی عبادتِ خالص و توحیدِ مفرد ہوگی جو کلمہ اشہد ان لا الہ الا اللہ و اشہد ان محمد عبده و رسوله ثابت ہے، جو شخص اس کلمہ کے معنی پر چلا، اس کے مقضیٰ پر عمل کیا، وہی مومن موحداور محسنِ مخلص کہلایا اور جس کا قول و فعل حال و خیال اس کے معنی و مقضیٰ کے خلاف ہو اوہ مشرک کا فر ہو یا مبتدع ضال!

قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِن كُنْتُمْ فِي شَكٍّ مِّن دِينِي فَلَا أَعْبُدُ الَّذِينَ تَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ وَلَكِن أَعْبُدُ اللَّهَ الَّذِي يَتَوَقَّكُمْ وَأُهِرْتُ أَنْ أَكُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ وَأَنْ أَقِمَّ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا وَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۚ وَلَا تَدْعُ مِن دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَنْفَعُكَ لَا يَضُرُّكَ فَإِن كُنْتَ إِذَا مِّنَ الظَّالِمِينَ ۚ وَإِن يَمَسُّكَ اللَّهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهُ إِلَّا هُوَ ۚ وَإِن يُرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَادَ لِفَضْلِهِ يُصِيبُ بِهِ مَن يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ وَهُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ ۚ قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمُ الْحَقُّ مِن رَّبِّكُمْ ۖ فَمَنِ اهْتَدَىٰ فَإِنَّمَا يَهْتَدِي لِنَفْسِهِ ۚ وَمَن ضَلَّ فَإِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا وَمَا أَنَا عَلَيْكُمْ بِوَكِيلٍ ۚ وَاتَّبِعْ مَا يُوحَىٰ إِلَيْكَ وَاصْبِرْ حَتَّىٰ يَحْكُمَ اللَّهُ ۚ وَهُوَ خَيْرُ الْحَاكِمِينَ ۚ

# صَالِحِيَّتْ

”إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ

لَنُدْخِلَنَّهُمْ فِي الصَّالِحِينَ“ (پہا ۱)

راہِ خدا کے مسافر، طریقِ طلب اور راہِ سفر کے لحاظ سے دو قسم کے ہوتے ہیں (۱) اصحابِ بحث و افکار جنہیں حکماء و عقلاء کہا جاتا ہے، اور (۲) اصحابِ کشف و ابصار جو عرفا و اولیاء کہلاتے ہیں۔ اہل بحث و نظر مقدمات کی ترکیب، دلائل و برہان کی تقریر، اور نظر و استدلال سے حقائق کا علم حاصل کرتے ہیں۔ وہ ممکن کے وجود سے واجب کے وجود پر استدلال کرتے ہیں، مصنوعات سے صانع کا، مخلوقات سے خالق کا پتہ لگاتے ہیں۔ یہ حکماء و متکلمین کی جماعت ہے۔ ان کا طریقہ گو محمود ہے، لیکن نظر و استدلال کا انجام حیرتِ مذموم کے سوا کیا ہو سکتا ہے؟ ان کی حیرت کو ”حیرتِ نظائر“ سے تعبیر کیا گیا ہے، جو تصادمِ شکوک و تعارضِ دلائل کا نتیجہ ہوتی ہے جو یقیناً مذموم ہے اس کے برخلاف اصحابِ کشف و ابصار بھی ایک قسم کی حیرت میں مبتلا ہوتے ہیں، جس کو حیرتِ اولیٰ الالبصار کہا جاتا ہے، لیکن یہ نتیجہ ہوتا ہے مشاہدہ و وحدانیت والوہیت کا، آثار و عجائب ربوبیت کا، تو الٰہی تجلیات کا، اور یہ حیرت محمود ہے۔ ”رَبِّ زِدْنِي فِيمَا كُنْتُ خَيْرًا“ کی دعا، اسی حیرتِ محمودہ کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

جب اسلام کے نام لیوا حکماء و متکلمین، فلاسفہ یونان کے اتباع میں انبیاءِ علیہم السلام کے عقائد سے اختلاف کرنے لگتے ہیں تو وہ بقول شاہ ولی اللہ قدس سرہ کثوں سے بھی بدتر ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ کتے بھی پرانی ہڈیوں کو نہیں سونگھتے، اور یہ احمق دو ہزار سال کی پرانی ہڈیوں کو اب تک جھنجھوڑنے میں لگے ہیں! ان کی ضلالت و گمراہی کا سبب ان کی ”عقلِ ناقص“ کے سوا کچھ نہیں۔

وَفَرِحُوا بِمَا عِنْدَهُمْ مِنَ الْعِلْمِ

مصطفیٰ اندر جہاں انگہ کسے گوید ز عقل آفتاب اندر فلک انگہ کسے جوید سہما

اہل کشف و بصیرت وہ ہیں جو تصفیہ باطن، تخلیہ تخمیل، کمال قبیل، اور دوام توجہ سے منتہا کے مقصود کو پہنچتے ہیں "وہو الوصول الی معرفۃ اللہ و لقاءہ" انہیں صراطِ مستقیم کے جادہ پیمانہ کہا جاتا ہے، اور یہی طریقہ تمام انبیاء علیہم السلام کا ہے، اور ان میں سب سے زیادہ کامل ملتِ حنیفیہ و دینِ مصطفوی ہے (صلوات اللہ علیہ و علیہم اجمعین) یہ گروہ مقدس ان ہستیوں پر مشتمل ہوتا ہے جن کی خود حق تعالیٰ نے ثنا کی ہے (مُحَمَّدٌ وَ مَحَبَّتُهُ) اور حضرت الوہیت سے ان کی تائید کی جاتی ہے (أَوْلِيَاكَ كَتَبَ فِي قُلُوبِهِمُ الْإِيمَانَ وَأَيَّدَهُم بِرُوحٍ مِنْهُ) یہ خدائے لم یزل و لایزال کے پسندیدہ بندوں کا طبقہ ہے (رضی اللہ عنہم و رضوانہ) یہ اپنے خالق کے وجود کا ادراک مقدماتِ عقلیہ قائم کیے بغیر کہتے ہیں، اور حق کو نورِ حق ہی سے پہچانتے ہیں (أَنْسَنَ شَرَحَ اللَّهُ صَدْرَهُ لِلْإِسْلَامِ فَهُوَ عَلَى نُورٍ مِّنْ رَبِّهِ) انہیں نظر و استدلال کی حاجت نہیں ہوتی! بینا کوزنگوں کے ادراک میں نظری دلیلوں سے کام لینے کی کب ضرورت ہوتی ہے (إِنِّي اللَّهُ شَآئِكُ فَاطِرِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ) چنانچہ کسی نے حضرت جنتید سے پوچھا کہ وجودِ صانع پر تمہاری کیا دلیل ہے، تو آپ نے جواب میں ارشاد فرمایا: لَقَدْ اغْتَنَى الصَّبَاحُ عَنِ اللَّصْبَاحِ "مجھے دن کی روشنی لے چرخ کی روشنی کا محتاج نہیں رکھا ہے

حق راز حق شناس نہ از محبت قیاس خورشید را چہ حاجت شمع است و مشعلہ (باتمی)

یہ مقدس ہستیاں درجہ کمال پر فائز ہوتی ہیں، انہیں مکتب خانہ و علمناہ من لدنا علمک سے سبق ملتا ہے، یہ شکوک و اوہام سے آزاد ہوتی ہیں اور انبیاء علیہم السلام کے علوم کی وارث۔ ان کی تعریف میں کسی نے کیا خوب کہا ہے: ہ

آہنا کہ ربودہ الست اند از عمد الست باز مستند

در منزل درد بستہ پابند درد ادن جاں کشادہ دستند

چالاک روند پس بیک گام از جوئی حدود باز جتند



فانی زخود و بدوست باقی      این طرفہ کہ نیستند و ہستند

این طائفہ انداہلِ توحید      باقی ہمہ خویشتن پرستند

یہ بزرگ ہستیاں طہارتِ فطرت پر ہوتی ہیں، دریا کے توحید میں غرق ہوتی ہیں، خلق نے جو کچھ حکایتِ سنا کر وہ اپنی بصیرت کے نور سے دیکھتی ہیں، خلق کے لیے جو "غیب" ہے، ان کے لیے "شہادت" ہے۔ چنانچہ عارفِ رومی نے ان کے اس کمال کی طرف یوں اشارہ کیا ہے:

دفرِ صوفی سوادِ حرفِ نیست      جزدلِ اسپید، پچو برفِ نیست

زادِ دانشمند آثارِ مسلم      زادِ صوفی چسیت اسرارِ قدم

انچہ تو در آئینہ بنی عیاں      پیر اندر خشتِ بند پیش ازاں

در دلِ انگور می را دیدہ اند      در فنا محض شی را دیدہ اند

لیکن ایسی ہستیاں کم ہوتی ہیں، اور ان کی شناخت بھی آسان نہیں ہوتی، وہ گم نام ہوتی ہیں، اور زاویہ گناہی میں اپنی زندگی بسر کرتی ہیں۔ ہماری یہ خوش قسمتی ہے کہ ایک ایسی صاحبِ کمال ہستی سے اخذ فیض کا ہمیں کچھ موقع مل گیا، یہ محض فضلِ یزدانی و موہبتِ ربانی ہے کہ ہم ان کے کچھ ارشاداتِ عالیہ کو یہاں پیش کرنے کے قابل ہو گئے ہیں۔ ان ارشادات کا تعلق مرتبہ صحیحیت سے ہے۔

حق تعالیٰ نے صاحبین کے دو وصف بیان فرمائے ہیں۔ ایمان و عملِ صالح۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَنُدْخِلَنَّهُمْ فِي الصَّالِحِينَ (۲۹-۱۰۶)

ایمان اور اللہ والا اللہ محمد رسول اللہ کی دل سے تصدیق اور زبان سے اقرار کا نام ہے۔ ذاتِ اللہ ہی کو اللہ قرار دینا، یعنی معبود و مستعان قرار دینا، زبان سے اقرار اور دل سے اس کی تصدیق کرنا توحید ہے، توحید ایمانی ہے۔ اس اقرار و تصدیق سے قلب سے شرک کا خروج ہوتا ہے، اور توحید داخل ہوتی ہے! جس ذاتِ پاک نے یہ پیغام ہم تک پہنچایا (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اس کی رسالت کے اقرار و تصدیق سے دل سے کفر نکلتا ہے، اور ایمان جلوہ افروز ہوتا ہے۔

ایمان میں دو چیزیں ہیں، اور توحید میں بھی دو چیزیں ہیں۔ ایمان میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی

رسالت اور صرف اللہ وحدہ لا شریک لہ کی الوہیت کی تصدیق ہے۔ توحید میں حق تعالیٰ کی معبودیت اور بوبیت اور ان کے ماتحت بندہ کی عبادت و استعانت کی تصدیق داخل ہے۔

اس کا زبان سے اقرار اور دل سے انکار یا شک "نفاق" ہے، جس کا نتیجہ ابدی جہنم ہے۔  
 "وَعَدَا اللَّهُ الْمُنَافِقِينَ وَالْمُنَافِقَاتُ وَالْكُفَّارَاتُ نَارُ جَهَنَّمَ خَالِدَاتٍ فِيهَا" (پ ۶ ع ۹)

اس کی تصدیق کے بعد انکار ارتداد ہے جس کا نتیجہ خلود نارا و جہنم اعمال ہے۔

وَمَنْ يَرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَن دِينِهِ فَمَا لِي بِهِ مِنْ عَمَلٍ سَعِدٍ  
 الدنیا والآخرہ واولئک اصحاب النار ہم فیہا خالدون (پ ۶ ع ۲۴)

ارتداد شرک کی طرح دین و مذہب کی نفی ہے، بغاوت ہے اور اس لیے ناقابلِ معافی!

کفر و شرک، نفاق و ارتداد بڑے جرائم ہیں، سخت گندگی و نجاست ہیں۔ ان سے قلب کی تطہیر ضروری ہے۔ یہ تطہیر ان سے توبہ اور لا الہ الا اللہ کے اقرار و تصدیق ہی سے ہو سکتی ہے۔ یہی وہ علم ہے جس کو تمام انبیاء علیہم السلام نے حضرت آدم (علیہ السلام) سے لے کر نبی آخر الزماں (علیہ الصلوٰۃ والسلام) تک پیش کیا ہے اور دعا کی ہے کہ:-

"اللّٰهُمَّ تَوْفِنَا مُسْلِمِينَ وَالْحَقْنَآ بِالصّٰلِحِيْنَ غَيْرِ خَزَايَا وَلَا مُفْتَوْنِيْنَ"

ایمان محض تصدیق قلب کا نام ہے، اور اعمال جوارح اس میں داخل نہیں ہیں۔ امور ذیل پر غور کرنے سے یہ امر روز روشن کی طرح ظاہر ہو جاتا ہے۔

(۱) ایمان لغت میں تصدیق یا سچ ماننے کو کہتے ہیں۔ حق تعالیٰ برادران یوسف علیہ السلام کی زبان سے فرماتے ہیں:-

وَمَا اَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا وَلَوْ كُنَّا  
 صٰدِقِيْنَ ۝  
 گو ہم سچ ہی کیوں نہ کہتے ہوں آپ کو تو ہماری بات کا  
 یقین آنے کا نہیں

(۲) خود حق تعالیٰ ایمان کو فعل قلب قرار دیتے ہیں:-

مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْ بَعْدِ اِيْمَانِهٖ اِلَّا  
 (جو شخص کفر پر مجبور کیا جائے) مگر اس کا دل ایمان کی طرف

مَنْ أَكْفَرَهُ وَقَلْبُهُ مُطْمَئِنٌّ بِالْإِيمَانِ  
 وَلَكِنْ مَنْ شَرَحَ بِالْكَفْرِ صَدْرًا  
 فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللَّهِ وَ لَهُمْ  
 عَذَابٌ عَظِيمٌ (پ ۲۰ ع ۲۰)

سے مطمئن ہو (اس سے کچھ مواخذہ نہیں) لیکن جو شخص  
 ایمان لائے پیچھے کفر کرے، اور کفر کرے بھی توجی کھول  
 کر، تو ایسے لوگوں پر خدا کا غضب ہوگا، اور ان پر  
 سخت عذاب ہوگا۔

یہاں قلب کو ظرفِ ایمان قرار دیا جا رہا ہے اور ایسے شخص کو کفار کے زمرہ میں سے نکال لیا جا رہا  
 ہے جو جبر و اکراہ کے سبب اعمالِ ظاہری کی پابندی کو چھوڑ دیتا ہے، مگر دل سے مسلمان ہے۔ اور موردِ  
 غضب خداوندی وہی شخص قرار دیا جا رہا ہے جس کے دل نے خوشی سے کفر کو قبول کر لیا ہے۔  
 (۳) قرآن کریم میں اکثر جگہ اعمالِ نیک کی جزا اور ثواب کے لیے ایمان کو شرط ٹھہرایا گیا ہے،  
 ظاہر ہے کہ شرطِ مشروط سے خارج ہوتی ہے، اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اعمالِ ایمان میں داخل  
 نہیں ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے :-

وَمَنْ يَعْمَلْ مِنَ الصَّالِحَاتِ مِّنْ ذَكَرٍ أَوْ  
 أَنْثَىٰ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُولَٰئِكَ يَدْخُلُونَ  
 الْجَنَّةَ وَلَا يُظَلَّمُونَ فِيهَا (پ ۱۸۶ ع ۱۸۶)

جو شخص کوئی نیک کام کریگا خواہ وہ مرد ہو یا عورت  
 بشرطیکہ وہ مومن ہو، سو ایسے لوگ جنت میں داخل  
 ہوں گے، اور ان پر ذرا بھی ظلم نہ ہوگا۔

وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ أَوْ أَنْثَىٰ وَ  
 هُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً وَ  
 لَنُجْزِيَنَّهُمْ أَجْرَهُمْ بِأَحْسَنِ مَا كَانُوا  
 يَعْمَلُونَ (پ ۱۸۶ ع ۱۸۶)

جو شخص کوئی نیک کام کریگا، خواہ وہ مرد ہو یا عورت  
 بشرطیکہ صاحبِ ایمان ہو، تو ہم اس شخص کو بالطف  
 زندگی دیں گے، اور ان کے اچھے کاموں کے عوض میں  
 ان کا اجر دینگے۔

وَمَنْ أَرَادَ الْآخِرَةَ وَسَعَىٰ لَهَا سَعْيًا  
 وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُولَٰئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ  
 مَشْكُورًا (پ ۲۶ ع ۲۶)

جو شخص آخرت کی نیت رکھتا اور اس کے لیے سعی  
 سعی کرنا چاہے ویسی سعی کرے جیسا بشرطیکہ وہ شخص مومن  
 بھی ہو، تو ایسے لوگوں کی سعی مقبول ہوگی۔

(۴) حق تعالیٰ گنہگاروں کے لیے مغفرت کا وعدہ فرماتے ہیں :-

قُلْ يُعْبَادِي الَّذِينَ اسْرِفُوا عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ  
لَا تَقْنَطُوا مِن رَّحْمَةِ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ يَغْفِرُ  
الذُّنُوبَ جَمِيعًا إِنَّهُ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ  
آپ کہہ دیجیے کہ اے میرے بندو جنہوں نے اپنے آپ پر  
زیادتیاں کی ہیں تم خدا کی ذات سے ناامید مت ہو  
بالیقین خدا تمام گناہوں کو معاف فرمادے گا، واقعی وہ  
(پ ۲۲۳-۲۶) بڑا بخشنے والا اور بڑی رحمت کرنے والا ہے۔

بہت سی آیتوں میں مغفرت و نوب کی نوید ہے، اس کے برخلاف کفر کے لیے عذابِ مخلد کی

وعید ہے:-

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا أَوْ صَدُّوا عَن سَبِيلِ  
اللَّهِ ثُمَّ مَا تَوَّأَوْا وَهُمْ كَفَارًا فَلَن يَغْفِرَ  
اللَّهُ لَهُمْ (پ ۸۶۲۶)  
بیشک جو لوگ کافر ہوئے اور انہوں نے اللہ کے  
راستہ سے روکا، پھر وہ کافر ہی رہ کر مر گئے، سو خدا  
تعالیٰ ان کو کبھی نہ بخشے گا۔

اگر اعمالِ داخلِ ایمان ہوتے اور ان کا نہ کرنا داخلِ کفر، تو ان کی نسبت بھی بصورتِ عدم  
تعمیل، کفر کی طرح عدم مغفرت اور دوامِ عذاب کی وعید ہوتی نہ کہ مغفرت و رحمت کی نوید!  
(۵) حق تعالیٰ نے دو صاحبِ تصدیق قتال کرنے والے گروہوں کو مومن کہہ کر یاد فرمایا ہے:-

وَإِن طَافَتْشِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَقْتَتَلُوا  
فَأَصْحَابُ بَيْنَهُمَا، فَإِن بَغَتْ إِحْدَاهُمَا  
عَلَى الْأُخْرَىٰ فَقَاتِلُوا الَّتِي تَبْغِي حَتَّىٰ  
تَفِيءَ إِلَىٰ أَمْرِ اللَّهِ فَإِن فَاءت فَأَصْحَابُ  
بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَأَقْسَطُوا إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ  
الْمُقْسِطِينَ إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ  
فَأَصْحَابُ بَيْنِ أَخْوَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللَّهَ  
لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ - (پ ۱۳۶)

اگر مسلمانوں میں دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو ان کے درمیان  
اصلاح کرادو، پھر اگر ان میں کا ایک گروہ دوسرے پر زیادتی  
کے تو اس گروہ سے لڑو جو زیادتی کرنا ہے یہاں تک کہ وہ  
خدا کے حکم کی طرف رجوع ہو جائے، پھر اگر رجوع ہو جائے  
تو ان دونوں کے درمیان عدل کے ساتھ اصلاح کر دو،  
اور انصاف کا خیال رکھو۔ بیشک اللہ انصاف والوں کو  
پسند کرتا ہے۔ مسلمان تو سب بھائی ہیں سو اپنے دو بھائیوں  
کے درمیان اصلاح کرادیا کرو، اور اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ تم

اگر اعمالِ جزو ایمان ہوتے تو اس باہمی قتال سے دونوں کافر ہوتے ان کو مومن نہ کہا جاتا، نہ

ان میں صلح کرانے کی یہ وجہ بیان کی جاتی کہ مسلمان باہم بھائی ہیں۔  
 ان آیاتِ بینات پر غور کرنے سے یہ بات واضح ہے کہ اعمالِ ایمان میں داخل نہیں۔  
 حق تعالیٰ نے صلح اسی شخص کو کہا ہے جو ایمان بھی رکھتا ہو اور عملِ صلح بھی کرتا ہے۔ اب عملِ  
 صلح کے معنی کا تعین ضروری ہے۔

عملِ صلح کے لیے تین چیزوں کا ہونا ضروری ہے۔ صواب: یعنی عمل کا موافق سنت  
 صحیحہ کے ہونا۔ اخلاص: یعنی شرکتِ غیر اللہ سے پاک و صاف ہونا۔ نیت صحیحہ  
 وہی عملِ صلح ہو گا جو موافق سنت صحیحہ ہو اور نیت صحیحہ کے ساتھ حق تعالیٰ کے امثال میں  
 انہی کی رضا و خوشنودی کے لیے کیا جائے۔ ان تین خصوصیات کو اجمالی طور پر خوب سمجھ لو۔

۱۔ نیت کے متعلق جو اصول حضور انور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے بیان فرمایا ہر وہ یہ ہے:  
 "انما الاعمال بالنیات وانما لكل امرئ ما نوى" آگے مثال کے ذریعہ اس کی وضاحت فرمائی  
 ہے: فمن كانت هجرته الى الله ورسوله فهجرته الى الله ورسوله ومن كانت هجرته الى دنيا يصيبها  
 او امرأة ينجسها فهجرته الى ما هاجر اليه (رواه الشيخان) یعنی اعمال کا اعتبار نیت سے ہے، ہر شخص  
 کے لیے وہی ہے جو اس نے نیت کی، پھر جس نے اللہ اور رسول کی طرف ہجرت کی، اس کی ہجرت اللہ  
 اور رسول کی طرف ہوئی اور جس نے دنیا کی طرف ہجرت کی جو اس کو بیگی یا کسی عورت کی طرف جس  
 سے وہ نکاح کرے گا تو یہ ہجرت اسی کی طرف ہوئی۔

یہ حدیث اصولِ دین میں سے ایک عظیم الشان اصل ہے، ارکانِ اسلام میں سے ایک متم  
 بالشان کن ہے۔ اسے اعمال کا نیت ہی پر دار و مدار ہے۔ بے نیت کے کوئی عمل قبول نہیں ہوتا، نہ  
 اس کا کچھ اعتبار ہے۔ یہ حدیث متفق علیہ ہے، یعنی دوسری کتب حدیث کے علاوہ صحیحین (بخاری و مسلم)  
 میں بھی ہے۔

ب۔ اخلاص کے متعلق حضور انور کا یہ ارشاد بہت واضح ہے:-

يا ايها الناس اخلصوا اعمالكم فان الله يعني لے لوگو تم اپنے اعمال کو خالص حق تعالیٰ



تبارك و تعالیٰ لا یقبل من الاعمال الا کے لیے کرو کیونکہ حق تعالیٰ عملِ خالص کے سوا  
ما اخلص (رواہ البزار عن الضحاك بن قیس) کوئی عمل قبول نہیں کرتے۔

جب حضرت معاذ بن جبل کو یمن کی جانب روانہ کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ یا رسول اللہ مجھے کچھ  
نصیحت فرمائیے، تو ارشاد ہوا :-

اخلص دینك یكفیک العمل القلیل تو اپنے دین کو خالص کر، تجھے تھوڑا سا عمل کفایت  
کریگا۔ (رواہ الحاکم)

عمل جب حق تعالیٰ ہی کے امر کے امتثال میں اور ان ہی کی رضا کے لیے کیا جاتا ہے اور اس سے انہی  
کی ذات مقصود ہوتی ہے تو وہ "خالص" ہوتا ہے اور ایسا ہی عمل "صالح" کہلایا جاتا ہے۔

ج۔ صالح ہونے کے لیے عمل کا مطابق کتاب و سنت ہونا ضروری ہے۔ من احدث فی

امرنا هذا ما لیس منه فہو رد (اخرجہ الشیخان) اس پر نص ہے یعنی جو شخص دین کے کام میں وہ چیز  
نکالتا ہے جو اس میں نہیں وہ مردود ہے۔ اسی مفہوم کو اس طرح بھی ادا کیا گیا ہے: من صنع امر علی غیر ما فہو رد  
(رواہ ابوداؤد) ایک اور طرح بھی اس مطلب کو بیان کیا گیا ہے: من عمل عملاً لیس علیہ امرنا فہو رد (رواہ مسلم)

ان نصوص سے ظاہر ہے کہ جس کام کے کرنے کا دین میں حکم اور اذن نہ ہو وہ کام دین میں  
بدعت ہے، گو یہ کام بظاہر کیسا ہی اچھا کیوں نہ نظر آئے! جب اسلام میں اعمالِ صالحہ و افعالِ حسنہ  
بے حد بے شمار ہیں تو ان اعمالِ ثابتہ کو چھوڑ کر افعالِ مستحدثہ کو اپنا دین ٹھہرانا عقل کا ہیضہ نہیں تو  
کیا ہے! "بہتر بات تو خدا کی بات ہے، بہتر ہدایت محمد مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ہدایت ہے، اس کے  
بدتر کام وہ ہیں جو نئے نکالے گئے ہیں۔ ہر بدعت گمراہی ہے" (عن جابرؓ)

بدعت بھی عجیب بلا ہے۔ دیکھو گنہگار یا فاسق خواہ وہ کتنا ہی بد کردار کیوں نہ ہو گناہ کو گناہ

سمجھتا ہے، جی میں اس کام کو بُرا جانتا ہے گو منہ سے نہ کہے، اُمید ہو سکتی ہے کہ وہ جس چیز کو بُرا جانتا ہے  
اس سے کسی روز توبہ کر لے گا! لیکن صاحبِ بدعت کو توبہ کم نصیب ہوتی ہے کیونکہ وہ تو اس کو مستحسن  
سمجھ کر رہا ہے! حضرت ابنِ عاصمؓ نے حضرت ابوبکرؓ سے مرفوعاً جو حدیث روایت کی ہے وہ اس روز آ

کے تجربہ کو عجیب و غریب طریقہ سے ظاہر کرتی ہے:-

”ابلیس نے کہا کہ میں نے لوگوں کو گناہ کا مرتکب کر کے ہلاک کر دیا اور انہوں نے مجھے گناہ سے توبہ کر کے برباد کیا۔ جب میں نے یہ حال دیکھا تو پھر میں نے ان کو بوٹی و بدعت میں مبتلا کر کے ہلاک کیا۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم راہِ حق پر ہیں اس لیے استغفار نہیں کرتے، اس طرح ہلاک ہو جاتے ہیں۔“

اسی لیے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا تھا، کہ:-

”کل بدعة ضلالة وکل ضلالة فی النار!“

”ایمان“ اور عملِ صالح کی ماہیت کو سمجھ لینے کے بعد اب مومن لا معبود الا اللہ کے شغف میں سرور ہو جاتا ہے، اور جملہ معبودانِ باطل کی قلب سے نفی کرتا ہے اور یہ معبودانِ باطل اس کے حق میں تین ہیں:- دنیا، خلق اور ہوائے نفسانی۔

لا معبود الا اللہ کے ایک معنی یہ ہیں کہ حق سبحانہ تعالیٰ کے سوا میں امورِ دنیا میں سے کسی کا مطیع و منقاد نہیں جب بھی امورِ دنیا سے کوئی خطرہ میرے قلب میں آتا ہے تو میں حق ہی کی حولِ موت سے اس کی نفی کرتا ہوں اور لا الہ الا اللہ کی تلوار سے اس کو کاٹ کر رکھ دیتا ہوں! میرا عمل میری ہر حرکت حق تعالیٰ کے امر کے امتثال میں ہوتی ہے اور میرے تمام جذبات احکامِ الہیہ کے پابند ہوتے ہوتے ہیں کیونکہ ان کے سوا میرا معبود کوئی دوسرا نہیں! میرا کوئی عمل اسی وقت صالح یا قابلِ قبول ہوگا جب میں حق تعالیٰ ہی کی رضا و خوشنودی کے لیے ان ہی کے بتائے ہوئے طریقے سے اس کو انجام دوں!۔

اسی طرح میں خلق کو اپنے کسی عمل میں شریک نہیں کرتا، ریا و سمعہ کا کوئی خطرہ جب میرے قلب میں خطرات کرتا ہے، عمل کے وقت جب کسی مخلوق کا خیال میرے ذہن میں آتا ہے تو یہ جان کر کہ ایسی حالت میں حق تعالیٰ کی بجلت ہی میرا معبود بن جاتا ہے، میں لا الہ الا اللہ کی تیغ سے اس کو کاٹ کر رکھ دیتا ہوں۔

اسی طرح جب عمل کے وقت نفسانی خواہشات میں سے کسی خواہش، جاہ و عزت، خود نمائی، عجب و کبر یا کسی لذتِ نفسانی کا گزر میرے قلب میں ہوتا ہے تو صاف طور پر یہ جان کر کہ ”ہر چہ در بند

آنی بندہ آئی اور حق تعالیٰ کی اس تہدید کا خیال کر کے کہ: "أَفَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَهَهُ هَوَاهُ" میں لا الہ الا اللہ کی تلوار سے ان تمام خطرات کی نفی کرتا ہوں تاکہ ماسوی امتد کی عبادت کی ذلت سے پوری طرح نجات پاؤں! مجھے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ بددعا یاد آتی ہے جو انہوں نے اُس شخص کے حق میں کی تھی جو مال و دولت کو، عمدہ لباس و شہرت کو اپنا معبود بنا لیتا ہے اور جس کا سارا عمل ان ہی کے حصول کے لیے ہوتا ہے۔

نعس عبدالدینا رو نعس عبدالدہم و نعس عبد الخمیصنہ و انتکس و اذا شیک فلا انتقش!

"تباہ ہوا اشرفی کا بندہ اور روپیہ کا بندہ اور کپڑوں کا بندہ (یعنی جو رات دن بس انہی کی طلب اور فکر میں

رہے) منہ کے بل گرے پھر سر کے بل الٹ جائے، اور جب اس کے کانٹا چھبے تو کوئی اس کا کاٹنا نہ

نکلے (راتی بھی مدد نہ کرے کیونکہ وہ بندہ زہے)"

جب میرے قلب پر سے ان معبودانِ باطل کی حکومت کامل طور پر اٹھ جاتی ہے اور سریرِ دل پر صرف حق تعالیٰ کی حکومت قائم ہو جاتی ہے اور میرے تمام جذبات اوامرِ الہیہ کے پابند ہو جاتے ہیں تو میں آزادی و حریت کا وہ ذوق محسوس کرنے لگتا ہوں جو ہفت کشور کے بادشاہ کو بھی میسر نہیں ہو سکتا!

عارفِ رومی نے اسی حلاوت کو محسوس کر کے فرمایا ہے: ۷

گر تو خواہی حرّی و دل زندگی      بندگی کن بندگی کن بندگی

زندگی مقصود بہر بندگی است      زندگی بے بندگی شرمندگی است

ہر کہ اندر عشق یابد زندگی      کفر باشد پیش او جز بندگی

ذوق باید تا دیدہ طاعات بر      مغز باید تا دیدہ دانہ شجر!

عبدیت ہی حریت کا اصلی سبب ہے، حریت کیا ہے؟ "هو انقطاع الخاطر عن تعلق ماسوی

اللہ تعالیٰ بالکلیہ!" سچی آزادی اس انسان کو نصیب ہوتی ہے جس نے اغراضِ نیادی و خواہشاتِ نفسانی

سے اپنے قلب کو آزاد کر کے حق تعالیٰ سے بندگی و افتقار کی نسبت جوڑ لی ہے! حریت نہایت عبودیت کا

نام ہے "آزادگی بے بندگی" نہیں ہے کہ بستگانِ مکنذ تو رستگار نند" (حافظ) و نعم باقیل۔

خواہگی را خواہگی از بندگی ست بندگی کردن کمالِ خواہگی ست!

من ازاں روز کہ در بند تو ام آزادم بادشاہم کہ بدست تو اسیر افتادم!

لا الہ الا اللہ کے معنی اول لا معبود الا اللہ کے ہیں۔ عبادت کے معنی غائبتِ تذل و افتقار

کے ہیں۔ زندگی کو جی کی خواہش کے مطابق نہیں بلکہ حق تعالیٰ کی مرضی کے مطابق بسر کرنے کے ہیں۔

زندگی کی ہر حرکت امتثالِ امر الہی ہیں ہو، ہر فعل کا مقصود حق تعالیٰ کی رضا و خوشنودی کا حصول ہو یعنی

مقصود و محبوب اللہ ہی ہو! لا مقصود الا اللہ، لا محبوب الا اللہ یہ ہیں دوسرے معنی لا الہ الا

اللہ کے۔

لا الہ الا اللہ بمعنی لا معبود الا اللہ کے شغل سے سالک کے قلب سے دنیا، خلق اور ہوائے

نفسانی یا جذبات کا تسلط اٹھ جاتا ہے لیکن باطن میں حق تعالیٰ کے سوا اور مقصود موجود رہ سکتے ہیں

جن کا لا مقصود الا اللہ کے شغل سے دور کرنا ضروری ہے، یہ مقاصد بھی تین ہو سکتے ہیں اور ہوتے

ہیں۔ ۱: بہشت و ما فیہا من اکوڑ والقصور۔ ۲: مقامات کشفی مثلاً کشفِ قبور، کشفِ قلوب،

یا کشفِ بلا وغیرہ۔ ۳: تجلیاتِ قربی۔

مقصود حقیقی حق تعالیٰ ہوں تو جنت بھی بالذات مطلوب نہیں قرار پاتی ہے۔ اگر جنت کا سوال

کیا جائے تو محض اس بنا پر کہ وہ محلِ دیدار محبوب ہے ۶

عاشقانِ جنت ہرے دوست می دارند دوست!

و رضوان من اللہ اکبر سے صاف یہ معلوم ہوتا ہے کہ رضا کے حق کو جنت سے اکبر قرار دیا گیا ہے۔

نہ ہی مقصود وہ مقامات کشفی ہیں جو اولیاء اللہ کو تبعاً حاصل ہوتے ہیں جیسے کشفِ قبور یا کشفِ قلوب

یا کشفِ بلا۔ ۷

۷ اس سے ہرگز یہ نہ سمجھا جائے کہ جنت کی طلب ایمان یا کمالِ ایمان کے منافی ہے۔ انبیاء علیہم السلام خصوصاً سید الانبیاء

صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کامل کون ہوگا۔ بائیں ہمہ قرآن و حدیث میں ان حضرات کی جو دعائیں نقل کی گئی ہیں ان میں

جنت کا سوال بار بار کیا گیا ہے اور دوزخ سے پناہ مانگی گئی ہے۔ البتہ بندہ مومن کا اصلی اور اولیٰ محبوب و مطلوب بس حق تعالیٰ

کی ذات اور اس کی رضا ہی ہونا چاہیے۔ "وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ" ۱۲-م

دریں منزل بود کشف و کرامات و لے باید گزشتن زان مقامات

نہی وہ تجلیاتِ قرنی مقصود ہیں جو اولیاء اللہ کو حاصل ہوتی ہیں مثلاً ولایت و غوثیت و قطبیت وغیرہ،

مقصود صرف ذات حق ہے، ان کا حضور، ان کا ذکر، ان کی فکر، ان کی یاد سے

یارب ز تو آنچه من گد امی طلبم افزوں ز ہزار پادشامی طلبم

ہر کس ز در تو حاجتے می خواہد من آمدہ ام ز تو ترا می طلبم

اس شغل کے تسلسل سے حق تعالیٰ کی محبت دل پر ایسی غالب ہو جاتی ہے کہ ایک لمحہ کے لیے بھی ان سے

عقلت نہیں ہوتی، اور اس کا یہ حال ہو جاتا ہے:۔

از بس کہ خیالت بہ نظر می دارم

در ہر چہ نظر کنم توئی پس دارم

یہ مقام تلوین ہے، یہاں عاشقوں کے قلب و زبان سے فریاد نکلتی ہے، حال طاری ہوتا ہے، لیکن وہ

اس حال سے ترقی کرتے ہیں اور محض رضا کے حق ان کا مطلوب ہو جاتا ہے جس حال میں رکھیں

اس سے راضی رہتے ہیں، ہجر و وصال دونوں سے راضی ہو جاتے ہیں۔

معتوقہ کہ شد بجا معائن من گفتا کہ نہ بہ عاشقی لائق من!

وصل است ز من کام تو آئےستی تو عاشق کام خویش لے عاشق من

اب ہر فعل و حرکت میں حق تعالیٰ کی رضا طلب کرتے ہیں، حق تعالیٰ کے جملہ افعال و احکام میں سے کسی

فعل یا حکم پر جو خود ان کی جان پر یا جہان پر جاری ہو جاتا ہے کوئی اعتراض نہیں کرتے، اور

”ہر چہ از دست می رسد نیکو است“

کہہ کر تسلیم خم کر دیتے ہیں! توافق بالقضاء، اعراض عن الاعتراض ان کا شعار ہو جاتا ہے، مرض ہو یا

خلاف نفس کوئی چیز ہو اپنے محبوب کے حکم اور اس کی مشیت کا اس کو نتیجہ سمجھ کر اس سے محظوظ و خوش وقت

ہوتے ہیں اور ان کی زبان سے ایسے وقت بس ہی نکلتا ہے، کہ۔

عاشقم بر سب خویش و درد خویش! بہر خوشنودی شاہ فرد خویش!



اور عارفِ روحی کے الفاظ میں اپنے یقین کا اس طرح اظہار کرتے ہیں : ۷

آن کے راکہ چنیں شاہے کشد سوئے بخت و بہتری جاؤ کشد  
نیم جاں بستاند و صد جاں دہد انچہ در بہت نیاید آن دہد

اور ہر حال میں رضا ان کا مقام ہوتا ہے : ۷

زندہ کنی عطکے تو در کشتی فدائے تو

جاں شدہ مبتلائے تو ہر چہ کنی ضحکے تو

اب لَکَيْلًا تَأْسُوْا عَلٰی مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَا آتَاكُمْ كَايَ لَفُوْسٍ قَد سِيءَ صَحِيْحٌ مَّصْدَقٌ بِنِ جَلْتِ هِيْنَ

(رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ) یہ نتیجہ ہے جذبات اور عقلی پرواز کو اور امر الہیہ کے تابع کرنے اور ان کو محمد

مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے حضور میں قربان کر دینے کا ۷

ایں راہِ طریقت زہ پاک عقل است خاکِ قدم عشق و رائے عقل است

بیرے کہ فرشتہ چوں ازاں بجز است اے غافل بے عقل چہ جائے عقل است (لا اعم)

# نیکی علم ہے

علمی کہ درو عمل نباشد عار است ہر سچ کہ بے ذکر بود زنا راست  
ہر کس کہ بہ علم بے عمل می نازد عالم نبود اعمی مشعل دار راست

(پہلی جہانگانی)

یونان کے شہرہ آفاق مفکر سقراط کی تعلیمات کا خلاصہ پوچھا جائے تو بس یہی مشہور قول ہے،

کہ ”نیکی علم ہے اور بدی جہل“ اس سے سقراط کا بظاہر یہی مطلب تھا کہ عملِ صالح (نیکی) علمِ صحیح کا نتیجہ ہے، اور علمِ صحیح تین کے درجہ میں عملِ نیک سے جدا و منفک نہیں، ان میں ایک ضروری لڑوی ربط پایا جاتا ہے، یہ لازم و ملزوم ہیں، سچ پوچھو تو اربابِ علم کی تعریف ہی اس طرح کی جاسکتی ہے

الَّذِينَ يَعْمَلُونَ بِمَا عَمِلُوا - یعنی یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے علم پر عمل کرتے ہیں۔ ہر کتابِ خواں و کتابِ داں عالم نہیں قرار دیا جاسکتا، وہ عالم نہیں، متلذذ بالمسائل ہے۔ مسائلِ علمیہ کا حافظ اور ان سے لذت اندوز ہونے والا ہے۔ عوام کا یہ ظن محفل ہے کہ ہر کرم کتابی کو وہ عالم سمجھتے ہیں، اعمی مشعل دار کو بنیا جانتے ہیں، اور اپنے اس وہم کی تائید میں تعلیل معتدل سے کام لیتے ہیں۔ اس مختصر مقالہ کا مقصد اس بنیادی غلطی کا ارتقاع اور اس کی تائید میں جو دلائل پیش کیے جاتے ہیں ان کا ابطال ہے۔ ۶۔ یک تنقیہ دماغ می باید کرد۔

ذرا سقراط کے اس قول کو کہ ”نیکی علم ہے“ اور وضاحت کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کرو، کیا علمِ صحیح عملِ صالح کے لیے ضروری نہیں؟ کیا جہاز رانی کے لیے جہاز کی ساخت اور اس کے کام سے واقف ہونا ضروری نہیں؟ اسی طرح حکمرانی کے لیے مملکت کی ماہیت و مقصد و غایت کا جاننا لازمی نہیں؟ بالکل اسی طرح جب تک ہم یہ نہ جانیں کہ نیکی کیا ہے، جب تک کہ یہ نہ معلوم ہو کہ خصائلِ حسنہ کیا ہیں، تقویٰ کیا ہے، عفت و شجاعت کیا ہے، حکمت

عدالت کیا ہیں، اور ان کی ضد خصائل سیتہ کیا ہیں، کیا ہم نیک بن سکتے ہیں، تقویٰ اپنے اندر پیدا کر سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں، لیکن جب یہ معلوم ہو جائے کہ نیکی کیا ہے، ہم نیک بن سکتے ہیں!

یہاں تک تو عوام کو بھی سقراط کی رائے سے اتفاق ہوگا کہ جب تک آدمی کو نیکی کا علم نہ ہو وہ نیک نہیں بن سکتا، اس معنی میں قطعاً نیکی علم ہے، لیکن سقراط فطرت انسانی کا راز دار تھا، اس کی رائے میں فطرت انسانی کے لیے یہ ناممکن ہے کہ وہ شر کو خیر پر ترجیح دے، وہ قطعاً خیر ہی کا ساتھ دیگی۔ کیونکہ خیر ہی میں اس کا ذاتی فائدہ ہے، نفع ہے، بھلا ہے، خیر کے ہم سب عاشق ہیں، خیر ہی ہمارا محبوب ہے، ہم سب اسی کے پروانے ہیں، یہ ممکن ہے کہ جہل کی وجہ سے ہمیں شر خیر نظر آئے، شر کو ہم خیر سمجھ لگیں اور اس علم باطل کی وجہ سے شر کا ساتھ دیں اور اس کو اختیار کریں، لیکن یہ ہماری فطرت کا قصور نہیں، یہ ہمارے ارادہ کا نقص نہیں، یہ ہمارے علم کا قصور ہے، جہل کی تاریکی میں ہمیں خیر کے صحیح ضد و مخالف نظر نہیں آتے اور ہم سراب کو آب سمجھنے لگتے ہیں اور اس پر گرتے ہیں، اسی لیے ”بدی جہل ہے“ اور صرف جہل ہی بدی ہے، اور جہل نام ہے علم صحیح کے فقدان کا، جہل میں بھی جو علم نظر آتا ہے وہ علم صحیح نہیں، دھوکہ ہے اور اس کا عالم عار نہیں جاہل ہے!

اگر فطرت انسانی کے متعلق سقراط کی یہ بات صحیح ہے تو ہمیں اس کا یہ قول ماننا ہی پڑتا ہے کہ ”کوئی شخص ارادہ بد نہیں“ کوئی شخص ارادہ شر کو اختیار نہیں کرتا، اور جب وہ دو برائیوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنے پر مجبور ہوتا ہے، تو بڑی بُرائی پر ہاتھ نہیں ڈالتا۔ جب وہ چھوٹی بُرائی کو چن سکتا ہے، اور میں یہ بھی ماننا پڑتا ہے جہل ہی کی وجہ سے ہم شر کو اختیار کرتے ہیں، گناہ میں ٹپتے ہیں، لہذا جہل ہی گناہ ہے، بدی ہے۔ جہل سے مراد یہاں عدم علم نہیں بلکہ سفاہت یا حماقت ہے۔ اس لیے جاہل ایک معنی میں عالم کہلایا جاسکتا ہے، لیکن ہر معنی میں وہ احمق ضرور ہے۔ عوام جنہیں اپنی رائے میں عالم قرار دیتے ہیں وہ حقیقی معنی میں سفید یا احمق قطعاً ہوتے ہیں، وہ خیر کی ماہیت سے جاہل ہوتے ہیں، اپنے نفع و ضرر سے بیخبر ہوتے ہیں، وہ اشیاء کے بطون سے واقف نہیں ہوتے، وہ

مظاہر کے حسی علم میں گرفتار ہوتے ہیں، وہ اصل میں مست خواب ہوتے ہیں، لیکن خواب میں اپنے کو بیدار سمجھتے ہیں۔ ۶۔ خفتہ دائم خویش را بیداری بیند بخواب۔ (صائب)

جذبات سے زیادہ جہل کی مورث کوئی اور شے نہیں۔ ارسطو نے سقراط کے اس قول پر جو تنقید کی ہے اس سے یہ ثابت ہوتا ہے۔ ارسطو کی رائے میں انسان کے اکثر اعمال پر جذبات کی حکمرانی ہوتی ہے، ان کی محرک شہوتیں ہوتی ہیں، عقل یا علم صحیح نہیں، عمل جذبات کے تابع ہوتا ہے، اور جذبات ارسطو کے الفاظ میں ”روح کا غیر عقلی حصہ ہوتے ہیں“ سقراط کا عمل اس کی عقل کا تابع تھا، اس نے خیال کیا کہ ہر شخص کا عمل اسی طرح عقل کا تابع ہوتا ہے، اسی لیے اس نے نیکی کو علم قرار دیا، لیکن روح انسانی کے غیر عقلی حصے، جذبات اپنی قوت و شدت کے لحاظ سے مردانگن ہوتے ہیں، اور انہی کا تسلط انسان کے دل و دماغ پر ہوتا ہے، عقل و حکمت سے بے بہرہ ہوتے ہیں، ان کا پیدا کردہ عمل بھی علم اور نیکی سے عاری ہوتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ انسان راہِ مستقیم کو جاننے کے باوجود بھی جذبات کے زیر اثر گمراہی اختیار کرتا ہے، ہاتھ میں شمع رکھنے کے باوجود چاہ میں گر جاتا ہے وہ اعمیٰ مشعل دار ہے ”چارپائے بر و کتابے چند“ کا مصداق ہے، زبانِ سنت میں ”علم باللسان“ اور ”جاہل بالقلب“ ہوتا ہے، اس کے وجود ہی سے حافظ کی یہ مشکل پیدا ہوتی تھی:-

مشکلے دارم ز دانشمند مجلس باز پرس      توبہ فرمایاں چرا خود توبہ کمتر می کنند

ارسطو کی اس تنقید سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ نیکی محض علم ہی نہیں، ہر عالم مرد صالح نہیں، علم کے باوجود انسان کا نیک کردار بن جانا ضروری نہیں، جذبات اس راہ کے مزاحم ہیں۔

میان ببل و پروانہ فرق بسیار است      کجا بہ رتبه کرداری رسد گفتار!

سقراط کا یہ کہنا صحیح ہے کہ علم یا بصیرت نیکی کے لیے قطعی ضروری ہے، اس کے بغیر نیکی کی

راہ نہیں ملتی۔ لیکن ارسطو کہتا ہے کہ محض علم ہی کافی نہیں، ارادہ بھی ضروری ہے، علم کا استعمال ہونا چاہیے، اس کے لیے خواہہ کی ضرورت ہے، خواہہ سے عمل آسان ہوتا ہے، عمل کی تکرار سے عادت

قائم ہوتی ہے عمدہ عادتوں کے قیام ہی سے انسان نیک بنتا ہے، اسی لیے کہا گیا ہے کہ ۶  
چند روز جہد کن باقی بخند!

اسطو کی تنقید لا جواب نظر آتی ہے، لیکن سقراط کی بات پر غور کرو، شاید بالآخر تم اسی کی  
بات سے اتفاق کرو گے، تم کہتے ہو کہ عالم بے عمل کا وجود اس بات کی دلیل ہے کہ محض علم نیک  
نہیں جس کا دعویٰ سقراط کرتا ہے، انسان کو علم و یقین ایک بات کا ہوتا ہے اور وہ عمل اس کے  
خلاف کرتا ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ اس کا یہ علم یقین کس پایہ کا ہے، کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ جو لوگ  
دوسروں کو ترک دنیا کا سبق دیتے ہیں اور خود سیم و غلہ جمع کرتے ہیں، ترک دنیا کے قائل ہیں،  
اس پر یقین رکھتے ہیں، ان کا قلب اس کی صداقت پر گواہی دیتا ہے؟ وہ خود بھی شاید یہ سمجھتے  
ہیں کہ انہیں اس پر یقین ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ انہیں یقین صرف اسی چیز کا ہے جس پر وہ عمل  
کرتے ہیں، اگر انہیں روحانی اقدار کی حقیقی قیمت کا یقین ہوتا تو وہ قطعی اسی کی تلاش کرتے  
اور حطام دنیوی کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے، انسان کی فطرت ہی میں یہ داخل ہے کہ وہ  
اپنا بھلا چاہتا ہے، فائدہ کی تلاش کرتا ہے، اور نقصان یا ضرر سے بھاگتا ہے، میں جانتا ہوں کہ  
آگ پر انگلی رکھنے سے شدت کی سوزش ہوتی ہے، اس لیے میں آگ کے قریب نہیں جاتا،  
اگر اسی قسم کا یقین مجھے ہو جائے کہ آخرت قابل ترجیح ہے، کیونکہ یہی باقی رہنے والی ہے تو پھر میرے  
لیے یہ ناممکن ہے کہ میں آخرت کی پروا نہ کروں اور ”قحبہ مستورہ دنیا“ کی ناز برداری کرتا رہوں جیسا کہ  
ہم نے اوپر وضاحت کی ہے، جہل یعنی صحیح علم و یقین کے فقدان ہی سے شرکار تکاب عمل میں آتا  
ہے، اور بہر حال یہ نفسیاتی قانون صحیح ہے کہ ”عمل تابع حال ہوتا ہے اور حال تابع علم و یقین“ لہذا  
عمل ہی سے حال و یقین ظاہر ہوتے ہیں، کسی شخص کے یقین کا پتہ چلانا ہو تو اس کا عمل دیکھا  
جانا چاہیے نہ کہ محض قول، خود اس شخص کو اپنے یقین کی کیفیت اس کے اپنے عمل ہی سے معلوم  
ہوتی ہے، نفس کے دھوکوں کا حال عمل کے محاسبہ سے ظاہر ہو جاتا ہے، اور حال قابل اعتبار

۱۲۵ ترک دنیا بدم آموزیہ: خوشن سیم و غلہ اندوزند۔



ہر نہ کہ قال، کردار پر تصفیہ ہوتا ہے نہ کہ محض گفتار پر۔

قدم باید اندر طریقت نہ دم کہ اصلے ندارد دم بے قدم

غرض یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ ہر شخص اپنے علم و یقین کے مطابق ہی عمل کر رہا ہے تو سقراط کی اس بات کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ نیکی علم صحیح کا نام ہے، علم صحیح قطعاً عمل صالح پیدا کرتا ہے، انسان کو اپنے فائدہ کا علم اور اس پر یقین ہونے کے بعد اس کو اختیار کیے بغیر وہ رہ نہیں سکتا، کیونکہ اس کی فطرت ہی ایسی بنی ہے کہ وہ خیر کی طرف راغب ہوتا ہے، بشرطیکہ اس کو خیر کا علم ہو جائے اور خیر ہی کے علم کو صحیح معنی میں علم کہا جاسکتا ہے اور لقلعے حق ہی سے دیدہ بننا حاصل ہوتا ہے۔

دیدہ بننا از لقلعے حق شود حق کجا ہمراہ ہر احمق شود  
(ردی)

اب ہم تھوڑی دیر کے لیے ”حکمت یونانیاں“ سے حکمت ایمانیاں کی طرف رجوع کرتے ہیں، نور عقل و جس کو نور حق سے زینت بخشے ہیں۔

نور جس را نور حق تر میں بود معنی نور سنی نور این بود (ردی)

نیکی علم ہے، کیونکہ علم کی اصل ”خشیت اللہ“ ہے (خوف خدا ہے) اِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ (پت ۱۹۶) خدا سے اس کے وہی بندے ڈرتے ہیں جو ظلم رکھتے ہیں، اس لیے ابن مسعود وغیرہ نے کہا ہے کہ کفی بخشیت اللہ علماً و کفی بالاعتزاز بالله جهلاً۔ جب علم خوف خدا کا نام ہے، کثرت روایت کا نہیں، معلومات کا ذخیرہ جمع کرنے کا نہیں (لیس العلم بکثرة الروایت ولكن العلم خشية) تو ایسا علم قطعاً عمل کو درست کر دیتا ہے، یعنی اس سے نیکی پیدا ہوتی ہے، انسان صالح بن جاتا ہے اور اسی سبب میں کہا جاسکتا ہے کہ نیکی علم ہے، اور عالم وہی ہے جو خدا سے ڈرتا ہے اور جاہل وہی ہے جو اس کی نافرمانی کرتا ہے۔ من خشى الله فهو عالم ومن عصاه فهو جاهل۔ اس بنا پر ہم ہر کتاب خواں و کتاب داں کو عالم نہیں کہہ سکتے، امام شعبیؒ اپنے

لہ امام احمد نے معروف سے نقل کیا ہے۔

وقت کے علماء سے کہا کرتے تھے کہ تم عالم نہیں متلذذ بالمسائل (Intellectual Epicure) ہو۔ مسائل سے بھشت میں تمہیں لذت ملتی ہے، اور یہی لذت تمہاری غایت ہے۔ عالم سے مراد عامل باللہ فی اللہ عارف باللہ ہے یعنی عالم وہ ہے جو عرفانِ حق و خوفِ خدا رکھنے کی وجہ سے اللہ ہی کے لیے عمل کرتا ہے اور عمل کا مقصود اللہ ہی کی رضا و محبت کو قرار دیتا ہے۔

اسی علم کو زبانِ سنت میں ”علم نافع“ کہا گیا ہے اور اس کی وضاحت کی گئی ہے، یہ علم ایک نور ہے جو عالم کے حجابات کو رفع کرتا ہے اور اس کو عرفانِ حق عطا کرتا ہے، اسی علم کی وجہ سے وہ اپنے رب کی طرف راہ یاب ہوتا ہے، اس کو اپنے سے قریب، بلکہ ”اقرب“ پاتا ہے، اس کو حاضر و ناظر جانتا ہے، اس یافتِ قرب کی وجہ سے عالم کا اللہ سے بڑھتا جاتا ہے، اب اس کو ذکر و دعا میں حلاوت، مناجات میں لذت، ادائے فرضِ عبودیت میں سرور و مسرت حاصل ہوتی ہے، اب اس کا مقصود حق تعالیٰ ہو جاتے ہیں، جان و مال، فرزند و زن سے وہ زیادہ عزیز و محبوب بن جاتے ہیں اور وہ انہیں مخاطب کر کے کہتا ہے:

خوابم کہ ہمیشہ درہوائے تو زیم      خاکے شوم و زیر پائے تو زیم  
مقصود من خستہ ز کونین توئی      از بہر تو میرم و برائے تو زیم (صحابی اشتر آبادی)

جب تعلقِ عبد میں اور اس کے رب میں پیدا ہو جاتا ہے اور اس طرح جان پہچان ہو جاتی ہے تو حق تعالیٰ اس کے لیے کافی ہو جاتے ہیں کفی باللہ و کبیر! جو کچھ وہ مانگتا ہے اس کو ملتا ہے، جو کچھ وہ چاہتا ہے اس کو دیا جاتا ہے۔ اور وہ چاہتا ہی ہے جس میں ان کی رضا ہوتی ہے۔ رضی اللہ عنہم و رضوا عنہم کیونکہ وہ جانتا ہے کہ ہر شے کا عوض حق تعالیٰ ہیں، لیکن ان کا عوض کوئی شے نہیں۔

لہ لئن سألنی لاعطینہ ولئن استعاذنی لاعینہ۔

لكل شيء اذا فارقت عوض وليس لله ان فارقت من عوض

عارف رومی نے اسی مطلب کو اپنے سُریلے نغموں میں یوں ادا کیا ہے کہ جب بندہ کو اپنے بادشاہ سے انس پیدا ہو جاتا ہے تو پھر سائے درد و غم کا اس کو علاج مل جاتا ہے اور اس کی طرف رُخ کر کے وہ سارے جہان سے فارغ ہو جاتا ہے۔

آنکہ شد آنشش بہ شاہ فرد خویش یافت در ما نہائے جملہ درد خویش

چوں ازاں اقبال شیر شد دہاں سر و شد بر آدمی ملک جہاں

جس کو یہ علم نافع عطا ہوتا ہے اس کو مزید تین چیزیں دی جاتی ہیں۔ قلبِ فاشع، نفسِ قانع اور دعا مسموع۔ جب اصل علم خشیتہ اللہ ہے تو علم کے ساتھ ہی خدا کا خوف بھی عالم کے قلب میں پیدا ہو جاتا ہے، اس کا نفس دنیا سے سیر ہو جاتا ہے، وہ طالبِ دنیا نہیں رہتا، وہ طالبِ علو و رفعت نہیں ہوتا، وہ اپنی شہرت کا خواہاں نہیں رہتا اس کو دولت و ثروت کی ہوس نہیں رہتی، وہ ہم عصروں اور دوستوں میں بلندی کی تمنا نہیں رکھتا، اس کو مجلسوں میں ہاتھوں ہاتھ لیے جانے کی آرزو نہیں رہتی (امام سفیان ثوری) امام حسنؓ کے الفاظ میں وہ

زاهد فی الدنیا، راعب فی الآخرۃ، بصیر بدینہ، مواظب علی عبادۃ ربہ ہوتا ہے یعنی دنیا میں زہد اختیار کرتا ہے، آخرت کی طرف راعب ہوتا ہے اپنے دین میں بصیرت رکھتا ہے اور اپنے رب کا عبادت گزار بندہ ہوتا ہے۔ دوسری روایت میں اس کی تعریف یوں کی گئی

ہے الذی لا یحسد من فوقہ ولا یسخر من دونہ ولا یوخذ علی علم علیہ اللہ یعنی وہ اپنے

سے بڑے پر حسد نہیں کرتا اور اپنے سے چھوٹے کا تمسخر نہیں کرتا اور اس علم کی وجہ سے جو اس کو اللہ نے سکھلایا ہے اس کا مواخذہ نہیں ہوتا۔ جوں جوں اس کا علم زیادہ ہوتا جاتا ہے، اللہ سے اس کا

خوف، تواضع اور انکسار زیادہ ہوتا جاتا ہے۔ (اہل العلم النافع کلما ازدادوا من هذا العلم ازدادوا اللہ تواضعاً وخشیتاً وانکساراً وذللاً، رواہ ابن عمر) عالم میں خاک کی طرح ختم ہونے کا

لہ ہر چیز کا جو تجھ سے جاتی ہے بدلہ ہے، لیکن اگر اللہ تجھ سے جاتا ہے تو اس کا کوئی بدلہ نہیں۔

دل و افتقار پیدا ہو جاتا ہے، کبر و فخر و رعوت کا نشان بھی باقی نہیں رہتا۔  
 در خاک بیلقاں برسیدم بہ عابدے      گفتم مرا بہ تربیت از جبل پاک کن  
 گفتا برو چو خاک تحمل کن لے فقیہ      یا سرچہ خواندہ ہمہ در زیر خاک کن  
 علم نافع کا عامل اس فقر الی اللہ کی وجہ سے سارے عالم سے غنی ہوتا ہے، وہ غنی لاشیٰ  
 نہیں، وہ غنی عن لاشیٰ ہوتا ہے، اس کا برگ و ساز قرآن عظیم ہے، اس کا قلب سوز و ساز، ذوق  
 و شوق، تسلیم و رضا سے مملو ہوتا ہے وہ سراپا صدق و اخلاص و نیاز ہوتا ہے، اس کے فقر کا  
 کچھ حال اقبال کی زبانی سنو:-

چسیت فقرے بندگان آب و گل	یک نگاہ راہ بین، یک زندہ دل
فقر کا رخویش را سنجیدن است	برد و حرف لا الہ سچیدن است
فقر خیر گیر بانان شعیر!	بستہ فتراک او سلطان میسر
فقر ذوق و شوق و تسلیم و رضا است	ما اینیم این متاع مصطفیٰ است
فقر بر کروسیاں شجوں زند	بر نوامیس جہاں شجوں زند
برگ و ساز اوست قرآن عظیم	مرد و رویشے نہ گنج در گلیم

✽

غرض وہ علم نیکی سے جس کی اصل خشیت اللہ ہے جو اپنے حامل میں قلب خاشع و نفس  
 قانع پیدا کرتا ہے، اور اس کی وجہ سے دعا و سموع حاصل ہوتی ہے، اور جس شخص سے یہ علم  
 نافع فوت ہو جاتا ہے وہ ان آفات میں مبتلا ہو جاتا ہے جن سے پیغمبر اسلام (روحی فداہ) نے  
 پناہ مانگی تھی یعنی یہ علم اس پر وبال و حجت ہو جاتا ہے، اپنے علم سے وہ کوئی نفع نہیں پاتا، اس  
 کا دل اپنے رب کے لیے نہ خشوع اختیار کرتا ہے، اور نہ اس کا نفس دنیا سے سیر ہوتا ہے، اور  
 نہ اس کی دعا سنی جاتی ہے، یہ علم نہیں جبل ہے اور تمام بدیوں کا مبداء، ہمیں اس عارف  
 کی تلاش ہے جو اپنی شمع سے محفل کو روشن کر دے اور ہمارے قلب سے کانٹوں کو نکال کر

اس کو گلشن بنادے ۛ

عارف دل و جان تو معین سازد  
 خاکے کہ کند بجاش گلشن سازد  
 کامل ہمہ را ز نقص بروں آرد  
 یک شمع ہزار شمع روشن سازد

(قادی ہندوستانی)



## تعلیم کا مقصد

گر جرعہ ز جام معرفت نوش شود  
وین کشمکش ہوا فراموش شود  
قلب عارف زیر فلک کے گنجد  
کے دریا را حباب سرپوش شود (سحابی استرآبادی)

نزول کے اعتبار سے قرآن مبین کی سب سے پہلی آیت اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ

سے یہ بات صاف طور پر سمجھ میں آتی ہے کہ پیدا کرنے والے نے ہمیں پڑھنے اور سیکھنے ہی کے لیے بنایا ہے۔ ہمیں کان، آنکھ اور دل (یا قرآن کے الفاظ میں سمع، و بصر و فؤاد) مشاہدہ، تجربہ و استنباط تِلْجِ ہی کے لیے عطا کیے گئے ہیں! عام طور پر پہلے علم کا معروض ہماری ذات یا نفس ہے، پھر آفاق ہے اور پھر نفس و آفاق کا پیدا کرنے والا! النفس و آفاق کی نشانیوں کا جاننا حق تعالیٰ کی معرفت کے لیے ضروری ہے اور قرآن نے علم کی حقیقی غایت حق تعالیٰ ہی کے عرفان و وجدان کو قرار دیا ہے! حق تعالیٰ کے عرفان ان کی یافت و شہود سے بڑھ کر اور کیلئے ہو سکتی ہے جس سے انسان ایک لحظہ بھی مطمئن و شاد کام ہو سکتا ہو۔

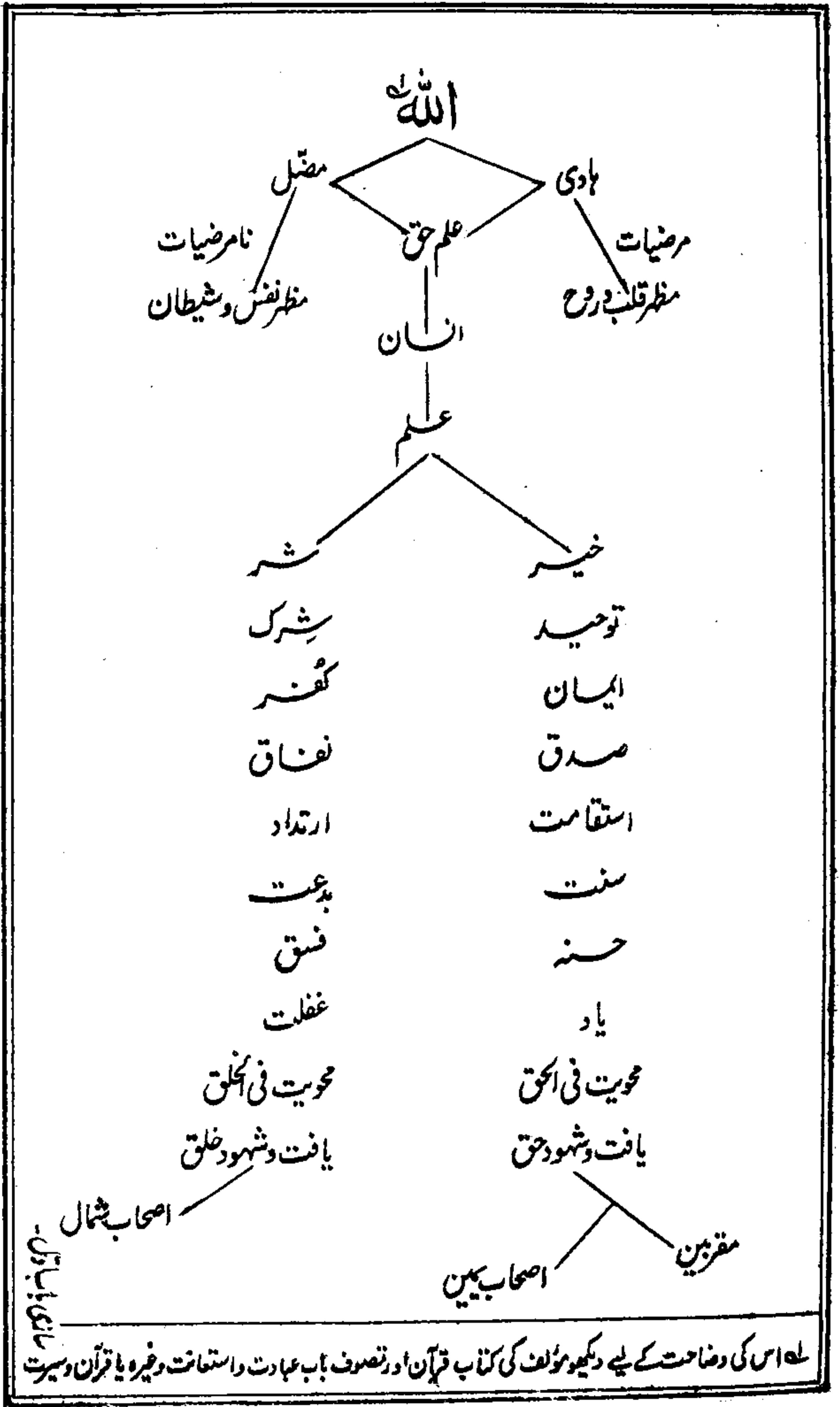
کیست زو بہتر بگوئے پیچ کس  
من نہ شادی خواہم و نہ خسروی  
تاہاں دل شاد باشی یک نفس  
انچہ می خواہم من از تو ہم نوی (ردی)

علم کا مقصد اولین حق تعالیٰ کا عرفان ہے، یعنی یہ جانتا ہے کہ حق تعالیٰ کن اسماءِ حسنیٰ، صفاتِ علیہ و افعالِ باہرہ سے موصوف و متصف ہیں، ان کا اظہار کس طرح کائنات کی لامتناہی اشیاء اور نفس کے لاتعداد احوال و آثار میں ہو رہا ہے۔ قرآن کریم کے ارشادات کی روشنی میں عقل کو تاجِ وحی کر کے آفاق پر نظر ڈالی جائے تو ہر ورق معرفتِ کردگار کا دفتر بن جاتا ہے، اور ہر ذرہ اس کی وحدت کا گواہ، اور تمام عالم اسی کے جمال کا آئینہ نظر آنے لگتا ہے!

ہمہ عالم جمال طلعت اوست گر کے را کہ این نظر باشد! (معدی)  
ایمان کی اس نظر میں جب کائنات جلوہ گاہ حق دکھائی دینے لگتی ہے تو نتیجے کے طور پر  
حق تعالیٰ کی عظمت و جلالت، ان کی خشیت و محبت سے انسان کا قلب معمور ہو جاتا ہے اور  
حلاوت و لذت سے آشنا ہو جاتا ہے جو ذات حق کا خاصہ ہے!

کلے بیل جان مست بیا تو مرا وے پایہ غم پست بیا تو مرا  
لذات جہاں را ہمہ دریا فلکند ذوقیکہ دہد دست بیا تو مرا (جانی)

اسماء و صفات و افعال حق کے عرفان کے بعد علم کا مقصد قرآن کی رو سے یہ جانا ہے کہ  
کون سے اعمال، احوال، اقوال یا اعتقادات ہیں جو حق تعالیٰ کو محبوب و پسندیدہ ہیں اور وہ چیزیں  
کونسی ہیں جو ان کو پسند نہیں اور جن سے انہوں نے انسان کو روکا ہے! قرآن مجید نے حق تعالیٰ  
کی مرضیات کی تفصیل ایمان، توحید، صدق، استقامت، سنت، حسنہ، یاد، محویت فی الحق،  
یافت و شہود حق کے سلسلہ میں شرح و بسط کے ساتھ کی ہے اور شرک و کفر، نفاق و ارتداد، بدعت و  
فسق، غفلت و محویت فی المخلوق اور یافت و شہود خلق کو کھول کر بیان کر دیا ہے اور مقررین  
"اصحاب یمین"، اور اصحاب شمال کے مقام و صفات کو واضح طور پر معین کر دیا ہے۔ خیر و شر، علم  
ہدایت و علم اضلال قطعاً حق تعالیٰ ہی عطا کرتے ہیں، خیر و شر میں امتیاز کرنا وہی سکھاتے ہیں  
وہدیناہ النجدین سے یہی مراد ہے، بد کرداری اور پرہیزگاری کا تقابلی ان ہی کی جانب سے  
ہوتا ہے، تاکہ کتاب و سنت کی روشنی میں بد کرداری سے گریز اور پرہیزگاری پر عمل کیا جاسکے۔  
فَاكْفُرْهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا (پت ۱۶۶) سے یہی مطلب ہے! حق تعالیٰ ہی کو علم کا مبداء قرار دے کر  
علم ہدایت و علم اضلال کی تشریح ایک نقشہ سے کی جاسکتی ہے جو قرآنی تفصیلات کے اظہار میں  
"الیم فی اسم" یا دریا بہ کوزہ کا مصداق ہے!



جو شخص علم کی ان تفصیلات سے واقف ہو جاتا، کو وہ علم ہدایت پر عمل پیرا ہونے لگتا ہے وہی کرتا ہے جس میں حق تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی ہوتی ہے اور ان چیزوں سے گریز کرتا ہے جن کو وہ مکروہ و ناخوش رکھتے ہیں! اپنے اس مجاہدہ و ریاضت کی وجہ سے اصحابِ پین کے درجہ سے بلند ہو کر مقربین میں شامل ہو جاتا ہے اور حبت ذات میں قیام پیدا کر لیتا ہے۔ فرخ وریحان و جنت نعیم!

خواہم کہ ہمیشہ درہوائے تو زیم      خلكے شوم و بہ زیر پائے تو زیم  
مقصود من خستہ ز کونین توئی      از بہر تو میسرم و بہائے تو زیم (تقاسم)

قرآن کریم نے علم کے یہی دو مقصود قرار دیے ہیں، چنانچہ امام احمد نے معروف سے نقل کیا ہے کہ اصل علم حق تعالیٰ کا ڈر ہے، یعنی سائے علم کی جڑ وہ علم ہے جو موجب خشیت و محبت و قرب حق ہو اور بندہ کو حق تعالیٰ سے مانوس کرے اور ان کے شوق کا شعلہ اس کے قلب میں پیدا کرے اور یہ جیسا کہ اوپر کہا گیا، حق تعالیٰ کے اسماء و صفات و افعال کو جاننے سے پیدا ہوتا ہے۔ اس کے بعد وہ علم ہے جو حق تعالیٰ کے احکام اور اس قول یا عمل یا حال یا اعتقاد سے انسان کو واقف کرانے جو ان کو محبوب ہیں اور پسندیدہ! اس علم کو زبانِ سنت میں "علم نافع" سے تعبیر کیا گیا ہے، اور اس کے از دیاد کی دعا کی گئی ہے۔ اللّٰهُمَّ اَنْفَعْنِي بِمَا عَلَّمْتَنِي وَعَلِّمْنِي وِزْدِنِي عِلْمًا وَاَرْزُقْنِي عِلْمًا تَنْفَعْنِي بِهِ (رواہ الترمذی) "حق تعالیٰ جو علم آپ نے مجھے سکھلایا ہے اس سے نفع اندوز کیجیے اور جو علم نافع ہر وہ مجھے سکھلایا ہے اور میرے علم میں زیادتی کیجیے اور وہ علم مجھے عطا کیجیے جس سے میں نفع اندوز ہوں۔"

دوسری حدیث میں علم نافع کا سوال کیا گیا ہے اور غیر نافع سے استعاذہ:-

اللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ عِلْمًا نَافِعًا وَاَعُوْذُ بِكَ مِنْ عِلْمٍ لَا یَنْفَعُ اِخْرَجَهُ لِلنَّسَائِیْ وَاِنْ مَا جِدَّ لَفْظُهُ اِنْ النَّبِیِّ صَلَّی عَلَیْهِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ قَالَ سَاوَالِ اللّٰہِ عِلْمًا نَافِعًا وَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ عِلْمٍ لَا یَنْفَعُ  
جس شخص کو علم نافع حاصل ہو گیا اس نے اس کے ثمرات کے طور پر "قلب خاشع" بھی پایا۔  
نفس قانع بھی اور دعائے مسموع بھی! اس کا قلب اپنی وسعت کے لحاظ سے ساری کائنات میں

نہیں سما سکتا۔ کیا حباب دریا کا سر پوش ہو سکتا ہے؟

مَنْ وَسِعَ الْحَقَّ فَمَا صَاقَ عَنْ خَلْقٍ فَكَيْفَ الْأَمْرُ يَا سَامِعَ لَيْلٍ

علم کے ان ثمرات پر ایک نظر ڈالو :-

(۱) قلبِ خاشع : علم نافع جب قلب میں اتر جاتا ہے تو اب وہ قلب حق تعالیٰ کے لیے خاشع اور شکستہ ہو جاتا ہے اور اس کی ہیبت و جلال کے سامنے اس کی خشیت و محبت و تعظیم کے لیے سراغندہ اور ذلیل ہو جاتا ہے! اور جوں جوں اس کا علم بڑھتا جاتا ہے، حق تعالیٰ کی معرفت بھی زیادہ ہوتی جاتی ہے۔ ان کی خشیت و محبت میں بھی اضافہ ہوتا جاتا ہے اور اس کا دل انکسار بھی روز افزوں! اسی کیفیت قلبی کو سعدی نے ان مشہور اشعار میں ادا کیا ہے :-

در خاک بلیقاں پر سیدم بجا بد سے گفتم مرا بہ تربیت از جہل پاک کن!

گفتار و چو خاک تحمل کن لے فقیہ یا ہر چہ خواندہ ہمہ در ز پر خاک کن!

علم کا ثمرہ ہی خشیت اللہ ہے! اِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ (پہ ۱۶۶) حق تعالیٰ

سے ان کے وہی بندے ڈرتے ہیں جو علم رکھتے ہیں! اسی لیے ابن مسعودؓ وغیرہ نے کہا ہے، کفی بخشية الله علماً وكفى بالاعترار بالله جهلاً۔ علم کا نتیجہ خوفِ خدا، اور جہل کا نتیجہ بے خوفی اور دھوکا! علم خوفِ خدا کا نام ہے کثرتِ روایات کا نہیں۔ معلومات کا ذخیرہ جمع کرنے کا نہیں، دماغ کو علومِ ربی سے پر کرنے کا نہیں۔ لیس العلم بکثرة الروایة ولكن العلم خشية عالم وہی ہے جو خدا سے ڈرتا ہے اور جاہل وہی ہے جو اس کی نافرمانی کرتا ہے، ”من خشى الله فهو عالم ومن عصاه فهو جاهل“

عالم کی اس تعریف کو پیش نظر رکھ کر ہم ہر کتاب خواں اور کتاب داں کو عالم نہیں کہہ سکتے چنانچہ اسی معیار سے جانچ کر امام شعبیؒ اپنے زمانے کے علماء سے کہا کرتے تھے کہ تم عالم نہیں ”متلذذ بالمسائل“ (INTELLECTUAL EPICURE) ہو تمہیں علمی مسائل سے بحث کرنے میں

لے جس میں حق سما گیا وہ غلط سے کیونکر تنگ ہو سکتا ہے اور اس کا کیا حال ہو گا لے سننے والے۔



لذت ملتی ہے اور یہی لذت تمہارا مقصد و غایت ہے اسی پر تم فدا ہو عالم دراصل عاملِ اللہ فی اللہ باللہ ہے یعنی عالم وہ ہے جو عرفانِ حق اور خوفِ خدا رکھنے کی وجہ سے اللہ ہی کے لیے عمل کرتا ہے۔ اس کے عمل اور مجاہدہ کا مقصد اللہ ہی کی رضا و محبت ہوتی ہے! اس کا مطلوب و محبوب صرف حق تعالیٰ ہی ہوتے ہیں!

دل از غم کائنات برداشتمہ بہ! جز یاد تو ہر چہ ہست بگذاشتمہ بہ!  
چشمے کہ نہ از نور تو روشن باشد بشگفتہ و بجاک انباشتمہ بہ!

(۲) نفسِ قانع: قلبِ خاشع کا لازمی نتیجہ نفسِ قانع ہے۔ جب دل میں خشوع پیدا ہو گیا، حق تعالیٰ سے ذل و افتقار کی نسبت قائم ہو گئی تو اب نفسِ اللہ سے راضی اور غیر اللہ سے مستغنی ہو جاتا ہے۔ اب غنی عن الاشیاء ہو جاتا ہے! وہ جانتا ہے کہ کوئی شے حق تعالیٰ سے برتر نہیں جس کے حصول کی وہ خواہش کر سکے، اب سب کچھ اسے حاصل ہو جاتا ہے! اسی لیے فرمایا گیا ہے۔ لَکِیْلًا تَأْسُوْا عَلٰی مَا فَآتَکُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَا آتَاکُمْ! اس کو علوئے تکمیل حاصل ہو جاتی ہے، وہی مخاطب ہوتا ہے اس قول کا: اَنْتُمْ اَعْلٰی وَاَللّٰهُ مَعَكُمْ!

نفسِ ساری کائنات کو پا کر بھی حریص رہ سکتا ہے۔ ہل من مزید کا نعرہ لگا سکتا ہے! لیکن جب وہ حق تعالیٰ کو پالیتا ہے، ان سے مانوس ہو جاتا ہے تو پھر دنیا اس کی نظر میں حقیر و ذلیل ہو جاتی ہے اور حق تعالیٰ کی عظمت و جلال سے اس کا پیمانہ لبریز ہو جاتا ہے! اثر اسرائیلی میں اس کا ذکر بڑی خوبی سے آیا ہے :-

ابن آدم طلبنی تجدنی، فان وجدتنی وجدت کل شیء وان فشک فانک کل شیء وانا احب الیک من کل شیء۔

ابن آدم تو مجھے طلب کر تو مجھے پائیگا۔ جب تو نے مجھے پالیا تو گویا تمام چیزیں تجھ کو مل گئیں۔ اگر تو نے مجھ کو کھو دیا تو گویا تو نے تمام چیزوں کو گم کر دیا، میں تیرے نزدیک ہر شے سے زیادہ محبوب

پسندیدہ ہوں، اسی مفہوم کو کسی عاشق نے یوں ادا کیا ہے :-

لِكُلِّ شَيْءٍ إِذَا فَا رَقَّتْهُ عَوْضٌ      وَكَيْسَ لِلَّهِ إِنْ فَا رَقَّتْ مِنْ عَوْضٍ

عارف رومیؒ نے اسی چیز کو اپنے سر پہ نغموں میں یوں ادا کیا ہے کہ جب بندہ کو اپنے شاہِ دیباہ سے انس و پیار پیدا ہو جاتا ہے تو پھر اس کو سارے دردوں کی دوا اہل جاتی ہے اور وہ اس کی طرف اپنا رخ پھیر کر سارے جہان سے فارغ و بے فکر ہو جاتا ہے :-

آنکہ شد آنشش بشاہِ فردِ خویش      یافت در ما نہائے جملہ درد خویش

چوں از اقبالِ بشریں شد ہاں      سرد شد بر آدمی ملک جہاں (رومی)

حق تعالیٰ سے مانوس ہو کر اس کا نفس دنیا سے سیر ہو جاتا ہے۔ اور دنیا کے اطوار سے بیزار ہو جاتا ہے، وہ طالبِ علو و رفعت نہیں ہوتا، وہ اپنی شہرت کا خواہاں نہیں رہتا، اس کو دولت و ثروت کی ہوس نہیں رہتی، وہ معصروں اور دوستوں میں بلندی کی تمنا نہیں کرتا، اس کو لوگوں کی نگاہوں میں عظمت حاصل کرنے کی آرزو نہیں رہتی، اور مجلسوں میں ہاتھوں ہاتھ لیے جانے کی خواہش نہیں رہتی (امام سفیان ثوری) امام حسن کے الفاظ میں (الزاهد فی الدنیا الراغب فی الآخرۃ، البصیر بدینہ، للمواظب علی عبادۃ ربہ ہو جانا ہے! یعنی دنیا میں ہر اختیار کرتا ہے، آخرت کی طرف مائل ہوتا ہے، اپنے دین میں بصیرت رکھتا ہے، اور اپنے رب کا عبادت گزار بندہ بن جانا ہے) وہ اپنے بڑے پر حسد نہیں کرتا اور اپنے سے چھوٹے کا مذاق نہیں اڑاتا۔ جوں جوں اس کا علم بڑھتا جاتا ہے حق تعالیٰ کا خوف بڑھتا جاتا ہے، تواضع و انکسار میں زیادتی ہوتی جاتی ہے۔ "اہل العلم النافع کلماتا از داد و من ہذا از داد و اللہ تواضعاً و خشیۃً و انکساراً و ذلاً (ابن عمر)

وہ حق تعالیٰ ہی کے لیے زندہ رہتا ہے، مال و گنج کے لیے نہیں، وہ حق تعالیٰ ہی کے لیے جان دیتا ہے، خوف و رنج سے نہیں مڑتا۔

۱۰ ہر چیز کا جو تجھ سے جاتی ہے بدلہ ہے لیکن اگر اللہ تجھ سے جاتا ہے تو اس کا کوئی بدلہ نہیں۔

ہر کجا امر قدم را مسلکیست	زندگی و مردگی پیشکش یکیت
بہر نریاں می زید نے بہر گنج	بہر نریاں می مرد ز خوف و بے گنج
ہست ایمانش برائے خواہ او	نے برائے جنت و اثمار و جوا
ترک کفرش ہم بے حق بود	نے زہیم آنکہ در آتش رود
ابن جنیں آمد ز وصل آن خوی او	بے ریاضت نے بخت جوے او
آنکھاں خندد کہ او بیند رضا	ہچوہ لوئے شکر اور اقصا (رومی)

(۳) دعائے مسموع :- جب قلب میں خشیت پیدا ہو گئی اور وہ حق تعالیٰ کی محبت سے منور ہو گیا اور دنیا سے شکم سیر ہو گیا تو اب وہ حق تعالیٰ کی نظر میں محبوب ہو جاتا ہے، اب اس کو ذکر و دعا میں حلاوت، مناجات میں لذت، اور اے فرضِ عبودیت میں سرور و مسرت حاصل ہونے لگتی ہے۔ اب وہ اپنے رب سے جو کچھ مانگتا ہے، اس کو دیا جاتا ہے، جو دعا کرتا ہے قبول کی جاتی ہے۔ چنانچہ حدیثِ قدسی میں صاف وعدہ کیا گیا ہے :-

لَا يَزَالُ عَبْدِي يَتَقَرَّبُ إِلَيَّ بِالنَّوَافِلِ حَتَّىٰ أَحْبَبَهُ إِلَيَّ قَوْلُهُ فَلَمَّا سَأَلَنِي لِأَعْطِيَنَّهُ وَلَا نِ اسْتَعَاذَنِي لِأَعِينَنَّهُ (وفی روایت) وَلَمَّا دَعَانِي لِأَجِيبَنَّهُ (رواہ البخاری)

جب بندہ کو حق تعالیٰ سے انس و تقرب حاصل ہو جاتا ہے تو اب اس کی دعا، مسموع ہوتی ہے، اس کا سوال پورا کیا جاتا ہے اور وہ حق تعالیٰ کی پرورش میں آ جاتا ہے، وہ اس کے ولی ہو جاتے ہیں۔ اس لیے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو وصیت فرمائی تھی کہ :-

اے پوری حدیث کا ترجمہ یہ ہے: ہمیشہ میرا بندہ نزدیک ہوتا ہے مجھ سے بذریعہ نوافل کے تا آنکہ دوست رکھتا ہوں میں اس کو تو ہوتا ہوں میں شرفی اس کی جو سنتا ہے وہ اس سے، اور بینائی اس کی جو دیکھتا ہے اس سے اور اتھ اس کا جو کپڑا ہے اس سے اور پیر اس کا جو چلتا ہے اس سے، اور اگر سوال کرے مجھ سے تو دیتا ہوں میں اس کو، اور اگر پناہ مانگے مجھ سے تو اللہ پناہ دیتا ہوں میں اس کو (اور ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ) اگر وہ دعا کرے مجھ سے تو اللہ میں اس کی دعا قبول کرتا ہوں۔

”یا غلام! احفظ الله يحفظك، احفظ الله تجده امامك، تعرف الله في الرخاء يعرفك  
 الله في الشدة“ یعنی اے لڑکے تو حق کو نگاہ رکھ (اس طرح کہ اوامر و نواہی کو بجالا اور قضا، قدر  
 کو مان) تو اللہ تجھ کو اپنی حفاظت میں رکھیگا، تو اللہ کو نگاہ رکھ (مراقبہ علم و حضور و معیت کے ساتھ)  
 تو اس کو اپنے سامنے پائیگا (وہ تجھ کو دنیا و آخرت دونوں کی آفتوں سے محفوظ رکھیگا) تو اللہ کی  
 یاد آرام و چین کی حالت میں کروہ تجھ کو سختی کی حالت میں یاد کریگا (تیری دعا کو قبول کریگا اور  
 تیری مصیبت کو دور کریگا!) اسی لیے تو عارفِ رومیؒ نے کہا تھا:-

زندگی بے دوست جاں فرسود است      مرگِ حاضر غائب از حق بودن است  
 عمر و مرگ این ہر دو با حق خوش بود!      بے خدا آپ حیاتِ آتش بود! (رومیؒ)  
 جب علمِ نافع نے ہمیں قلبِ خاشع، نفسِ قانع، دماغِ مسموع کی نعمتوں سے بہرہ یاب  
 کر دیا تو اب اس میں حقِ تعالیٰ ہی میں مشغولیت حاصل ہو جاتی ہے، تمام عالم سے بخود فانی ہو کر  
 باقی بحق ہو جاتے ہیں، ماسوی اللہ سے قلب کا تخلیہ ہو جاتا ہے اور یافت و شہودِ حق ہی ہمارا  
 عمل ہو جاتا ہے، یعنی ہم مخلوقات کو چھوڑ کر خالق میں، معلومات کو ترک کر کے عالم میں مصروف ہو  
 جاتے ہیں۔ یہ ہے علمِ نافع کا ثمرہ اور اس کا انجام!

چوں بہ مطلوبت رسیدی لے یلیح      شد طلب گاری علم اکنون قسج  
 چوں شدی بر باجہائے آسماں      سر و باشد جستجوئے نردباں (رومیؒ)  
 نسأل الله علما نفعاً ونعوذ به من علم لا ينفع ومن قلب لا يتخشع ومن  
 نفس لا تشبع ومن دعاء لا يسمع، اللهم اننا نعوذ بك من هولاء الاربعة

## انسانِ کامل

دی شیخ با چراغِ ہمیشگی گشت گردشگر  
 کز دام و دردِ ملولم و انسا تم آرزو دست!  
 زیں ہمراہِ سست عناصرِ دل گرفت  
 شیر خدا و رستم دستا تم آرزو دست!  
 گفتم کہ یافت می نشود جستمہ ایم ما  
 گفت آنکہ یافت می نشود انسا تم آرزو دست! (روح)

ان اشعار میں عارفِ روم نے دیوجانس کلبی کے اس واقعہ کا ذکر کیا ہے کہ ایک روز وہ دن کے وقت ہاتھ میں چراغ لے کر کسی گم شدہ شے کی نہایت توجہ اور انہماک کے ساتھ تلاش کر رہا تھا، لوگوں نے یہ نظارہ دیکھ کر پوچھا کہ اجی آخر ڈھونڈھنے کیا ہو؟ کہا کہ انسان کو ڈھونڈھ رہا ہوں! اسی حکیم کا ذکر ہے کہ ایک روز وہ اونچے مقام پر چڑھ کر پکار لے لگا کہ لوگو! ادھر آؤ! جب چند لوگ اس کے قریب پہنچے تو اس نے انہیں اپنے سونٹے سے مار بھگایا اور کہا کہ میں نے تو انسان کو بلایا تھا تم تو بول و براز ہو!

گویا دیوجانس کی نظر میں انسانِ کامل اور اس انسانِ نما صورت میں وہی فرق ہے جو کسی شخص میں اور اس کے بول و براز میں ہو سکتا ہے! دیوجانس اور اس کے منبعین نے انسانِ کامل کا جو تصور پیش کیا ہے اس کی زیادہ تفصیل تو ان کے ہاں نہیں ملتی البتہ اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ انسانِ کامل کی زندگی کا مقصود ذوقیت اور لذت پرستی نہیں بلکہ حق طلبی و حق رسی ہے جس کو وہ اپنی زبان میں "نیکی" سے تعبیر کرتے ہیں۔ نیکی سے ان کی مراد خواہشات سے قلب کا کامل تخلیہ ہے! جب انسان کا قلب تمام نفسانی خواہشات سے فاسخ ہو جاتا ہے، لذتوں کی تمنا اور آرزو اس کے دل سے نکل جاتی ہے، مال و دولت، جاہ و عزت کی طلب بالکل جاتی رہتی ہے تو وہ کمال

لے یہ مقالہ لشرگاہ حیدرآباد دکن سے نشر کیا گیا۔



کے اس زینہ تک پہنچ جاتا ہے جو انسان کے عروج کا آخری زینہ ہے! کلبیہ کا لغزہ تھا۔

خرنستی از آب و علف دست بدار سگ نستی از جیفہ دنیا بگذرا!

قلب لذت کی خواہش سے آزاد ہو جائے، لذت کے مؤیدات جاہ و شہرت، مال و دولت سے مستغنی ہو جائے۔ اتنی بات تو صاف ہے، لیکن قلب کے اس تجلیہ کے بعد اس کا تجلیہ کس چیز سے ہو؟ کلبیہ کا جواب ہرنیکی سے! نیکی سے کیا مراد ہے؟ اس کا ایجابی تضمن کیا ہے؟ ارشاد ہوتا ہے کہ نیکی سے مراد "خواہشاتِ نفسانیہ سے قلب کا تزکیہ!!" اس دور سے کلبیہ نہیں نکلتے اور خود نیکی یا کمال کا کوئی ایجابی تضمن نہیں ان سے معلوم نہیں ہوتا یا پھر فلسفہ کی تاریخ میں یہ محفوظ نہیں کیا گیا۔

اب ہم اس تلاش میں یونان کے اس فلسفی کی طرف رجوع کرتے ہیں جس کی نگاہ زلزلہ عالم افکار ہے، جو یونان کا سب سے بڑا مفکر ہے، ہماری مراد افلاطون سے ہے۔ یونان کے مفکرین میں سب سے پہلے افلاطون ہی نے روح انسانی کی تشفی بخش نفسیات پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ روح انسانی کی تین ملکات میں تقسیم کرتا ہے جن میں سے ایک کی فطرت عقلی ہے اور دوسری غیر عقلی۔ سب سے ادنیٰ ملکات جو روح کا غیر شریف اور دنیٰ حصہ ہیں، وہ احساسات، خواہشات اور اشتہات ہیں۔ ان کی فطرت غیر عقلی ہے۔ ان میں نہ کوئی نظم ہوتا ہے نہ ترتیب، ان کا نہ کوئی اصول ہوتا ہے نہ قاعدہ! ضروری ہے کہ ان پر ایک اعلیٰ ملکہ کی حکمرانی ہو، قرمانی ہو، جو ان کو حد اعتدال میں رکھے، عفت و پاکبازی کے اصول کے تحت ان پر حکومت کرے! یہ اعلیٰ ملکہ عقل کا ہے جو اپنی فطرت کے لحاظ سے شریف ہے جو حکمت کا مقام ہے! جس طرح خواہشات اور اشتہات کا کام عقل کی فرمانبرداری و اطاعت پذیری ہے اسی طرح عقل کا فطری والی حق حکمرانی و قرمانی ہے۔ عقل جذبات و خواہشات پر حکمرانی کے لیے بنائی گئی ہے! ان دو ملکات کے درمیان روح کا تیسرا ملکہ ہے جس کو ہم اپنی زبان میں ارادہ سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ یہ احساسات و اشتہات کی طرح دنیٰ و رذیل نہیں، فطرۃ

مائل بشر نہیں۔ یہ خلقاً شریف ملکہ ہے اور حیب اس کی صحیح رہبری کی جاتی ہے تو یہ اعلیٰ کمالات کے حصول کا ایک قوی ذریعہ بن جاتا ہے لیکن چونکہ یہ بذات خود غیر عقلی ہے اور کورانہ جذبہ کی شکل اختیار کر سکتا ہے، لہذا اس کا مقام عقل سے فروتر ہے۔ عقل کا خادم ہے جس کو جذبات و اشتہات کو مطیع اور رام کرنے کے کام پر لگایا جاسکتا ہے! فلاطون ادنیٰ ملکات کا مقام جگر کو قرار دیتا ہے، عقل کا سر کو، اور ارادہ کا گردن سے نیچے کے حصہ کو، اس مقام کی وجہ سے وہ جذبات و خواہشات کو روک سکتا ہے اور عقل کی ہدایت و رہبری حاصل کر سکتا ہے۔

افلاطون کی رائے میں تینوں ملکات حقیقی معنی میں ایک دوسرے سے جدا و علیحدہ ہیں اگر فطرت انسانی کو کامل وحدت قرار دیا جائے تو پھر اس امر کی توجیہ کسی طرح نہیں کی جاسکتی کہ کیوں عقل کو اکثر دفعہ جذبات کے خلاف اپنی پوری قوت سے جنگ کرنی پڑتی ہے۔ سچ پوچھو تو عقل ہی روح ہے اور جو اس بدن کے محض وظائف ہیں۔ تاہم یہ نہ خیال کیا جائے کہ ان کے درمیان کوئی ربط و تعلق نہیں۔ ایسا نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ہلکے ادنیٰ ملکات اعلیٰ ملکات کی خدمت و اطاعت کے لیے ہیں، جسم روح کی خدمت گزاری کے لیے ہے۔ اس ربط و تعلق کو افلاطون نے ایک مشہور مثال کے ذریعہ واضح کیا ہے جو رتھ بان اور پردار گھوڑوں کی مثال کہلاتی ہے۔ ان دو گھوڑوں میں سے ایک شریف ہے اور دوسرا رذیل، اس لیے ان دو کو ایک ساتھ قابو میں رکھنا نہایت مشکل کام ہے۔ شریف گھوڑا ارادہ کی تعبیر ہے اور رذیل جذبات و خواہشات کی رتھ بان عقل ہے۔ شریف عنصر کا رخ آسمان کی جانب ہوتا ہے، اس کا رجحان و میلان علو و رفعت کی طرف ہے، وہ جمال و کمال کا دلدادہ ہے، لیکن جسم اس کو زمین کی طرف کھینچتا ہے، زمین کی لذتوں اور شہوتوں پر وہ جان دیتا ہے، ہر اچھی چیز کا تعلق شکم ہی سے قرار دیتا ہے یا پھر ساری کائنات کا محور و مرکز آلہ تناسل کو سمجھتا ہے، اور اسی کا شیفتہ و ربودہ ہے۔ اب رتھ بان یا عقل قہرماں کا کام ہے کہ اپنے ان دونوں گھوڑوں کو قابو میں رکھے،

ادنی و رذیل کو اعلیٰ و شریف کے تابع کر دے، ان کا رخ علو و رفعت کی جانب پھیر دئے نتیجہ کے طور پر روح میں عدالت کی صفت پیدا ہوتی ہے جو اس کا کمال ہے، یعنی روح کا کمال اس کے مختلف ملکات یا حصوں کا ایک خاص ربط و تعلق ہے جس میں ہر ملکہ یا حصہ اپنی فطرت و تہمت کے لحاظ سے اپنے صحیح مقام پر اپنے خاص فرائض کی ادائیگی میں مصروف ہو جاتا ہے اور وضع اللشہ علیٰ محلہ کے اصول کی تعمیل و تکمیل ہو جاتی ہے! فرد عقلمند و حکیم اس وقت سمجھا جاتا ہے جب عقل روح کے دوسرے ملکات پر حکومت کرتی ہے اور جانتی ہے کہ ان کی فلاح و بہبود کس چیز میں مضمر ہے۔ فرد میں شجاعت کی صفت کا اس وقت ظہور ہوتا ہے جب ارادہ، لذت و الم، کرب و طرب میں عقل کی ہدایت پر عمل کرتا ہے کہ کس چیز سے خوف کیا جائے اور کس چیز سے نہیں۔ اس میں عفت کی صفت اس وقت ظاہر ہوتی ہے جب ارادہ اور جذبات و شہوات عقل کے حکم و اقتدار کا اتباع کرنے لگتے ہیں جب عقل، ارادے اور شہوتوں میں توافق و ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے۔ یعنی ہر ایک اپنا مناسب فرض ادا کرنے لگتا ہے تو فرد میں عدالت کی صفت کا ظہور ہوتا ہے۔ اجماعاً فضائل ہی چار ہیں: حکمت و شجاعت، عفت و عدالت۔

اب انسانِ کامل کی روح میں کامل توافق، ہم آہنگی و ربط پایا جاتا ہے، جس میں اعلیٰ کا ادنیٰ پر کامل اقتدار ہوتا ہے جس کی وجہ سے حکمت، شجاعت، عفت و عدالت کی صفات حسنہ اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ متجلی ہوتی ہیں، اور یہی صفات جملہ فضائل کا مبداء و منبع ہیں، تمام محاسن کا ان ہی سے ظہور ہوتا ہے! ان کا حامل انسانِ کامل ہے، اپنی قیمت کے لحاظ سے "دارلئے دو جہان" ہے! گو "کشتگانِ شہوت" کی نظر میں حقیر و صنیر ہی کیوں نہ ہو۔

پیشِ خلقاں خوار و زار و ریش خند پیشِ حق محبوب و مطلوب و پسند! (ردی)

انسان جسم و روح پر مشتمل ہے، جسم عناصر کثیر سے مرکب ہے اور روح میں کئی ملکات پائے جاتے ہیں، اس طرح انسان ایک کثرت ہے لیکن جب جسم کو روح کا تابع کر دیا جاتا ہے اور روح کے مختلف ملکات عقل کے منقاد ہو جاتے ہیں تو اب انسان میں ایک وحدت پیدا ہو جاتی ہے، ایسی

وحدت جس کی تکوین مختلف عناصر سے ہوئی ہے اور جو اپنا طور کثرت میں کرتی ہے۔ اسی لیے افلاطون کہتا ہے کہ کمال توافق، ہم آہنگی یا وحدت کا نام ہے اور مردِ کامل وہ مطرب (Musician) ہے جو گویا مختلف آوازوں کی ترتیب سے ایک دلفریب نغمہ پیدا کرتا ہے۔ یہ دلفریب نغمہ توحید کا نتیجہ ہے؛ چونکہ حق تعالیٰ واحد میں لہذا کمال یا فضیلتِ عدالتِ افلاطون کے الفاظ میں "تشبہ باللہ" ہے۔

اس وحدت یا کمال کا لازمی، ضروری قطعی نتیجہ مسرت ہے۔ روح انسانی کی فطری خوبی یہی کمال یا فضیلت ہے اور اس کا فطری نتیجہ مسرت ہے۔ انسانِ کامل ہمیشہ مسرور و شاداں ہوتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ لکد کو ب جہان سے بالکل محفوظ نہیں ہوتا؛ اس کے دوست و احباب اس کے ساتھ بے شرمی کا برتاؤ کر سکتے ہیں، وہ کورا نہ نفرت کا شکار ہو سکتا ہے، اس کو کشاں کشاں زندان میں جھونکا جا سکتا ہے، اور تازیانہ کی سزادی جاسکتی ہے، وہ اپنے مصائب کا انجام سولی پر پا سکتا ہے، تاہم "عدالت کے سوا ہر چیز کو کھو کر وہ مسرور و شاداں ہو سکتا ہے؛ اس کی روح نغمہ الہی کی گونج سے ہمیشہ فرح و انبساط، ذوق و مستی کی حالت میں ہوتی ہے، وہ اغیار سے مخاطب ہو کر کہتا ہے:

کیست زو بہتر بگو ایسے مہج کس      تابداں دلی شاداں باشی یک نفس

من نہ شادی خواہم و نہ خسروی      انچہ می خواہم من از تو ہم توی (ردی)

افلاطون کا یہ بیان حکمتِ ایمانی کی نظر میں اسی وقت کامل مانا جائیگا جب عقل کو بھی شرع کے تحت کر دیا جائے:

صبح ازل یہ مجھ سے کہا جبرئیل نے

جو عقل کا غلام ہو وہ دل نہ کر قبول (اقبال)

## امام غزالی کا فلسفہ مذہب

کس را پس پردہ قضا را نشد  
وز سرت در پیش کس آگاہ نہ نشد  
ہر کس ز سیر قیاس چیزے گفتند  
معلوم نگشت وقتہ کوتاہ نہ نشد (غزالی)

میری تحقیق کی رو سے (اور مجھے اپنے عجز کا اعتراف ہے) "فلسفہ عقل و استدلال کے ذریعہ کسی شے کی آخری و انتہائی حقیقت کو دریافت کرنے کی کوشش کا نام ہے اور فلسفہ اپنی موزوں ترین شکل میں تمام موجودات کی انتہائی ماہیت کو دریافت کرنے کی سعی کے سوا کچھ نہیں"

اس کے برخلاف سائنس کا سارا تعلق عالم مظاہر سے ہے، سائنس واقعات تجربیہ کا سادہ سے سادہ الفاظ میں کامل و متوافق بیان ہے۔ عالم سائنس۔ مظاہر عالم کے ایک مجموعہ کا مطالعہ کرتا ہے۔ وہ متعلقہ واقعات کو جن کی اس کو تحقیق کرنی ہو جمع کرتا ہے، پھر ان کی تعریف و تحدید کرتا ہے، پھر ان کی تحلیل و ترکیب کی طرف توجہ کرتا ہے، پھر ان کا اصطفا کرتا ہے پھر پھر ان شرائط یا علل کا مطالعہ کرتا ہے جن کے تحت یہ وقوع پذیر ہو رہے ہیں ان کی یکسانیت عمل کا تعین کرتا ہے، یعنی ان کے قوانین عمل کو دریافت کرتا ہے اور آخر میں ان کو ایک مربوط و مرتب مقالہ کی صورت میں پیش کر دیتا ہے اور یہاں پر اس کا کام عالم سائنس کی حیثیت سے ختم ہو جاتا ہے، یعنی اُس نے واقعات تجربیہ یا مظاہر کا سادہ الفاظ میں کامل و منضبط بیان پیش کر دیا، ان کے طرز وقوع و طریقہ عمل کو سمجھا دیا! غرض عالم سائنس کا کام اس عالم شہادت سے ہے۔ اس کی نگاہ واقعات اور مظاہر کی جانب لگی رہتی ہے، اس کی توجہ تجربات کی طرف ہوتی ہے۔ اشیاء کے باہمی ربط کو وہ دریافت کرتا ہے، ان کے پیش کرنے میں وہ حزم و احتیاط سے

لے یہ مقالہ نشر گاہ حیدرآباد دکن سے نشر کیا گیا۔



کام لیتا ہے اور اس طرح وہ ان قوانین و علل کو معلوم کر لیتا ہے جن کے تحت عالم شہادت کے واقعات ظہور پذیر ہو رہے ہیں۔ اس علم سے اس کو قوت حاصل ہوتی ہے اور کائنات کی تسخیر میں وہ کامیاب ہوتا ہوتا ہے !

عالم سائنس کے برخلاف فلسفی کو عالم غیب کی تلاش ہوتی ہے۔ وہ مظاہر کے ماوراء پہنچ کر حقائق اشیاء کا علم حاصل کرنا چاہتا ہے، حقائق کے انتہائی علوم پر مطلع ہونا چاہتا ہے اس حقیقت کی اہمیت سے واقف ہونا چاہتا ہے جو انتہائی و آخری حقیقت ہے جو اشیاء کا باطن ہے، جو باوجود اشیاء میں شدت ظہور کے غیب الغیب ہے، جس کا علم انسان کے حواس و قیاس و ادراک و فہم و عقل کے لیے مستور ہے۔ اس غیب کے علم کی طلب انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ اس کی جستجو و طلب ہی نے اس کو حیوان سے ممتاز کر رکھا ہے۔ اس کے تمام علوم و فنون، حکمت و فلسفہ اسی غیب کے یقین اور اس کی پیہم جستجو کا نتیجہ ہیں ! اسی غیب کی یافت کی ترپ میں وہ تن کی پرورش کو بھی ایک حقیر و ذلیل عمل قرار دیتا رہا ہے !

لیکن جن غیبوں تک انسان اب تک پہنچ سکا ہے وہ صحیح معنی میں غیب نہیں بلکہ ہمارے عالم شہادت ہی کے ذرا مخفی اور دور افتادہ گوشے ہیں جن کو محض اضافی یا اعتباری غیب کہا جاسکتا ہے ! غالب نے اس حقیقت کو کس خوبی سے ادا کیا ہے :

ہر غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود ہیں خواب میں ہنوز جو جگے ہیں خواب میں  
باقی اصلی اور حقیقی غیب یا "غیب الغیب" تک انسانی عقل اور ذراغ علم کی رسائی کسی کو بھی نہیں ہو سکتی ! قُلْ إِنَّمَا الْغَيْبُ لِلَّهِ (پارہ ۱۱) یعنی غیب کا علم صرف اللہ ہی کو ہے کہہ کر قرآن اس حقیقت کو واضح کر رہا ہے اور انسان سے اس علم کی قطعی نفی کر رہا ہے۔

تاریخ فلسفہ پر ایک نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ فلسفہ میں ادعائی نظامات کے پیش ہونے کے بعد ہی جب غیب کے کلی یقینی علم کا فلسفیوں نے دعویٰ کیا تو ارتیا بیت اور لاادریت نے ان کے ان بلند بانگ دعوؤں کی شدت سے تردید شروع کر دی اور انسانی علم

گو عالم شہادت ہی تک محدود کر دیا۔ ہیوم نے فلسفہ جدید میں نہایت قوت کے ساتھ واضح کر دیا کہ انسان کا سارا علم مظاہر ہی کی حد تک محدود ہے، کیونکہ اس کا دار و مدار ارتسامات یا ان کی نقل "تصورات" پر ہے، لہذا محسوس ہی کو ہم 'موجود' کہہ سکتے ہیں اور 'غائب' کا ہمیں کوئی علم نہیں ہو سکتا۔ ہیوم کی ارتیابیت نے کانت کو اس کے خواب ادعائیت سے جگایا اور جاگنے کے بعد اس کی تحقیق کا نتیجہ یہ نکلا کہ حقائق اشیاء کا علم نہ صرف یہ کہ اب تک انسان کو حاصل نہیں ہوا بلکہ عقل و استدلال کی راہ سے ہمیشہ کے لیے ناممکن الحصول پر حقائق اشیاء کو کانت کی اصطلاح میں 'بواطن' (Noumena) کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے اور انسانی علم اس کے مقابلہ میں 'ظواہر' (Phenomena) یا قرآن کی اصطلاح میں "عالم شہادت" تک محدود ہے! تاریخ فلسفہ میں غزالی ہی وہ اولوالعزم اور جلیل القدر فلسفی ہیں جنہوں نے وجدان ان حقائق کو پیش نظر رکھ کر عقل نظری کو علم وحی کے تابع کر دیا اور مشکوٰۃ نبوی سے اخذ نور کر کے کائنات کے متعلق وہ نظریہ پیش کیا جو گو "ماوراء طور عقل" (Supra-rational) ضرور ہے لیکن قطعاً خلاف عقل (Contra-rational) نہیں، جس سے واقف ہو کر انسان اس صداقت کا قائل ہو جاتا ہے:

باہر کمال اندکے آشننگی خوش است ہر چند عقل کل شدہ بے جنوں مباش  
 غزالی عقل و ایمان (جن کو جنون الہی سے تعبیر کیا جاتا ہے) حکمت و شریعت 'علم استدلالی' و  
 'قبول ایمانی' کے وجدانات سے استفادہ کر کے ہمیں اس حقیقت الحقائق سے مانوس کر دیتے ہیں  
 جن کے یافت و حصول کی تڑپ فطرت انسانی میں روز آفرینش ہی سے موجود ہے۔ اسی لیے مجھو  
 ان کا فلسفہ سب سے زیادہ پسند ہے۔ ہم اس مختصر تحریر میں ان کی اسی یافت کے چند روشن پہلوؤں  
 کی طرف آپ کی توجہ مبذول کر رہے ہیں۔

غزالی نے اہل عقل کی توجہ اس روشن حقیقت کی طرف منعطف کی کہ جو ہر انسانی

اپنی اصل فطرت کے اعتبار سے بالکل سادہ پیدا کیا گیا ہے اور اس کو حق تعالیٰ کے لاتعداد عالموں کی ابتداء میں کچھ خبر نہیں ہوتی۔ اس کو عالم کی خبر ادراک کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے۔ اس کا ہر ادراک اس غرض کے لیے پیدا کیا گیا ہے کہ اس کے ذریعہ وہ موجودات کے کسی خاص عالم کا علم حاصل کرے۔ سب سے اول انسان میں قوتِ لامسہ پیدا ہوتی ہے جس کے ذریعہ وہ موجودات کے بہت سے عوالم کا ادراک کرنے لگتا ہے۔ مثلاً گرمی، سردی، خشکی، تری، سختی، نرمی، گرمیہ قوت رنگ اور آوازوں کے ادراک سے بالکل قاصر ہے۔ ہنگامہ رنگ و صوت اس کے لیے قطعاً معدوم ہوتا ہے! لامسہ کے بعد انسان میں قوتِ باصرہ پیدا ہوتی ہے جس کے ذریعہ وہ رنگ اور شکلوں سے واقف ہوتا ہے، عالم کی رنگینیوں کا مشاہدہ کرتا ہے! پھر قوتِ سامعہ بیدار ہوتی ہے جس کے ذریعہ وہ آوازوں اور نعموں کو سنتا ہے اور کیف اندوز ہوتا ہے پھر انسان میں قوتِ ذائقہ پیدا ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہ مختلف لذتوں سے بہرہ یاب ہوتا ہے!

اب وہ عالمِ محسوسات کے دائرہ سے آگے قدم اٹھاتا ہے اور سات سال کی عمر کے قریب اس میں قوتِ تمیز پیدا ہوتی ہے! یہ حالت اس کے اطوارِ وجود میں سے ایک طور ہے اور اس حالت میں وہ ایسے امور کا ادراک کرنے لگتا ہے جو عالمِ محسوسات سے ماورا ہوتے ہیں! پھر وہ ترقی کرتا ہے اور اس حالت پر فائز ہوتا ہے جس میں اس کے لیے عقل پیدا کی جاتی ہے اب وہ واجب و محال، ممکن و ناممکن، جائز و ناجائز کا ادراک کرنے لگتا ہے جن کا شعور اس کو پہلی حالتوں میں حاصل نہ تھا!

غزالی بتلاتے ہیں کہ عقل کی سرحد کے ماورا ایک اور درجہ بھی ہے جس میں انسان کی دوسری آنکھ کھلتی ہے، جس کے ذریعہ وہ غیب کی چیزوں کا مشاہدہ کرتا ہے اور ایسے امور کا ادراک کرنے لگتا ہے جن کے ادراک سے عقل ایسی ہی قاصر ہے جیسے قوتِ تمیز ادراکِ معقولات سے اور قوتِ حسِ مدرکاتِ تمیز سے! اسی درجہ کا نام نبوت ہے!

بعض لوگ اس درجہ کے منکر ہیں، لیکن ان کا یہ انکار عین جہالت ہے اور اس انکار کی اس کے سوا کوئی وجہ نہیں کہ وہ خود اس حالت پر فائز نہیں ہوئے اور چونکہ ان کے حق میں یہ حالت کبھی موجود نہیں ہوتی اس لیے وہ گمان کرتے ہیں کہ یہ حالت فی نفسہ موجود نہیں، عدم علم سے وہ عدم وجود کا استنباط کرتے ہیں! اگر اندھے کو متواتر روایت کے ذریعہ رنگوں اور شکلوں کا علم نہ ہوتا اور اول مرتبہ ان امور کا اس کے سامنے ذکر کیا جاتا تو وہ ان کو ہرگز نہیں سمجھتا اور ان کا کبھی اقرار نہ کرتا!

اہل عقل کا نبوت کے درجہ سے انکار ایک معنی میں جائز ہے۔ غزالی خود صراحت کرتے ہیں کہ "تصدیق تو ہمیشہ سمجھنے کے بعد ہوتی ہے" بغیر سمجھنے کے کسی چیز کی تصدیق سخت دشوار ہے۔ اس لیے وہ نبوت کی خاصیت کا ایک نمونہ خود انسان کے تجربات زندگی ہی میں پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ایسے روشن نمونے اور صاف مثال کے بعد انکار کی کوئی وجہ باقی نہیں رہتی، ذرا اس نمونہ پر غور کرو۔ یہ نمونہ خواب ہے۔ دیکھو خواب میں انسان کو بعض دفعہ ہونے والے واقعات کا صحیحاً علم ہو جاتا ہے یا تمثیل کی صورت میں ان کا انکشاف ہوتا ہے جو تعبیر کے ذریعہ سمجھ میں آ جاتے ہیں (*Veridical Dreams*) اس بات کا اگر انسان کو خود تجربہ نہ ہو ہوتا اور اس سے یہ کہا جاتا کہ بعض وقت آدمی مردہ کی مانند بے ہوش ہو جاتا ہے، اس کی قوتِ حس، اس کی شنوائی و بینائی زائل ہو جاتی ہے اور غفلت و ذہول کی اس حالت میں اس کو غیب کا ادراک ہوتا ہے، وہ ہونے والے واقعات کا مشاہدہ کرتا ہے۔ تو یہ سن کر انسان اس کے ملنے سے قطعاً انکار کرتا ہے، اس کو محال قرار دیتا ہے اور اس پر یوں دلیل قائم کرتا ہے کہ آلاتِ ادراک تو قوتِ حسی ہی ہیں جس شخص کو ان آلات کی موجودگی کی حالت میں ایسے واقعات کا ادراک نہیں ہو سکتا تو پھر ان قوتی کے معطل و زائل ہو جانے کے بعد کس طرح علم ہو سکتا ہے؟ مگر اس قسم کے قیاس کی تردید کیا وجود اور مشاہدہ سے نہیں ہو رہی ہے؟ جس طرح عقل کے ذریعہ انسان کو وہ نظر حاصل ہوتی ہے جو تعلقات و تصورات کا مشاہدہ کرتی ہے جن کے ادراک سے جو اس بالکل قاصر ہیں، بالکل اسی طرح نبوت سے



مراد ایک ایسی حالت ہے جسکی وجہ سے ایسی نورانی نظر حاصل ہو جاتی ہے کہ اس کے ذریعہ امور غیب اور وہ امور جن کا عقل قطعاً ادراک نہیں کر سکتی ظاہر ہونے لگتے ہیں، لہذا

بند احکامِ عمتل میں رہنا یہ بھی ایک نوع کی حماقت ہے (رد)

ان فلسفیوں کو جو عقلیت کے پرستار ہیں اور عقل کے سوا علم و عرفان کے کسی اور ملکہ اور قوت کے قائل نہیں، نبوت کے درجہ کی خبر دے کر، اس کے واضح اور جاگرمونہ کو خود ان کے تجربہ میں مبتلا کر اور یہ ثابت کر کے کہ حقائقِ ایمان کی یافت میں عقل کی آنکھ اتنی ہی معتبر ہے جتنی کہ مادر زاد اندھے کی آنکھ رنگوں کے ادراک میں، اغزالی ارکان و حدود شرعی کی حقیقت کو مشکوٰۃ بنوی سے اخذ کر کے فلسفیانہ طریقہ پر اس کی جو تفہیم کرتے ہیں وہ بڑی دلچسپ ہے:

زیر شمدیک انگشتِ سائلم بلبت از لذت اگر محو نگردی تفت کن

فرماتے ہیں کہ انسان دو چیزوں سے بنایا گیا ہے: جسم اور قلب۔ قلب سے مراد حقیقتِ روحِ انسانی ہے جو عرفانِ الہی کا محل ہے، نہ وہ گوشت و خون کا ٹکڑا جس میں مردے اور چارپائے بھی شریک ہیں، اور یہی وہ چیز ہے جس کے لیے جسم ایک آلہ کی حیثیت رکھتا ہے جسم کی صحت جسم کے لیے باعثِ سعادت ہے اور اس کا مرض اس کے لیے باعثِ ہلاکت۔ اسی طرح قلب کے لیے بھی صحت و عاقبت کی ایک حالت ہوتی ہے اور مرض و تکلیف کی ایک کیفیت، جیسا کہ قرآن میں اشارہ کیا گیا ہے کہ *فِي قُلُوبِهِمْ مَّرَضٌ* (ان کے دلوں میں بیماری ہے) اللہ کا نہ جاننا زہرِ مملک ہے اور خواہشاتِ نفسانی کی پیروی کر کے احکامِ الہی کو ترک کرنا اور معصیت میں مبتلا ہونا قلب کا سخت روگ ہے۔ اللہ کی معرفت اس کے لیے زندگی بخش ترقی ہے اور خواہشاتِ نفسانی کی مخالفت اور احکامِ و اوامرِ الہی کی متابعت اس کے لیے دوائے شافی ہے۔ جس طرح بدن کا علاج دوائے استعمال ہی سے ہو سکتا ہے اسی طرح قلب کے امراض کا معالجہ بھی دواؤں کے استعمال ہی سے ممکن ہے جس طرح حصولِ صحت جسمانی میں دواؤں کی تاثیر



کو عقلاء اپنی بضاعتِ عقل سے نہیں سمجھ سکتے بلکہ اس میں ان کو اطباء کی تقلید واجب ہے اسی طرح انبیاء نے امراضِ قلبی کے علاج کے لیے جو عبادتیں خاص حد و مقدار میں مقرر کی ہیں ان کی وجہ تاثر کا سمجھنا بھی عقلاء کی بضاعتِ عقل کے لیے ممکن نہیں، ان کو انبیاء کی تقلید واجب ہے۔ انبیاء نے ان خواص کو نورِ نبوت سے معلوم کیا ہے نہ کہ بضاعتِ عقل سے۔ نیز جس طرح دوائیں نوع اور مقدار سے مرکب ہوتی ہیں کہ ایک دوا دوسری دوا سے وزن و مقدار میں مضاعف استعمال کی جاتی ہے اور ان کی مقدار کا اختلاف حکمت سے خالی نہیں ہوتا، اسی طرح عبادات بھی جو دوائیں ہیں امراضِ قلوب کی مختلف نوع و مقدار کے افعال سے مرکب ہوتی ہیں، مثلاً سجدہ رکوع سے دو چند ہوتا ہے، نماز فجر مقدار میں نماز عصر سے نصف ہوتی ہے! یہ مقداریں اسرار سے خالی نہیں اور یہ اسرار ان خواص میں سے ہیں جن سے نورِ نبوت کے سوا کسی اور کو آگاہی نہیں ہوتی! جو شخص طریقِ عقل سے ان امور کی حکمت کو جاننا چاہتا ہے یا ان کے متعلق یہ خیال کرتا ہے کہ محض اتفاقی طور پر مذکور ہوئے ہیں اور ان میں کوئی ایسا راز نہیں جو بطریقِ خاصیت موجب حکم ہوا ہو، وہ نہایت احمق اور جاہل ہے!

غرض انبیاء، امراضِ قلوب کے طبیب ہوتے ہیں جن کے احکام کی تعمیل شفا کے قلبی کے طالبوں کے لیے اتنی ہی ضروری ہے جتنی کہ شفا کے بدنی کے جو یا کے لیے امراضِ جسمانی کے طبیبوں کی ہدایتیں۔ اور عقل کا فائدہ صاف ظاہر ہے، اسی کے ذریعہ ہیں اس نکتہ کا علم ہوتا ہے! وہ نبوت کی تصدیق کرتی ہے اور خود کو ان امور کے ادراک سے عاجز پاتی ہے جن کو نورِ نبوت نے اور منکشف پاتا ہے! عقل ہمارا ہاتھ پکڑ کر اسی طرح نبوت کے حوالہ کر دیتی ہے جس طرح اندھوں کو زاہر اور مخیر مرصیوں کو طبیبِ شفیق کے حوالہ کر دیا جاتا ہے۔ عقل کی رسائی اور اس کی پرواز بس ہمیں تک ہے، اس سے آگے وہ قدم نہیں بڑھا سکتی! اب طبیب جو کچھ سمجھائے سمجھ لینا چاہیے، اور اس کی ہدایتوں پر کار بند ہونا چاہیے! اسی مفہوم کو حضرت اقبال نے اپنے الفاظ میں یوں ادا کیا ہے:

خرد سے راہِ روشن بصر ہے خرد کیا ہے؟ چراغِ رہز رہے!  
 دروینِ خانہ ہنگامے ہیں کیا کیا۔ چراغِ رہز کو کیا خبر ہے؟ (ہاں جبریل)

گزر جا عقل سے آگے کہ یہ نور چراغِ راہ ہے منزل نہیں ہے (۱۱)  
 جب عقل جذبات اور شہوات کے اثر سے بہک کر نورِ نبوت کا انکار کرتی ہے اور خود غیب کے  
 دائرہ میں قدم زن ہوتی ہے تو اب اس کے ارشاداتِ عالیہ کی قیمت ان مستی کے اندھوں سے بھی  
 گری ہوئی ہوتی ہے جو کبھی کبھی مرغی بغیر مرغ کے دینے لگتی ہے اور اس قسم کی عقل والے کی باتیں  
 سن کر ہم کہہ اٹھتے ہیں۔

ماکیاں کز زورِ مستی خایہ گیر دے بے خروس  
 یہ ہیں غزالی کی یافت کے چند روشن پہلو! وقت کی تنگ دامانی ہمیں مزید تفصیل کی  
 اجازت نہیں دیتی ورنہ

نہ جنش غایتے دارد نہ سعدی را سخن پایاں  
 ہمیر تہ نہ مستقی و دریا ہچماں باقی!

## تصحیح فکر

اے برادر تو ہمیں اندیشہ مابقی استخوان و ریشہ  
گر گل است اندیشہ تو گلشنی و ر بود خاکے تو ہمہ گلشنی (دوہی)

افکار و خیالات ہی سے مقاصد و غایات کا تعین ہوتا ہے، مقاصد کردار، افعال و اعمال میں ظہور پذیر ہوتے ہیں، افعال ہی کی تکرار سے عادت قائم ہوتی ہے، عادات کی تنظیم و ترتیب سے سیرت تشکیل پاتی ہے اور سیرت ہی ہماری قسمت کا تعین کرتی ہے، جیسی سیرت ویسی قسمت! لہذا جیسے خیالات ویسی کائنات۔ انا عند ظن عبدی بی۔

یہ قانون ذہن کے دائرہ میں وہی صداقت و اہمیت رکھتا ہے جو قانون تجاذب دائرہ فطرت میں، قطعی و یقینی، جب سیرت اور قسمت کی تشکیل و تعین میں افکار و خیالات ہی کی کار فرمائی ہے تو ظاہر ہے کہ ہر شخص کے لیے اپنے افکار و خیالات کی اصلاح اس کا اپنا نہایت اہم فریضہ ہے قوم سازی اور فرد کی روح کی تکمیل اصلاح خیال پر منحصر ہے۔  
یک تنقیہ دماغ می باید کرد

مقاصد و غایات کا دائرہ ذہن انسانی ہے، انسان کا کوئی فعل مصلحت و غایت سے خالی نہیں ہوتا، اب مقاصد کا تعین غور و فکر سوچ اور بچار پر منحصر ہے، فکر ہی کائنات کی سب سے زیادہ عظیم الشان قوت ہے، اور یہی ان دنوں انسان میں سب سے زیادہ غیر تربیت یافتہ قوت ہے، اس کی تربیت ہی کے متعلق مجھے یہاں کچھ کہنا ہے۔

۱۔ یہ مقالہ "بزم فلسفہ" کی کرسی نشینی کے موقع پر سنایا گیا جو جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن کے شعبہ فلسفہ کی بزم مباحثہ اور معارف اپریل ۱۹۳۵ء میں شائع ہوا۔

فرض کیجیے کہ آپ کو ایک باغ لگانا ہے، اس کے لیے آپ کو چند قوانین پر عمل کرنا ہوگا، جن کو باغبانی کے قوانین سے تعبیر کیا جاتا ہے، سب سے پہلی چیز تو یہ دریافت کرنی ہے کہ باغ لگایا کہاں جائے، پھر اس جگہ کو مسطح اور خس و خاشاک سے پاک کرنا ہوگا، یہ چیز سب سے زیادہ اہم ہے، پھر ہمیں پھولوں یا ترکاریوں کے بیج کا انتخاب کرنا چاہیے، اور اس عمدگی سے تیار کی ہوئی زمین میں انہیں بونا چاہیے ہمیں اس امر کا بھی خیال رہے کہ بیج عمدہ ہیں، ناقص نہیں، پھر موسم گرما میں ان بیجوں کو پانی دینا پڑتا ہے، تاکہ شدتِ تمازت انہیں جلانہ ڈالے، اب ہمیں انتظار کرنا پڑتا ہے کہ وقت مقررہ گزر جائے اور بالآخر گل تر رونمائی کرے، اگر بے صبری سے ہم بیجوں کو کھود کر دیکھنا چاہیں کہ یہ جیل تو نہیں گئے، تو پھر ان بیجوں کو نشوونما کا موقع نہیں ملیگا، بعض دفعہ ہمیں کچھ زیادہ دن انتظار کرنا پڑتا ہے، لیکن اگر ہم نے زمین کو خس و خاشاک سے اچھی طرح پاک کیلے، بیجوں کے انتخاب میں غلطی نہیں کی، آبیاری کی ہے، تو ہمیں یقین ہے کہ ایک دن زندگی دامن زمین چیر کر پودوں کی شکل میں جلوہ افروز ہوگی، اسی زمانہ میں ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ باد و باراں، آفتاب و حرارت بیجوں کے نشوونما کے لیے ضروری ہے، طوفان تک انہیں نقصان نہیں پہنچا سکتے، عناصر ان کے دشمن نہیں، ساری کائنات اور کائنات کی ساری قوتیں ان کے ساتھ اشتراک عمل کر رہی ہیں!

فرض کرو کہ انتظار کی مدت بجز اللہ گزرتی، باریک بیجوں نے خوش رنگ و دلفریب لالہ و یاسمن کی شکل اختیار کی، فطرت کا زبردست لیکن مانوس معجزہ ہماری آنکھوں کے سامنے پیش ہوا، شروع ہی سے ہم جانتے ہیں، اور یہ علم مرتبہ یقین تک پہنچا ہے کہ جس پھول کا بیج ہم نے بویا ہے وہی پھول والا پودا رونما ہوتا ہے، اور ہزاروں باریکیوں کے ساتھ اپنے اندر ان تمام چیزوں کا اعادہ کرتا ہے جو اس پودے میں پائی جاتی ہیں جس کا یہ بیج ہے، کیا اس بیج کو اصلی پھول کی نہ بھولنے والی صورت یاد رہتی ہے؟

پھول کی غایتِ تخلیق سے تو ہم واقف نہیں، لیکن اتنا ضرور جانتے ہیں کہ یہ ہمارے

دل کا سرور آنکھوں کا نور ہے، کسی کے پاکیزہ الفاظ میں ہم اس کو "ربیعِ قلبی، نورِ بصری، جلاِ جزئی" زہابِ ہمّی" کہہ سکتے ہیں!

باغبانی کے یہ قواعد تو آپ سب جانتے ہی ہیں، کوئی بات نئی نہیں، لیکن میری دانست میں نئی بات جو آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں، وہ یہ ہے کہ بالکل انہی قواعد و قوانین کے استعمال و پابندی سے آپ دنیا کی تمام حسین و خوشگوار چیزوں کو حاصل کر سکتے ہیں، جو زندگی کہ بیج میں مستور ہے، وہی ہم میں سے ہر ایک میں موجود ہے، ان چیزوں کے حصول کے لیے ہمیں زندگی کی ویسی ہی خدمت کرنی پڑتی ہے جیسی کہ ان پھولوں کے بچوں کی ہم نے کی تھی۔

دلفریب پھولوں کے لیے آپ نے خارج (عالمِ اکبر) میں باغ لگایا تھا، شادمانی و مسرت کے حصول کے لیے آپ کو باطن (عالمِ اصغر) میں باغ کے لیے زمین تیار کرنی ہے، شاید آپ کو علم نہیں کہ اس کا محل وقوع ٹھیک کہاں ہے؟ یہ باغ آپ کو اپنے "میدانِ فکر" میں لگانا ہے، کیا آپ کو یہ معلوم ہے کہ ہم میں سے ہر ایک کے ہاں ایک عظیم الشان میدانِ فکر موجود ہے جس کی وسعت کو ارض و سما نہیں پاسکتے، صرف ہمارا دل ہی اس کو سما سکتا ہے، افسوس ہے کہ یہ میدانِ خس و خاشاک سے پٹا پڑا ہے، یہ جانتے ہو کہ یہ خس و خاشاک کیا ہے؟ وہی سلبی افکار و خیالات جن کو مختصر طور پر شرانگیز، بد، غلط خیالات کہنا کافی ہوگا، واقفانِ راز کا اصرار ہے کہ یہی ہمارے تمام مصائب و آفات کا سرچشمہ ہیں، ان سے ذہن و قلب کو پاک و صاف کرنا چاہیے۔ اس راز کو سمجھنے کے لیے اس نفسیاتی قانون پر غور کرو، جس کا ہم نے ابتدا ہی میں ذکر کیا ہے، افکار و خیالات ہی سے ہم زندگی کے مقاصد کا تعین کرتے ہیں، اب یہ مقاصد ہی محرک بن کر ہمیں عمل پر آمادہ کرتے ہیں، اعمال کی تکرار عاداتِ راسخہ کے قیام کا باعث ہوتی ہے، اور سیرت سوائے ان عاداتِ راسخہ کے منظم مجموعہ کے کوئی اور چیز نہیں اور ہماری سیرت ہی ہماری قسمت کا دوسرا نام ہے! سلبی خیالاتِ فاسد مقاصد



کا تعین کرتے ہیں، انہی سے تو شر کا صدر ہوتا ہے، شر کا ارتکاب عادت بن کر سیرتِ بدی کی تشکیل کرتا ہے، اب میکانیکی طور پر بغیر غور و فکر کے شر ہی کا صدر ہونے لگتا ہے، اور شر کے نتائج و ثمرات سے ہم سب واقف ہیں، درد و رنج، غم و الم، حزن و یاس۔

میدانِ فکر کا سببی خیالات کے خس و خاشاک سے پاک ہونا ضروری ہے، اور نیک خیالات کی تخم ریزی لازمی، سببی خیالات کو دور کرنے کا طریقہ ان سے جنگ کرنا نہیں، ان کا زور مردا فلگن ہوتا ہے، جب ہم ان سے مقابلہ کرتے ہیں تو ظاہر ہے کہ ہماری ساری توجہ ان ہی کی طرف لگی ہوتی ہے، آپ حیات (یا چشمہ حیات) کا بہاؤ توجہ کی طرف ہوتا ہے، بالفاظِ دیگر، اگر ہم کسی گناہ یا شر کی جانب توجہ کریں، اس کے استیصال کی خاطر سہی، تو زندگی کی تمام قوتیں اس کی جانب رُخ کرتی ہیں، اس طرح اس کی طاقت میں اور اضافہ ہوتا ہے، مثلاً اگر ہمیں بے خوابی کا مرض ہے، تو ہم جس قدر اس کے متعلق فکر کریں گے اور اس کو دور کرنا چاہیں گے، بالفاظِ دیگر اس کا مقابلہ کریں گے، اسی قدر یہ تکلیف زیادہ ہوتی جائیگی، اس کے برخلاف اگر ہم اس کو بھول جائیں تو ہم ٹھنڈی نیند سو جائیں گے، اسی طرح شر کے مقابلہ سے اس کی طرف توجہ ہوتی ہے، اور توجہ سے اس کی قوت میں اضافہ ہوتا ہے۔

شر کا مقابلہ خیر سے کرنا چاہیے، ظلمت کا مقابلہ نور سے۔ ظلمت کو دور کرنا ہو تو نور کو داخل کرنا چاہیے، ظلمت کا مقابلہ ظلمت سے کرنا "ظلمات فوق ظلمات" کا مصداق بنتا ہے۔ اگر ہمیں نفرت کو دور کرنا ہو تو محبت کا تصور کرو، خوف کو دور کرنا ہو تو شجاعت و بہمت پر نظر جاؤ، خود غرضی کے بجائے ایثارِ نفس کا خیال رکھو، اسی طرح ہمیں غصہ کے بجائے علم، بیماری کی بجائے صحت، کج خلقی کے بجائے خوش خلقی، شکایت کے بجائے صبر و شکر، خلق کی

لہ احادیث میں خطرات و وسوس کو دور کرنے کے لیے بعض اذکار یا مطلق ذکر کی ترغیب دی گئی ہے، اوپر جو علاج پیش کر رہے ہیں، اس کا استنباط ان ہی احادیث سے کیا گیا ہے، جو عجیب الاثر نفسیاتی طریقہ ہے۔

جہ سائی کے بجائے رازقِ مطلق کا خیال اپنے ذہن میں جمانا چاہیے، تمہارا معروضِ فکر جو ہوگا رفتہ رفتہ وہی تم بھی بن جاؤ گے، یہی معنی ہیں جامی سامی کے اس قولِ ہلیغ کے ۷

گردِ دلِ تو گلِ گزرو گلِ باشی      در بلبلِ بے ستر از بلبلِ باشی

تو جزویِ حقِ کلِ است اگر روزِ چند      اندیشہ کلِ پیشہ کنی کلِ باشی

اس فکر کے ایک دوسرے اعتبار پر غور کرو، دنیا میں وہی چیز بُری ہے جس کو ہم بُرا سمجھتے ہیں، اگر ہم اس کو بُرا نہ سمجھیں تو ممکن ہے کہ وہ ہمارے جسم کو آزار پہنچائے، لیکن وہ ہمارے قلب کو چھو نہیں سکتی، یاد رکھو دنیا میں ہر چیز کی قیمت رائے پر منحصر ہے، اور رائے تمہارے اختیار میں ہے، جب چاہو رائے کو ترک کر دو، پھر اس ملج کی طرح جس نے اپنے جہاز کو سمندری پہاڑیوں سے بچانکالا ہو تمہیں ہر طرف سکون نظر آئیگا۔ اگر تم اپنی رائے کو ترک کر دو تو پھر یہ شکایت باقی نہ رہیگی، کہ ہائے مجھے نقصان پہنچا، اس شکایت کو ترک کر دو کہ ہائے مجھے نقصان پہنچا تو نقصان خود باقی نہ رہیگا، اسی لیے کہا گیا ہے کہ ”عقل مند آدمی کی خوش قسمتی یہ ہے کہ وہ کسی خوش قسمتی کا محتاج نہیں۔“

خیالات کا ماحول پر اثر ناقابلِ انکار ہے، خیالات کی سختگی اور قوت انسان کی روح کو سخت جسمانی تکلیف میں بھی مطمئن اور قوی رکھ سکتی ہے، ارادہ نتیجہ ہے توجہ کا یعنی خیال و فکر کا، جن خیالات کا اظہار انسان عمل میں کرنا چاہتا ہے، ان ہی پر توجہ کو مرکوز کرنا ہے، ان ہی کو ذہن میں دہراتا ہے، الٹا پلٹتا ہے، ان ہی سے اس کے ذہن کی فضا مملو ہوتی ہے، اور یہی خیالات عالمِ آثار میں عمل کی صورت اختیار کرتے ہیں، خیال حقیقت ہے، عمل اس کا ظہور ہے، ولیم جمیس نے سچ کہا ہے ”زندگی کا ڈرامہ ایک ذہنی ڈرامہ ہے، ساری مشکل ذہنی شکل ہے“

میدانِ فکر کو خس و خاشاک سے پاک کر کے نیک خیالات کی تخم ریزی کرو۔ باغ کے بیجوں کی طرح خیالات کے انتخاب میں بھی حزم و احتیاط ضروری ہے، اور جس طرح بیج کو پودے کی شکل میں

نمایاں ہوتے کچھ عرصہ لگا تھا، اور ہمیں انتظار کرنا پڑا تھا اسی طرح خیالات کو قلب میں تغیر پیدا کرنے اور ہر نیک عمل میں ظاہر ہوتے دیر لگتی ہے، ہمیں نسبت ہمت نہ ہونا چاہیے اور نہ رنجیدہ اگر تم نے اپنا کام قاعدے کے موافق کیا ہے، خس و خاشاک کو صاف کیا ہے، نیک خیالات کے بونے میں احتیاط برتی ہے، تو شادمانی و مسرت، طمانیت و بردِ قلبی، سرور و کیف وہ گلہ لے شاداب ہیں جو نتیجہ کے طور پر تمہیں حاصل ہونگے۔

ان حقائق سے واقف ہونے کی وجہ سے عقلمند جانتا ہے، کہ دنیا میں اس کا کوئی دشمن ہے تو خود اس کا نفس ہے، اَعْدَىٰ عَدُوِّكَ نَفْسُكَ الَّتِي بَيْنَ جَنْبَيْكَ (البیہقی من حدیث ابن عباسؓ) اس لیے نہ وہ کسی پر بلا مت کرتا ہے، اور نہ کسی کی مذمت، بردِ قلبی کے ساتھ محاسبہ نفس کرتا ہے، صبر و سکون کے ساتھ اپنا اخلاقی فرض ادا کرتا ہے، صرف یہی نہیں کرتا بلکہ کسی مزید مرض میں مبتلا ہونے سے پرہیز کرتا ہے، وہ اپنے خیالات پر نظر رکھتا ہے، قلب کا دربان بن جاتا ہے، بد یا سلبی خیال کو داخل ہونے نہیں دیتا، داخل ہو جائے تو فوراً نیک یا ایجابی خیال کو اس کی جگہ لے آتا ہے، اپنے افعال کو بے عیب بناتا ہے، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ حال نتیجہ پر ماضی کا، قسمت نتیجہ پر خیالات کا!

کامل گوید جہان تمام و اہل دست

شطرنج ہماں عرصہ ہماں رخت ہماں

ناقص گوید کہ کوتاہی است و سہل است

این بردن و باختن ز علم جہل است

(سحابی استرآبادی)

# قانون تجاذب

## اور تعمیر سیرت

بدعی کنی و نیک طمع می داری ہم بد باشد سزائے بد کرداری  
یا آنکہ خداوند کریم است و رحیم گندم ندید بار چو جو می کاری (ردعی)

قانون تجاذب (LAW OF ATTRACTION) ذہنی یا روحانی زندگی کا ایک ضروری کئی اور عالمگیر قانون ہے، نہ اس کی ضد قابل تصور ہے اور نہ اس کا کوئی استثناء ہے۔ کون شہہ کر سکتا ہے کہ جن طبائع میں مماثلت پائی جاتی ہے وہ ایک انجذابی قوت کے زیر اثر ایک دوسرے پر غیر شعوری طور پر مائل ہوتی ہیں اسی لیے تو عام طور پر کہا جاتا ہے کہ کسی شخص کی سیرت کا صحیح اندازہ کرنا ہو تو دیکھو اس کی صحبت کیسی ہے، قانون کی صداقت کا توہر کوئی قائل ہے لیکن یہاں اس کے بعض تضمنات کو ذرا کھول کر بیان کرنا ہے۔

ہم شدار کہ راہ خود بخود گم نہ کنی

فکر کی دنیا میں اس قانون کی سرگرمی پر غور کرو! ایجابی اور نیک خیالات مماثل خیالات کو اپنی طرف جذب کرتے ہیں اور ان کے درمیان اتیلاف یا وابستگی ہوتی ہے، اسی طرح بد، سلی اور شرانگیز افکار باہم وابستہ ہوتے ہیں، ایک دوسرے کو پیدا کرتے ہیں، اپنی طرف کھینچتے ہیں، قوت پہنچاتے ہیں، تمہارے ذہن میں ایک خیال آتا ہے، اب اس کو کھوڑی دیرو کے رکھو، اس پر تخیل کی تعمیری قوتیں کو مرکوز کرو، مماثل خیالات کا خطور شروع ہو جائیگا، رفتہ رفتہ ان میں زیادتی ہو جائیگی اور بالآخر ان کا ہجوم ہونے لگیگا اور تمہارے ذہن کی فضا

ان سے مملو ہو جائیگی، جن لوگوں نے اپنے ذہن کی تربیت میں کوشش کی ہے اور اپنے افکار و خیالات پر قابو پیدا کر لیا ہے وہ اس قانون کو تعمیری طریقہ سے استعمال کرتے ہیں اور دنیا سے اپنی قوتِ فکری کا لوہا منواتے ہیں!

دیکھو مصنف کسی خاص موضوع پر قلم اٹھانا چاہتا ہے، ایک مرکزی خیال اس کے قلب پر چھایا ہوا ہے، وہ رات دن اسی میں غرق ہوتا ہے، سوتے جاگتے، اٹھتے بیٹھتے اس کا ذہن اسی میں مصروف ہوتا ہے، ناگہاں افکار و تصورات کا تسلسل شروع ہو جاتا ہے، اور نامعلوم و ناقابلِ علم منبع سے خیالات کا چشمہ اُبلنے لگتا ہے اور جب تک یہ حالت نہ ہو مصنف لکھنے کی کوشش نہیں کرتا!

اسی طرح مقرر اپنی تقریر کی تیاری کے لیے اپنے موضوع پر ذہن کی سرچ لائٹ ڈالتا ہے، انہماک کے ساتھ اس پر غور کرتا ہے، قانونِ تجاذب کا غیر مرئی عمل مماثل صورت کا ذخیرہ بہت جلد فراہم کر دیتا ہے، ان میں ترتیب بھی پیدا ہو جاتی ہے اور نظام بھی، یہ سب مبدئاً معلوم سے پیدا ہوتے ہیں، اور مقرر کا ذہن ان کا قیام گاہ ہوتا ہے! یاد رکھو کہ مفکر تصورات کا خالق نہیں حامل ہوتا ہے وہ تصورات کو پیدا نہیں کرتا، وہ محض قانون کی پیروی کرتا ہے، اور نتیجہ کے طور پر اس کو خیالات و افکار کا تحفہ عطا کیا جاتا ہے، یہ عطا ہر شخص کی استعداد کے مطابق ہوتی ہے۔

قانون کے نضمن و تعبیر سے واقف ہونے کے بعد حصولِ مسرت اور تزکیہٴ نفس یا سیرت سازی کی خاطر اس کا استعمال کرو، اس کی توضیح میں ضخیم کتابیں لکھی جاسکتی ہیں، لیکن ہم دو ایک مثالوں پر یہاں اکتفا کریں گے۔ فرض کرو کہ بیماری کا وہم تمہارے دل میں پیدا ہوا، اب بجائے اس کے کہ تم اس کو قبول کر لو اور اس کے متعلق فکر کرنے لگو، اور ذہن کو مماثل وسوسوں اور وہموں کا آئینہ بنا لو، تمہیں چاہیے کہ اس وہم کی نفی کرو اور وہ اس طرح کہ مبدئاً علم کی طرف فوراً متوجہ ہو جاؤ، یعنی حق تعالیٰ کی طرف رجوع کرو اور آہستگی سے لیکن



پورے اعتماد و اذعان کے ساتھ کہو،

حَصَّنَتْ نَفْسِي بِالْحَبِيبِ الْقِيَوْمِ الَّذِي لَا يَمُوتُ أَبَدًا وَدَفَعَتْ عَنْهَا السُّوءَ بِالْفِ  
الْفِ لِحَوْلٍ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللَّهِ ۝

یایوں کہو ”میں حق تعالیٰ کی حفاظت میں ہوں اور تمام بیماریوں اور آفتوں سے محفوظ و مامون“  
ان الفاظ کو پکار کر کہنے کی ضرورت نہیں محض ذہنی طور پر یہ کہے جاسکتے ہیں جو شخص اس طرح  
سلبی خیالات کو ذہن میں اترنے اور اپنی جگہ بتانے سے روکتا ہے، اور قانونِ تجاذب کو  
اجازت نہیں دیتا کہ اپنے عمل سے ان سلبی، فاسد اور تباہ کن تصورات کی تعداد میں اضافہ  
کرے اور قلب کو خوف و ہراس سے بھر دے، بلکہ اس کے برخلاف اپنی حقیقت کی جانب  
متوجہ ہو جاتا ہے اور وہاں سے ایجابی اور قوت بخش تصورات کو اخذ کرتا ہے جو قانونِ تجاذب  
کے عمل سے ہر آن زیادہ ہوتے جاتے ہیں، ہر دم نئی طاقت حاصل کرتے جاتے ہیں، قلب کو  
قوی کرتے ہیں، سیرت کی تعمیر کرتے ہیں، اور و فور قوت کی وجہ سے عمل میں نمایاں ہوتے ہیں،  
صحت کو درست کرتے ہیں، ماحول کو خوش گوار طریقہ سے بدل دیتے ہیں، موافق مرام نتائج  
پیدا کرتے ہیں اور اس طرح قسمت ہی کو بدل دیتے ہیں، یاد رکھو بیماری کی اصلی علت ذہنی  
ہوتی ہے، کیونکہ اگر ہم جراثیم کے نظریے کو بھی مان لیں تو بھی یہ مانی ہوئی بات ہے کہ جراثیم کا اثر  
اس قلب پر نہیں ہوتا جو ایجابی (POSITIVE) ہوتا ہے یعنی جو خود کو سلبی خیالات کا بازی گاہ  
نہیں بناتا، جو ہر دم و ساوس اور موحس کی نفی کرتا ہے، اور ان کی بجائے ایجابی اور حیات بخش  
اور نیک خیالات کا اثبات کرتا رہتا ہے اور ان کے مبدل یعنی اپنی حقیقت کو کسی آن فراموش  
نہیں کرتا، ایسا قلب بیماری کا آسانی کے ساتھ شکار کیسے ہو سکتا ہے؟ بیماری طبیعت کی

۱۷  
۱۸  
۱۹  
۲۰  
۲۱  
۲۲  
۲۳  
۲۴  
۲۵  
۲۶  
۲۷  
۲۸  
۲۹  
۳۰  
۳۱  
۳۲  
۳۳  
۳۴  
۳۵  
۳۶  
۳۷  
۳۸  
۳۹  
۴۰  
۴۱  
۴۲  
۴۳  
۴۴  
۴۵  
۴۶  
۴۷  
۴۸  
۴۹  
۵۰  
۵۱  
۵۲  
۵۳  
۵۴  
۵۵  
۵۶  
۵۷  
۵۸  
۵۹  
۶۰  
۶۱  
۶۲  
۶۳  
۶۴  
۶۵  
۶۶  
۶۷  
۶۸  
۶۹  
۷۰  
۷۱  
۷۲  
۷۳  
۷۴  
۷۵  
۷۶  
۷۷  
۷۸  
۷۹  
۸۰  
۸۱  
۸۲  
۸۳  
۸۴  
۸۵  
۸۶  
۸۷  
۸۸  
۸۹  
۹۰  
۹۱  
۹۲  
۹۳  
۹۴  
۹۵  
۹۶  
۹۷  
۹۸  
۹۹  
۱۰۰  
۱۰۱  
۱۰۲  
۱۰۳  
۱۰۴  
۱۰۵  
۱۰۶  
۱۰۷  
۱۰۸  
۱۰۹  
۱۱۰  
۱۱۱  
۱۱۲  
۱۱۳  
۱۱۴  
۱۱۵  
۱۱۶  
۱۱۷  
۱۱۸  
۱۱۹  
۱۲۰  
۱۲۱  
۱۲۲  
۱۲۳  
۱۲۴  
۱۲۵  
۱۲۶  
۱۲۷  
۱۲۸  
۱۲۹  
۱۳۰  
۱۳۱  
۱۳۲  
۱۳۳  
۱۳۴  
۱۳۵  
۱۳۶  
۱۳۷  
۱۳۸  
۱۳۹  
۱۴۰  
۱۴۱  
۱۴۲  
۱۴۳  
۱۴۴  
۱۴۵  
۱۴۶  
۱۴۷  
۱۴۸  
۱۴۹  
۱۵۰  
۱۵۱  
۱۵۲  
۱۵۳  
۱۵۴  
۱۵۵  
۱۵۶  
۱۵۷  
۱۵۸  
۱۵۹  
۱۶۰  
۱۶۱  
۱۶۲  
۱۶۳  
۱۶۴  
۱۶۵  
۱۶۶  
۱۶۷  
۱۶۸  
۱۶۹  
۱۷۰  
۱۷۱  
۱۷۲  
۱۷۳  
۱۷۴  
۱۷۵  
۱۷۶  
۱۷۷  
۱۷۸  
۱۷۹  
۱۸۰  
۱۸۱  
۱۸۲  
۱۸۳  
۱۸۴  
۱۸۵  
۱۸۶  
۱۸۷  
۱۸۸  
۱۸۹  
۱۹۰  
۱۹۱  
۱۹۲  
۱۹۳  
۱۹۴  
۱۹۵  
۱۹۶  
۱۹۷  
۱۹۸  
۱۹۹  
۲۰۰  
۲۰۱  
۲۰۲  
۲۰۳  
۲۰۴  
۲۰۵  
۲۰۶  
۲۰۷  
۲۰۸  
۲۰۹  
۲۱۰  
۲۱۱  
۲۱۲  
۲۱۳  
۲۱۴  
۲۱۵  
۲۱۶  
۲۱۷  
۲۱۸  
۲۱۹  
۲۲۰  
۲۲۱  
۲۲۲  
۲۲۳  
۲۲۴  
۲۲۵  
۲۲۶  
۲۲۷  
۲۲۸  
۲۲۹  
۲۳۰  
۲۳۱  
۲۳۲  
۲۳۳  
۲۳۴  
۲۳۵  
۲۳۶  
۲۳۷  
۲۳۸  
۲۳۹  
۲۴۰  
۲۴۱  
۲۴۲  
۲۴۳  
۲۴۴  
۲۴۵  
۲۴۶  
۲۴۷  
۲۴۸  
۲۴۹  
۲۵۰  
۲۵۱  
۲۵۲  
۲۵۳  
۲۵۴  
۲۵۵  
۲۵۶  
۲۵۷  
۲۵۸  
۲۵۹  
۲۶۰  
۲۶۱  
۲۶۲  
۲۶۳  
۲۶۴  
۲۶۵  
۲۶۶  
۲۶۷  
۲۶۸  
۲۶۹  
۲۷۰  
۲۷۱  
۲۷۲  
۲۷۳  
۲۷۴  
۲۷۵  
۲۷۶  
۲۷۷  
۲۷۸  
۲۷۹  
۲۸۰  
۲۸۱  
۲۸۲  
۲۸۳  
۲۸۴  
۲۸۵  
۲۸۶  
۲۸۷  
۲۸۸  
۲۸۹  
۲۹۰  
۲۹۱  
۲۹۲  
۲۹۳  
۲۹۴  
۲۹۵  
۲۹۶  
۲۹۷  
۲۹۸  
۲۹۹  
۳۰۰  
۳۰۱  
۳۰۲  
۳۰۳  
۳۰۴  
۳۰۵  
۳۰۶  
۳۰۷  
۳۰۸  
۳۰۹  
۳۱۰  
۳۱۱  
۳۱۲  
۳۱۳  
۳۱۴  
۳۱۵  
۳۱۶  
۳۱۷  
۳۱۸  
۳۱۹  
۳۲۰  
۳۲۱  
۳۲۲  
۳۲۳  
۳۲۴  
۳۲۵  
۳۲۶  
۳۲۷  
۳۲۸  
۳۲۹  
۳۳۰  
۳۳۱  
۳۳۲  
۳۳۳  
۳۳۴  
۳۳۵  
۳۳۶  
۳۳۷  
۳۳۸  
۳۳۹  
۳۴۰  
۳۴۱  
۳۴۲  
۳۴۳  
۳۴۴  
۳۴۵  
۳۴۶  
۳۴۷  
۳۴۸  
۳۴۹  
۳۵۰  
۳۵۱  
۳۵۲  
۳۵۳  
۳۵۴  
۳۵۵  
۳۵۶  
۳۵۷  
۳۵۸  
۳۵۹  
۳۶۰  
۳۶۱  
۳۶۲  
۳۶۳  
۳۶۴  
۳۶۵  
۳۶۶  
۳۶۷  
۳۶۸  
۳۶۹  
۳۷۰  
۳۷۱  
۳۷۲  
۳۷۳  
۳۷۴  
۳۷۵  
۳۷۶  
۳۷۷  
۳۷۸  
۳۷۹  
۳۸۰  
۳۸۱  
۳۸۲  
۳۸۳  
۳۸۴  
۳۸۵  
۳۸۶  
۳۸۷  
۳۸۸  
۳۸۹  
۳۹۰  
۳۹۱  
۳۹۲  
۳۹۳  
۳۹۴  
۳۹۵  
۳۹۶  
۳۹۷  
۳۹۸  
۳۹۹  
۴۰۰  
۴۰۱  
۴۰۲  
۴۰۳  
۴۰۴  
۴۰۵  
۴۰۶  
۴۰۷  
۴۰۸  
۴۰۹  
۴۱۰  
۴۱۱  
۴۱۲  
۴۱۳  
۴۱۴  
۴۱۵  
۴۱۶  
۴۱۷  
۴۱۸  
۴۱۹  
۴۲۰  
۴۲۱  
۴۲۲  
۴۲۳  
۴۲۴  
۴۲۵  
۴۲۶  
۴۲۷  
۴۲۸  
۴۲۹  
۴۳۰  
۴۳۱  
۴۳۲  
۴۳۳  
۴۳۴  
۴۳۵  
۴۳۶  
۴۳۷  
۴۳۸  
۴۳۹  
۴۴۰  
۴۴۱  
۴۴۲  
۴۴۳  
۴۴۴  
۴۴۵  
۴۴۶  
۴۴۷  
۴۴۸  
۴۴۹  
۴۵۰  
۴۵۱  
۴۵۲  
۴۵۳  
۴۵۴  
۴۵۵  
۴۵۶  
۴۵۷  
۴۵۸  
۴۵۹  
۴۶۰  
۴۶۱  
۴۶۲  
۴۶۳  
۴۶۴  
۴۶۵  
۴۶۶  
۴۶۷  
۴۶۸  
۴۶۹  
۴۷۰  
۴۷۱  
۴۷۲  
۴۷۳  
۴۷۴  
۴۷۵  
۴۷۶  
۴۷۷  
۴۷۸  
۴۷۹  
۴۸۰  
۴۸۱  
۴۸۲  
۴۸۳  
۴۸۴  
۴۸۵  
۴۸۶  
۴۸۷  
۴۸۸  
۴۸۹  
۴۹۰  
۴۹۱  
۴۹۲  
۴۹۳  
۴۹۴  
۴۹۵  
۴۹۶  
۴۹۷  
۴۹۸  
۴۹۹  
۵۰۰  
۵۰۱  
۵۰۲  
۵۰۳  
۵۰۴  
۵۰۵  
۵۰۶  
۵۰۷  
۵۰۸  
۵۰۹  
۵۱۰  
۵۱۱  
۵۱۲  
۵۱۳  
۵۱۴  
۵۱۵  
۵۱۶  
۵۱۷  
۵۱۸  
۵۱۹  
۵۲۰  
۵۲۱  
۵۲۲  
۵۲۳  
۵۲۴  
۵۲۵  
۵۲۶  
۵۲۷  
۵۲۸  
۵۲۹  
۵۳۰  
۵۳۱  
۵۳۲  
۵۳۳  
۵۳۴  
۵۳۵  
۵۳۶  
۵۳۷  
۵۳۸  
۵۳۹  
۵۴۰  
۵۴۱  
۵۴۲  
۵۴۳  
۵۴۴  
۵۴۵  
۵۴۶  
۵۴۷  
۵۴۸  
۵۴۹  
۵۵۰  
۵۵۱  
۵۵۲  
۵۵۳  
۵۵۴  
۵۵۵  
۵۵۶  
۵۵۷  
۵۵۸  
۵۵۹  
۵۶۰  
۵۶۱  
۵۶۲  
۵۶۳  
۵۶۴  
۵۶۵  
۵۶۶  
۵۶۷  
۵۶۸  
۵۶۹  
۵۷۰  
۵۷۱  
۵۷۲  
۵۷۳  
۵۷۴  
۵۷۵  
۵۷۶  
۵۷۷  
۵۷۸  
۵۷۹  
۵۸۰  
۵۸۱  
۵۸۲  
۵۸۳  
۵۸۴  
۵۸۵  
۵۸۶  
۵۸۷  
۵۸۸  
۵۸۹  
۵۹۰  
۵۹۱  
۵۹۲  
۵۹۳  
۵۹۴  
۵۹۵  
۵۹۶  
۵۹۷  
۵۹۸  
۵۹۹  
۶۰۰  
۶۰۱  
۶۰۲  
۶۰۳  
۶۰۴  
۶۰۵  
۶۰۶  
۶۰۷  
۶۰۸  
۶۰۹  
۶۱۰  
۶۱۱  
۶۱۲  
۶۱۳  
۶۱۴  
۶۱۵  
۶۱۶  
۶۱۷  
۶۱۸  
۶۱۹  
۶۲۰  
۶۲۱  
۶۲۲  
۶۲۳  
۶۲۴  
۶۲۵  
۶۲۶  
۶۲۷  
۶۲۸  
۶۲۹  
۶۳۰  
۶۳۱  
۶۳۲  
۶۳۳  
۶۳۴  
۶۳۵  
۶۳۶  
۶۳۷  
۶۳۸  
۶۳۹  
۶۴۰  
۶۴۱  
۶۴۲  
۶۴۳  
۶۴۴  
۶۴۵  
۶۴۶  
۶۴۷  
۶۴۸  
۶۴۹  
۶۵۰  
۶۵۱  
۶۵۲  
۶۵۳  
۶۵۴  
۶۵۵  
۶۵۶  
۶۵۷  
۶۵۸  
۶۵۹  
۶۶۰  
۶۶۱  
۶۶۲  
۶۶۳  
۶۶۴  
۶۶۵  
۶۶۶  
۶۶۷  
۶۶۸  
۶۶۹  
۶۷۰  
۶۷۱  
۶۷۲  
۶۷۳  
۶۷۴  
۶۷۵  
۶۷۶  
۶۷۷  
۶۷۸  
۶۷۹  
۶۸۰  
۶۸۱  
۶۸۲  
۶۸۳  
۶۸۴  
۶۸۵  
۶۸۶  
۶۸۷  
۶۸۸  
۶۸۹  
۶۹۰  
۶۹۱  
۶۹۲  
۶۹۳  
۶۹۴  
۶۹۵  
۶۹۶  
۶۹۷  
۶۹۸  
۶۹۹  
۷۰۰  
۷۰۱  
۷۰۲  
۷۰۳  
۷۰۴  
۷۰۵  
۷۰۶  
۷۰۷  
۷۰۸  
۷۰۹  
۷۱۰  
۷۱۱  
۷۱۲  
۷۱۳  
۷۱۴  
۷۱۵  
۷۱۶  
۷۱۷  
۷۱۸  
۷۱۹  
۷۲۰  
۷۲۱  
۷۲۲  
۷۲۳  
۷۲۴  
۷۲۵  
۷۲۶  
۷۲۷  
۷۲۸  
۷۲۹  
۷۳۰  
۷۳۱  
۷۳۲  
۷۳۳  
۷۳۴  
۷۳۵  
۷۳۶  
۷۳۷  
۷۳۸  
۷۳۹  
۷۴۰  
۷۴۱  
۷۴۲  
۷۴۳  
۷۴۴  
۷۴۵  
۷۴۶  
۷۴۷  
۷۴۸  
۷۴۹  
۷۵۰  
۷۵۱  
۷۵۲  
۷۵۳  
۷۵۴  
۷۵۵  
۷۵۶  
۷۵۷  
۷۵۸  
۷۵۹  
۷۶۰  
۷۶۱  
۷۶۲  
۷۶۳  
۷۶۴  
۷۶۵  
۷۶۶  
۷۶۷  
۷۶۸  
۷۶۹  
۷۷۰  
۷۷۱  
۷۷۲  
۷۷۳  
۷۷۴  
۷۷۵  
۷۷۶  
۷۷۷  
۷۷۸  
۷۷۹  
۷۸۰  
۷۸۱  
۷۸۲  
۷۸۳  
۷۸۴  
۷۸۵  
۷۸۶  
۷۸۷  
۷۸۸  
۷۸۹  
۷۹۰  
۷۹۱  
۷۹۲  
۷۹۳  
۷۹۴  
۷۹۵  
۷۹۶  
۷۹۷  
۷۹۸  
۷۹۹  
۸۰۰  
۸۰۱  
۸۰۲  
۸۰۳  
۸۰۴  
۸۰۵  
۸۰۶  
۸۰۷  
۸۰۸  
۸۰۹  
۸۱۰  
۸۱۱  
۸۱۲  
۸۱۳  
۸۱۴  
۸۱۵  
۸۱۶  
۸۱۷  
۸۱۸  
۸۱۹  
۸۲۰  
۸۲۱  
۸۲۲  
۸۲۳  
۸۲۴  
۸۲۵  
۸۲۶  
۸۲۷  
۸۲۸  
۸۲۹  
۸۳۰  
۸۳۱  
۸۳۲  
۸۳۳  
۸۳۴  
۸۳۵  
۸۳۶  
۸۳۷  
۸۳۸  
۸۳۹  
۸۴۰  
۸۴۱  
۸۴۲  
۸۴۳  
۸۴۴  
۸۴۵  
۸۴۶  
۸۴۷  
۸۴۸  
۸۴۹  
۸۵۰  
۸۵۱  
۸۵۲  
۸۵۳  
۸۵۴  
۸۵۵  
۸۵۶  
۸۵۷  
۸۵۸  
۸۵۹  
۸۶۰  
۸۶۱  
۸۶۲  
۸۶۳  
۸۶۴  
۸۶۵  
۸۶۶  
۸۶۷  
۸۶۸  
۸۶۹  
۸۷۰  
۸۷۱  
۸۷۲  
۸۷۳  
۸۷۴  
۸۷۵  
۸۷۶  
۸۷۷  
۸۷۸  
۸۷۹  
۸۸۰  
۸۸۱  
۸۸۲  
۸۸۳  
۸۸۴  
۸۸۵  
۸۸۶  
۸۸۷  
۸۸۸  
۸۸۹  
۸۹۰  
۸۹۱  
۸۹۲  
۸۹۳  
۸۹۴  
۸۹۵  
۸۹۶  
۸۹۷  
۸۹۸  
۸۹۹  
۹۰۰  
۹۰۱  
۹۰۲  
۹۰۳  
۹۰۴  
۹۰۵  
۹۰۶  
۹۰۷  
۹۰۸  
۹۰۹  
۹۱۰  
۹۱۱  
۹۱۲  
۹۱۳  
۹۱۴  
۹۱۵  
۹۱۶  
۹۱۷  
۹۱۸  
۹۱۹  
۹۲۰  
۹۲۱  
۹۲۲  
۹۲۳  
۹۲۴  
۹۲۵  
۹۲۶  
۹۲۷  
۹۲۸  
۹۲۹  
۹۳۰  
۹۳۱  
۹۳۲  
۹۳۳  
۹۳۴  
۹۳۵  
۹۳۶  
۹۳۷  
۹۳۸  
۹۳۹  
۹۴۰  
۹۴۱  
۹۴۲  
۹۴۳  
۹۴۴  
۹۴۵  
۹۴۶  
۹۴۷  
۹۴۸  
۹۴۹  
۹۵۰  
۹۵۱  
۹۵۲  
۹۵۳  
۹۵۴  
۹۵۵  
۹۵۶  
۹۵۷  
۹۵۸  
۹۵۹  
۹۶۰  
۹۶۱  
۹۶۲  
۹۶۳  
۹۶۴  
۹۶۵  
۹۶۶  
۹۶۷  
۹۶۸  
۹۶۹  
۹۷۰  
۹۷۱  
۹۷۲  
۹۷۳  
۹۷۴  
۹۷۵  
۹۷۶  
۹۷۷  
۹۷۸  
۹۷۹  
۹۸۰  
۹۸۱  
۹۸۲  
۹۸۳  
۹۸۴  
۹۸۵  
۹۸۶  
۹۸۷  
۹۸۸  
۹۸۹  
۹۹۰  
۹۹۱  
۹۹۲  
۹۹۳  
۹۹۴  
۹۹۵  
۹۹۶  
۹۹۷  
۹۹۸  
۹۹۹  
۱۰۰۰

کمزوری سے پیدا ہوتی ہے، طبیعت اگر قوی ہو تو سرے سے بیماری کا وجود ہی ناممکن ہے، یہ کوئی ایجابی چیز نہیں بلکہ سلبی صفت ہے، قدرت کا نہ ہونا ہی عجز ہے، قوت کا نہ ہونا ہی بیماری ہے، سلبی خیالات منفی افکار قوت کو سلب کرتے ہیں، قلب کو کمزور کرتے ہیں، اعضا کو منسحل کرتے ہیں، اعصاب میں تناؤ پیدا کرتے ہیں، اور اسی لیے ان کو ایجابی و مثبتی تصورات سے بدل دینا چاہیے ایجابی افکار کا سبب حق تعالیٰ ہیں، جو ہی ہم نے ان کی طرف اپنا رخ کیا، گویا ہم ظلمت سے نکل کر روشنی میں آئے، اب روشنی کی کرنیں آہستہ آہستہ ہمارے جسم میں داخل ہوتی ہیں، ان سے مردہ اعصاب جاگ اٹھتے ہیں، منسحل اعضا میں توانائی آتی ہے، قلب و جگر تازہ دم ہو جاتے ہیں، کھوئی ہوئی صحت پوری قوت کے ساتھ عود کر آتی ہے صحت کے حصول کے لیے اور اس کے قیام و بقا کے لیے اس قطعی و حتمی نسخے کو یاد رکھو اور ہمیشہ اس کو استعمال کرتے رہو۔

قانون تجاذب کے استعمال کی ایک اور مثال پر غور کرو، تم پر کسی نے زیادتی کی ہے، تمہارے ساتھ غیر منصفانہ برتاؤ کیا گیا ہے، تمہیں غصہ آتا ہے، رنج ہوتا ہے، اضطراب ہوتا ہے، اور تم اس نقصان پر ذہن کی ساری قوتوں کو مرکوز کر دیتے ہو، نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ سب سے پہلے حائل خیالات کا جو قلب پر ہونے لگتا ہے، یہ تار ایک اندوہ خیز، زہریلے خیالات جو قانون تجاذب کے عمل سے پیدا ہو رہے ہیں اپنے منحوس سایہ سے تمہاری ذہنیت کو مسموم کر دیتے ہیں، تمہاری سیرت فنا ہو جاتی ہے، تمہاری صحت ٹوٹنے لگتی ہے، اور ممکن ہے کہ بالآخر تمہارا دماغ بھی متاثر ہو جائے اور اس میں فتور آنے لگے، آتش انتقام کا سوختہ فاتر دماغ اگر انتقام پر اتر آئے تو اس کے نتائج اور اثرات عموماً مسرت و طمانیت قلب کے لیے مفید نہیں ثابت ہوتے۔

مرغ پر نارستہ چوں پراں شود لقمہ ہر گربہ دراں شود (معنی)

اب اگر تم دعاً اذاهم و توکل علی اللہ (پہ ۳۶) پر عمل کرتے ہوئے اس کو معاف کیے دیتے

ہو اور اپنے خیالات کی رو کو بدل دیتے ہو، سلبی خیالات کی بجائے ایجابی افکار کے قبول کرنے کے

لہ چھوڑ دے ان کا ستانا اور بھروسہ کر اشد پر۔

یہ تیار ہو جائے جو تو تمہیں ان تمام شرانگیز و فتنہ خیز نتائج سے نجات مل جاتی ہے، اور اب تجاذب کا قانون تمام بھی چیزوں کے رخ کو تمہاری طرف پھیر دیتا ہے، اب تم کو حقیقی معنی میں حریت نصیب ہوتی ہے، طمانیت حاصل ہوتی ہے، ہسرت میسر ہوتی ہے، کیونکہ تم نے سینہ کو کینہ سے پاک کیا، غضب سے پاک کیا، ان منفی جذبات کے دور ہو جانے سے تمہارے قلب سے ظلمت دور ہوئی، نور کا دخول ہوا اور تمہاری ہستی کا ہر ذرہ اس نور سے جگمگا اٹھا، اسی لیے تو کسی عارف نے کہا ہے :-

عالم تمام یک گل بے خاری شود      دل را اگر ز کینہ مصفا کند کے  
 ہر فعل کا اثر، ہر حرکت کا ردِ عمل، ہر علت کا معلول قطعی ہوتا ہے، یہ قانون کلی اور ضروری ہے، اب کینہ و غضب کے جذبات کا لازمی و جبری نتیجہ غم و حزن کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے اسی طرح عفو و احسان و رحمت، کرم، صبر و شکر کا قطعی و ضروری نتیجہ مسرت و طمانیت تواریق و الفت، فلاح وغیرہ کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟ علیت کے اس کلی عالمگیر، وجودی و لزومی قانون پر یقین ہو جائے تو اَحْسِنْ اِلٰی مَنْ اَسَاؤَ اِلَیْکُمْ پرم عمل کرتے ہوئے ہمیں کوئی تکلف نہیں ہوتا اور ہم اپنے اس عقیدہ کا اظہار کسی شاعر تمام المعرفت کے سریلے نعموں میں یوں کرتے ہیں :

ہر کسی در راہ من خاک ہند من گل خنم!      او سزائے خار یا بدین جزائے گل برم  
 یہ سن کر اور ماں کر بھی تم ذرا جھلا کر کہتے ہو، کیا یہ میرے بس کی بات ہے، میں بہر حال بشر ہوں اور فطرۃ مائل نہ شر ہوں، فطرۃ ظلوم ہوں، جہول ہوں، ظلمت و جہل میری ماہیت میں داخل ہیں، ان صفاتِ عدمیہ کو مجھ سے دور کیسے کیا جا سکتا ہے، ان کی وجہ سے آفت و مصیبت میں مبتلا ہوتا رہتا ہوں لیکن سچ پوچھو تو حال یہ ہے کہ  
 پھر اسی بے وفا پر مرتے ہیں      پھر وہی زندگی ہماری ہے! (غالب)

لے جس نے تمہارے ساتھ بڑائی کی ہے اس کے ساتھ بھلائی کرو۔

تم ایک حد تک ٹھیک کہتے ہو اور ہم تمہیں ایک نفسیاتی طریقہ بتائیں جس کے استعمال سے تمہیں غایت کے حصول میں آسانی ہوگی۔

جس شخص سے تمہیں نقصان پہنچا ہے، اور جس کے خیال سے تمہارے بدن میں سوزش ہوتی ہے اور جس کو معاف کرنا تم ممکن نہیں سمجھتے اس کو معاف کرنے کے لیے تمہیں چاہیے کہ کچھ دن اس صداقت پر غور کرو۔

وَمَا أَصَابَكُمْ مِنْ مُصِيبَةٍ ۖ ادر تم کو جو کچھ مصیبت پہنچتی ہے تو وہ تمہارے ہی  
فِيمَا كَسَبْتُمْ اَيْدِيَكُمْ وَيَعْفُو ۚ ہاتھوں کے کیے ہوئے کاموں سے ہے اور بہت سے  
عَنْ كَثِيرٍ رِجَالٍ (۱۵۶) تو اللہ درگزر ہی کر دیتا ہے۔

نیز انہی اعمال کو ترد علیکم <sup>والحدیث</sup> یہ تمہارے ہی اعمال ہیں جو تم پر لوٹنے جلتے ہیں  
ذرا سوچو، اصل میں تمہارا کوئی دشمن نہیں سوائے تمہارے نفس کے یہ سب کچھ اسی کا  
کمایا ہوا ہے، اور اسی کے عین کا تقاضا یہ ہے کہ کسبتا و فوک نفخ۔ دوسرے کو اپنے افعال  
کا ذمہ دار قرار دینا تمہاری عقل کی کچی اور جذبات کی غامی کی دلیل ہے، جوں جوں تم اس  
صداقت پر غور کرتے جاؤ گے تم پر واقعات کھلتے جائیں گے، اور ہر آفت، ہر مصیبت کی علت تم  
اپنی ہی کسی حماقت کو پاؤ گے؛ اگر سلسلہ تفکر کو چند روز جاری رکھو گے تو حقیقت اس قدر  
مبہن ہو جائیگی کہ بے اختیار چیخ اٹھو گے کہ غلطی میری تھی کسی دوسرے کی نہیں اور حق تعالیٰ کی  
طرف ظلم کی نسبت تو کسی طرح نہیں کی جاسکتی۔ اِنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَالِمٍ لِّلْعٰبِدِیۡنَ  
ہرچہ بہت از قامتِ ناسازی اندام ماست ورنہ تشریف تو ہر بالائے کس کوتاہ نیست  
اس اصول کی صداقت کے وجدان میں کھل جانے کے بعد تم اپنے دشمن کو بھی معاف کرنے  
کے قابل ہو جاؤ گے۔

۱۵ تیرے ہاتھوں نے کمایا ہے اور تیرے ہی منہ نے پھونکا ہے۔

۱۶ بیشک اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں۔

اگر تم جذباتی انسان ہو عقل سے کافی حصہ تمہیں نہیں ملا ہے اور مذکورہ بالا اصول تمہاری سمجھ میں کسی طرح نہیں آتا تو تمہیں یہ دوسرا طریقہ اختیار کرنا چاہیے :-  
 جس شخص کو تمہیں معاف کرنا ہے اس کی شبیہ اپنے تخیل کی مدد سے اپنی نظروں کے سامنے لے آؤ اور اب اس کو مخاطب کر کے کہو "میں تمہیں (نام شخص) حسبہ بشر پوری طرح معاف کرتا ہوں، دعا کرتا ہوں کہ حق تعالیٰ تمہیں اپنی نعمتوں سے سرفراز کریں اور تمہیں نورانی کر دیں، آمین"

اگر تم یہ عمل چند روز مسلسل و خلوص دل کے ساتھ کرتے رہو تو کچھ دن بعد تمہیں یہ معلوم کر کے تعجب ہو گا کہ تمہارے لیے اس شخص کو معاف کر دینا زیادہ مشکل تو نہیں، اپنے اس مجاہد سے اگر تم نے حسن خلق حاصل کر لیا کہ خلق کی طرف سے جفا کے باوجود ان سے وفا کی، رحمت و شفقت کو اپنا شعار بنایا، اور ان کے لیے بخشش و عفو کی دعا کی، تو اب حقیقی مسرت، طمانیت، سکون، برد قلبی، محبت، وہ انعامات ہیں جو حق تعالیٰ کی جانب سے تم کو عطا کیے جائیں گے، اور وہ تمہیں بطریق اجتناب اپنی جانب کھینچ لینگے۔

راہ بسیار راست مردم را بسوئے حق و لے

راہ نزدیکش دل مردم بدست آوردن است

إِنَّ هَذَا لَهُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ، مِثْلُ هَذَا فَلْيَعْمَلِ الْعَاثِلُونَ

(پاج ۶۴)

لے بیشک یہی بڑی مراد ملنی، ایسی چیزوں کے واسطے چاہیے محنت کریں محنت کرنے والے۔



# قرآن اور سیرت سازی

شہ نیست کسے کہ تختِ عابجے دارے تا آنکہ نہ شاہانہ مزاجے دارد  
یعنی کہ خروس پیش ارباب شعور سلطان نشود اگر چہ تلبجے دارد (درد)

دنیا کی سب سے زیادہ خوبصورت شے، سب سے زیادہ گراں قدر اور عزیز شے پاک سیرت ہی، زندگی تربیت گاہ ہے، حق تعالیٰ مُربی و معلم ہیں، واقعات و حادثات وہ آلات و ادوات ہیں جن کے ذریعہ وہ ہماری سیرت کی تکمیل کر رہے ہیں، دنیا کی ”روح ساز“ وادی میں کبھی غم کے مضراب سے اور کبھی خوشی کے تاروں سے سیرت ہی کے خفتہ نغمے بیدار کیے جاتے ہیں، زندگی کی غایت ہی یہ نظر آتی ہے کہ سیرت کو سنوارا جائے، پختہ کیا جائے، کامل بنایا جائے، کیوں؟ اس لیے کہ سیرت ہی پر دنیوی کامیابی کا انحصار ہے، سیرت ہی پر فوزِ آخرت کا مدار ہے، دین و دنیا کی اصلاح سیرت ہی کی اصلاح سے ہو سکتی ہے، سیرت ہی پر جسمانی اور روحانی صحت مبنی ہوتی ہے، اور بردِ قلبی اور طمانیتِ خاطر پاک سیرت ہی کا نتیجہ ہے، بنی آدم کا ”اکرام“ سیرت ہی کی پاکی کی وجہ سے ہوتا ہے، جو انسان پاک سیرت نہیں وہ صورتہ گوانسان ہے، لیکن حقیقتاً وہ حیوان ہے، یا دیو ہے یا غول ہے، ”شیاطین الانس“ میں اس کا شمار ہے، وہ دنیا، دین اور آخرت کی حقیقی اقدار سے محروم ہے!

سیرت، علمائے نقیبات کی باریک بین اور دور رس نگاہ میں ان تیقنات، عادات، میلانات کا مجموعہ ہے جو فرقہ کے کردار کی رہنمائی کرتا ہے، اس کو دوسروں سے متمیز کرتا ہے، اور اس کی وحدتِ کردار کا باعث ہے، ہر فرد دوسرے فرد سے متمیز ہوتا ہے، صورت اور

لے یہ مقالہ معارف میں مارچ ۱۹۴۲ء میں اول مرتبہ شائع ہوا۔

سیرت میں، صورت کی غیریت تو حقیقی واقعی ہوتی ہے، یہ رفع نہیں کی جاسکتی، اور نہ کوئی اس کو رفع کرنا چاہتا ہے، لیکن سیرت میں ایک قسم کی مماثلت ہو سکتی ہے، یہ مماثلت عینیت نہیں انفرادیت ناقابل انکار ہے، باوجود مماثلت کے انفرادیت موجود ہوتی ہے، اور اس انفرادیت کا مبداء، اور اس کے وہ اقتضارات و قابلیتات ہیں، جو اپنا ظہور عادات و افعال میں کرتے ہیں اور اس تمام مجموعہ کو ہم نفسیات کی اصطلاح میں سیرت سے تعبیر کرتے ہیں، سیرت افعال میں وحدت پیدا کرتی ہے، اور سیرت کے کامل علم کے بعد بڑی حد تک فرد کے افعال کی پیشین گوئی ممکن ہو جاتی ہے۔

سیرت کی تحلیل میں ہمیں اس امر کا خیال رکھنا چاہیے کہ یہ عادات کی تنظیم کا نام ہے عادت کی تشکیل افعال کی تکرار سے ہوتی ہے، افعال کا صدور بظاہر محرکات پر مبنی ہوتا ہے، لیکن محرکات کا ماخذ و منبع وہ تیقنات و اذعانات ہوتے ہیں، جو انسان زندگی کے تجربات ماحول کے اثرات، تعلیم اور دوسرے ذرائع سے حاصل کرتا ہے۔ علم یقین عمل و عادات یہ وہ اہم عناصر ہیں، جن میں سیرت کی تحلیل کی جاسکتی ہے، سیرت سازی کے طریقے کو جاننے کے لیے ہمیں ان ہی عناصر کی تحقیق کرنی ہوگی۔

(۱) علم یقین: العلم نکتۃ، سیرت سازی کے لیے صرف ایک نکتہ کا وجدانی اجالی علم کافی ہے، پھر عقلی طور پر اس کی تفصیل و توضیح میں دفا ترنگے جاسکتے ہیں۔

دل گفت مرا علم لدنی ہوس است      تعلیم کن گرت بدیں دسترس است  
گفتم کہ الف، در گفتم بیج      در خانہ اگر کس است بک حرف بس است

(شیخ عزیزالدین محمود الکاشی)

وہ وجدانی علم، علم لدنی، حق تعالیٰ کی الوہیت کا اقرار ہے، اسی اقرار کی مضبوط چٹان پر سیرت کی مشید عمارت تعمیر کی جاسکتی ہے، اس اقرار کے تضمنات پر غور کرو، جب میں ایمان و اذعان کی شانہ قوت سے حق تعالیٰ کے الہ ہونے کا اقرار کرتا ہوں تو سب سے پہلے میں بیان

راہوں کہ حق تعالیٰ ہی معبود ہیں، وہی عبادت یا پرستش کے قابل ہیں، عبادت کیا ہے، یہ غایت  
 تذلل کا نام ہے، اظہارِ ذلت کا نام ہے، میرا یہ سرا اگر جھک سکتا ہے تو بس میرے خالق،  
 میرے مولیٰ، میرے مالک و حاکم ہی کے سامنے جھک سکتا ہے، اور غیر کے سامنے ہرگز  
 نہیں جھک سکتا! اظہارِ ذلت کی وجہ کیا ہے؟ میں فقیر ہوں محتاج ہوں، میرا معبود غنی ہے  
 قوت و اقتدار سے متصف ہے، علم و حکمت سے موصوف ہے، رب ہے، پالنے والا ہے، استعانت  
 ہی، مدد کرنے والا ہے، استعانت ہی کی خاطر میں اس کے سامنے اظہارِ ذلت کرتا ہوں اور  
 جانتا ہوں کہ سارا عالم فقیر ہے، اور میرا معبود ہی صرف غنی و حمید ہے، میں اس کا فقیر ہو کر سارے  
 عالم سے غنی ہوں، میرا یہ احساس کہ میں اس شہنشاہ کا در یوزہ گر ہوں، جس کے در یوزہ گر سائے  
 شاہ و گدا ہیں، مجھے سارے عالم سے بے نیاز کر دیتا ہے اور میں کفی باللہ و کیلا کہہ کر عبادت  
 و استعانت کے لفظ نظر سے ماسوی اللہ سے کٹ جاتا ہوں، اور فقر و ذلت یا بندگی کی  
 نسبت اللہ ہی سے جوڑ لیتا ہوں، اب کائنات کی بڑی سے بڑی قوت بھی میرے لیے نامید و  
 کامزین سکتی ہے، اور نہ خوف و ہراس کا سبب، ان سبب کا فقر، ان سبب کی ذلت و مجبوری،  
 بیچارگی و بے بسی میری نظروں میں اتنی ہی آشکارا و ہویا ہو جاتی ہے جتنی کہ خود میری بیکسی و مجبوری  
 ہم سب عبد ہیں، کوئی چیز اصالتاً ہماری نہیں، فقر ہماری ذاتی صفت ہے، امانت چند روز  
 کے لیے چند چیزیں ہم کو دی جاتی ہیں، نادانی سے ہم ان کو اپنی سمجھتے ہیں، حقیقی مالک کو بھول جاتے  
 ہیں، انہی کی محبت میں فریفتہ ہو جاتے ہیں، حقیقی اقدار سے غافل ہو جاتے ہیں، ناگہاں یہ  
 طلسم ٹوٹ جاتا ہے، اور یہ ساری محبوب و مرغوب چیزیں موت ہم سے چھین لیتی ہے، اور پھر اپنے  
 اصلی فقر و ذلت کے ساتھ ہم نادم و پشیمان اس جہان سے رخصت ہو جاتے ہیں تاکہ اپنے  
 اعمال کے اثرات کو، اپنے افعال کے نتائج کو، اپنے کردار کے اثار و عواقب کو جو اس دنیا میں  
 بھی اپنی موجودگی کا مختلف رنگوں میں ہیں احساس بخش رہے تھے، زیادہ نمایاں زیادہ واضح  
 اور آجا کر طریقے سے دیکھیں، اور حسرت و ندامت کی آگ میں جلیں۔

سیرت کی تعمیر اسی اساسی یقین پر ہوتی ہے کہ حق تعالیٰ ہی معبود ہیں، جن کے آگے یہ میرا سر جو سارے جہان کے مقابلہ میں معزز و مفتخر، بلند و بالا ہے، فقیرانہ شان سے جھک رہا ہے اور حیات و علم، رزق و فراخی، صحت و عزت، ہدایت و رشد کی استدعا کر رہا ہے، اور غیبر متزلزل یقین کے ساتھ کر رہا ہے کہ جو اس کی آنکھ چاہے جو تماشا دکھلائے، اور وہم چاہے جو مانے اور منوائے، یہ ساری نعمتیں حق تعالیٰ ہی دے سکتے ہیں، اور دیتے ہیں، ان کے سوا نہ کسی میں حول و قوت ہے اور نہ فعل و اثر و مابیکہ مین نعمتہ فمن اللہ! صورتوں سے جو ہم نے امیدیں باندھ رکھی ہیں، صورتوں کو جو ہم نے خوف کی چیزیں سمجھ رکھی ہیں، صورتوں کے سامنے جو ہم ذلت کا اظہار کر رہے ہیں، اور صورتوں کے سامنے ہاتھ پھیلا رہے ہیں، اور ان کو رب بنا رکھا ہے، کیس قدر عظیم الشان دھوکا ہے، اس کے ضرر و اضلال کا پہلو کس قدر قوی ہے، عزت نفس کی خونریزی کو دیکھو، اپنی ذلت و رسوائی کو دیکھو، اس کذب و افتراء کے نتائج پر غور کرو، فقیروں کے در پر سوال کرنے سے بھی کچھ ملتا ہے، اس غریب کے ہاں کیا رکھا ہے جو دوسروں کو دے، امیدوں کا خون ہونا لازمی ہے، حسرت و حرمان قطعی، جو بیچارہ اپنے درد دکھ کو دفع نہ کر سکتا ہو، وہ تمہارے درد و غم کا کیا علاج کر سکتا ہے، وہ تمہارا مولیٰ و رب کیسے ہو سکتا ہے، ہائے تم نے حقیقت کو چھوڑ کر سایہ کا تعاقب شروع کر دیا ہے، بیدار کو چھوڑ کر مدہوش سے التجا کر رہے ہو، زندے کو چھوڑ کر مردے سے لپٹے ہوئے ہو! تمہارے وہم نے تمہیں کس التباس میں مبتلا کر رکھا ہے!

بقولِ دشمنِ پیمانِ دوستِ شکستی      ہمیں کہ از کہ بریدی و با کہ پیوستی!

معبود و مستعان صرف حق تعالیٰ ہی ہیں، ذل و افتقار کی نسبت ان ہی سے ہمیں جوڑنا چاہیے، وہی ہماری امیدوں کے مرکز ہیں، ان ہی کی ناراضی سے ہمیں خوف کرنا چاہیے، اور چوب و سنگ یا گوشت و پوست کے جھوٹے خداؤں سے بندگی کی نسبت قطعاً توڑ لینا چاہیے، ان سے نفع و ضرر کی توقع قطعاً چھوڑ دینی چاہیے۔

تاچند گہ از چوب گہ از سنگ تراشی بگذرا ز خدائے کہ بصد رنگ تراشی

حق تعالیٰ کی معبودیت و ربوبیت پر یقین، یہ ایمان سیرت کا سنگ بنیاد ہے، اسی یقین کی پرورش ہونی چاہیے، الہ باطلہ کی نفی، الہ حق کا اثبات قلب کی گہرائیوں میں ممکن ہو جائے۔ تحت الشعور نفس میں جاگزیں ہو، رگوں میں خون کی طرح دوڑ جائے، علم یقین کے مرتبہ سے گزر کر حق یقین کے درجہ تک پہنچ جائے، متحقق ہو جائے تو پھر ایسی شخصیت کی تخلیق ہوتی ہے جس کا مقابلہ کائنات کی کوئی قوت نہیں کر سکتی، وہ بھولے تخلقوا باخلاق اللہ خلق الہی سے مزین ہوتا ہے، تمام صفاتِ رذیلہ سے پاک اور تمام اوصافِ حمیدہ سے آراستہ و پیراستہ ہوتا ہے، کامل عبد ہوتا ہے، جس سے بہتر جس سے زیادہ مقدس دنیا میں کوئی شے نہیں ہوتی!

توحیدِ معبودیت کی رو سے حق تعالیٰ ہی مالک و حاکم قرار پاتے ہیں اور مستحقِ عبادت ٹھہرتے ہیں، ہمارا حقیقی مالک و حاکم ہی کے سامنے جھکتا ہے جس کے لگے ساری کائنات سرنگوں ہے، طوعاً و کرہاً اور توحیدِ ربوبیت کی رو سے حقیقی فاعل حق تعالیٰ ہی قرار پاتے ہیں وہی خالق ہیں، وہی نافع و ضار ہیں، وہی زندہ کرتے ہیں اور مارتے ہیں، ہمارا ہاتھ ان ہی کے آگے دراز ہوتا ہے، اور انہی سے ہم مدد و اعانت کے لیے درخواست کرتے ہیں، غنی کی فقیر ہمیں ساری کائنات سے بے نیاز اور غنی کر دیتی ہے!

دیکھو توحیدِ معبودیت و ربوبیت کا سبق دے کر عرب کے اُمّی معلم (فداہ ابی وامی) نے اپنے متبعین کو صفاتِ رذیلہ سے کس طرح پاک اور صفاتِ حمیدہ سے کس طرح مزین کر دیا تھا، صفاتِ رذیلہ جن سے تمام علمائے اخلاق قلوب کا تزکیہ چاہتے ہیں، اس باغی میں یوں ادا کیے گئے ہیں:-

خواہی کہ دلت شود صاف چو آئینہ	دہ چیزوں کن از درون سینہ
حرص و حسد و بخل و حرام و غیبت	کذب و غضب و کبر و ریا و کینہ



دیکھوان صفاتِ قیمہ سے قلب کا تزکیہ سقراط کے "طنزیات" افلاطون کے "مکالمات" ارسطو کی "اخلاقیات" اور جدید فلسفیوں کے عالمانہ "خطبات" کے بغیر پڑھے اور سمجھے صرف لڑالہ الہ اللہ کے مختصر جملہ کو ماننے اور اس پر عمل پیرا ہونے سے کس آسانی سے ہو جاتا ہے۔

جب تک انسان دولت کو اپنی ملک سمجھتا ہے، خود ہی کو اس کا مالک جانتا ہے، نہ حرص کا اس کے قلب سے تسلط اٹھ سکتا ہے اور نہ بخل و حسد کا، جون ہی اس نے سچے دل سے توحید فی الآثار کا اقرار کیا، اور یہ مان لیا کہ لہ ما فی السموات و ما فی الارض و ما بینہما، اللہ ہی کے لیے ہے سارے آسمان اور زمین اور ان کے درمیان جو کچھ ہے، تو اس نے اپنی مالکیت و حاکمیت کی نفی کی اور حق تعالیٰ کی مالکیت و حاکمیت کا اثبات کیا، حقیقی مالک و حاکم و متصرف حق تعالیٰ کو جانا، اور اپنی ذات کو محض "امین" سمجھا، اب اس کی سمجھ میں بھی آ گیا کہ حقیقی مالک ہی کو تصرف کا حق حاصل ہوتا ہے، امین امانت کے شرائط کے تحت ہی تصرف کا اختیار رکھتا ہے، اب اگر دولت پر جو اس وقت اس کی امانت میں ہے، کوئی آفت آجاتی ہے تو وہ بحیثیت امین اس کو بچانے کی حتی الامکان کوشش کرتا ہے، اگر بچ نہ سکے تو جانتا ہے کہ مالک حقیقی امانت کا استرداد چاہتا ہے، اور خوشی وہ اپنی امانت حوالہ کر دیتا ہے، اس طرح نہ اس کے جانے کا اس کو سنجھتا ہے، اور نہ اس کے اگلے کی خوشی، اور اس کا قلب ان اختلال پیدا کرنے والے تاثرات سے پاک اور آزاد رہتا ہے، اور وہ ۶۰ :-

یک دل دلے بس است یک دوست ترا

کہہ کر حق تعالیٰ ہی کو اپنا محبوب قرار دیتا ہے، اور ایک دم رنج و غم، پریشانی و پشیمانی کے تمام احساسات و جذبات سے حقیقی معنی میں نجات حاصل کر لیتا ہے، ایسے ہی خوش قسمت کی ذہنیت کو ان الفاظ میں پیش کیا گیا ہے۔

لکیرانا سوا علی ما فاتکھ ولا تفرحوا تاکہ تم غم نہ کھاؤ اس پر جو ہاتھ نہ آیا اور شخی نہ کرو

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ (۱۹۷۷ء)

اس پر جو تم کو اس نے دیا۔

ان اصول کو سمجھ لینے کے بعد غور کرو کہ وہ شخص حرص کیسے ہو سکتا ہے، جو مال و دولت کا حقیقی مالک حق تعالیٰ کو سمجھتا ہے، اور ان احمقوں کو جو اپنی ذات کو مالک سمجھ رہے ہیں، مختار کر کے کہتا ہے :-

گماں مبر کہ زرو سیم دادہ اند ترا      ودیعتے است کہ داری بدست روزی چند  
چہ سود گر لشبوی غسره بر متاع کسے      چو موش بر سردگان روستا خر سند

حرص کے ساتھ بخل و حسد کی بھی جڑیں کٹ جاتی ہیں، جب مال و دولت و دیت و امانت ہیں اور وہ بھی چند روزہ امانت، موت کے وقت یہ ہم سے واپس لے لی جاتی ہیں، اور دوسروں کے حوالہ کی جاتی ہیں، تو پھر اس علم کے بعد ہماری ذہنیت اس چوہیا کی طرح کیسے رہ سکتی ہے جو بیسے کی دکان کی ساری چیزوں کو اپنی سمجھتی ہے اور اپنے ہی کو مالک و متصرف جان کر بخل و حرص کا شکار بنتی ہے، غیر کے مال میں بخل بے معنی ہے، بخل ہونا ہر اپنے مال میں مال اپنا نہیں، پھر بخل کیسا؟ حرص کی بنیاد ہی اس خیال پر قائم ہے کہ مالک ہم ہیں، حقدار ہم ہیں، ہم کو نہیں مل رہا ہے، دوسروں کو مل رہا ہے، ہم کو کیوں نہ ملے! جب مال میرا ہے نہ تیرا بلکہ مالک حقیقی کا تو حسد کس پر؟ حسد و حرص اور ان کے لازمی نتائج، غم و غم، درد و غم، سنج و الم نتیجہ ہیں خیانت فی الامانت کا، یعنی شرک کا، جوں ہی شرک کی جڑیں قلب سے لالہ الاله اللہ کے ذریعہ اکھاڑ کر پھینک دی گئیں، اور اس کی بجائے توحید جلوہ افروز ہو گئی انسان ان تباہ کن جذبات کے چنگل سے نجات پا جاتا ہے، حقیقی آزادی کا لطف اٹھاتا ہے، سکون و برد قلبی کی دولت سے سرفراز کیا جاتا ہے۔

کبر و فخر و عجب کی اس قلب میں گنجائش ہی کہاں جو اپنے کو حاکم نہیں محکوم، مالک نہیں مملوک، رب نہیں مرئوب، مولیٰ نہیں عبد سمجھتا ہو، اپنی محکومیت و مملوکیت کا حق جو موقد کے دل کی گہرائیوں میں جاگزیں ہے، فخر و غرور کے جذبات کو پیدا ہونے نہیں دیتا۔

اس کی عضویت اس زہر کو قبول کرنے کی صلاحیت یا استعداد ہی نہیں رکھتی۔  
 اب توحید فی ربوبیت کے قیام کے آثار پر غور کرو جب تم نے فاعل حقیقی حق  
 تعالیٰ کو مان لیا، اَلْحَوْلُ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ کے قائل ہو گئے، نافع رضارفی الحقیقت  
 انہی کو سمجھنے لگے، تو خوف و حزن سے تم نے رستگاری حاصل کر لی، غیر کو نافع و ضار  
 قرار دینے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ تم کو اس سے نفع پہنچنے کی اُمید ہوتی ہے، اور اس اُمید  
 کی شکست حزن و غم کو ضروری طور پر پیدا کرتی ہے، اس سے ضرر کا اندیشہ تمہارے سینہ کو  
 خوف سے بھر دیتا ہے، جو نہی تم نے وہم کے اس بت کو توڑا، اور حق تعالیٰ کی اس تشبیہ  
 کو یاد کیا، کہ

وَلَا تَدْعُ مِنْ دُونِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكَ ۚ اَللّٰهُ كَيْ سَوَّاهُ كَوْمَتِ بَكَارِ، ايسے كو كه نه بھلا  
 وَلَا يَضُرُّكَ فَاِنْ فَعَلْتَ فَاِنَّكَ اِذَا كَرِهْتَ اِيْرٰهٖ اَوْ رَهٗ بُرَا، پھر اگر تو ايسا كرسے، تو تو  
 مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ (پ ۱۶۶) جو جائیگا ظالموں میں۔

غیر اللہ کی ربوبیت تمہارے قلب سے فنا ہو گئی، نفع کی اُمید، ضرر کا خوف تمہارے سینہ  
 سے جاتا رہا، اور حزن و خوف سے تم نے ہمیشہ کے لیے نجات پالی۔

اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا مَقْرٰجِيْبُوْنَ لِيْ كَمَا كَمَا هَمَارِ اَب اللّٰهُ سِي، پھر  
 فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ! ثابت قدم رہے تو نہ ڈریں اُن پر اور نہ وہ  
 (پ ۲۶) غمگین ہونگے۔

ربوبیت پر جہاں تم نے استقامت پیدا کر لی کہ دنیا اور زندگی کے متعلق تمہارا سا نقطہ  
 نظر بدل گیا، نقطہ نظر کا بدلنا کھتا، کہ زمین و آسمان بدل گئے۔

چو بنیروز خیال از چشمِ احوال زمین و آسماں گرد و مہدَل  
 ایک وہم تھا، خیال تھا، جس نے تمہیں خوف و حزن کی زنجیروں میں جکڑ رکھا تھا، اب تم  
 نے اس خیال کی تصحیح کی، ذہنی صحت تمہیں حاصل ہوئی، نور کی طرف تم نے اپنا منہ کر لیا،

اور تمہاری روح اپنے خالق و حاکم کو مخاطب کر کے چیخ اٹھی۔

اللَّهُمَّ اسَلَمْتُ نَفْسِي إِلَيْكَ وَ  
وَجَّهْتُ وَجْهِي إِلَيْكَ وَكَوَّضْتُ أَمْرِي  
إِلَيْكَ وَالْبِحَاتُ ظَهَرِي إِلَيْكَ رَغْبَةً  
وَرَهْبَةً إِلَيْكَ لَا مَلْجَأَ وَلَا مَنجَاةَ مِنْكَ  
إِلَّا إِلَيْكَ  
میں اور تیری ناراضی سے ڈر کر میری پناہ اور نجات  
کا مرکز تو ہی ہے۔

اس اقرارِ ربوبیت کے ساتھ ہی تم نے اپنے قلب میں طمانیت و راحت محسوس کی، اعتماد و یقین نے خفتہ قوتوں کو جگایا، سارا عالم تمہیں لفع و ضرر سے خالی، تمہارے ساتھ تعاون و عمل کے لیے تیار، تمہارا رفیق و خادم نظر آنے لگا! زندگی کے راستہ میں تمہارے قدم بیباک انداز میں اٹھنے لگے، تمہارا سینہ کینہ سے پاک ہو گیا، کیونکہ تمہارا یہ وہم دور ہو گیا کہ سوائے حق تعالیٰ کے ضرر اور نقصان پہنچانے والا درحقیقت دوسرا کوئی ہو سکتا ہے، جو اس کی آنکھوں کو دشمن بے رحم دیکھ رہی تھی، ایمان کی آنکھ اس کو حق تعالیٰ کا فرستادہ بتلا رہی ہے اور سعدیؒ کے پراثر الفاظ میں کہہ رہی ہے

چوں دشمن بے رحم فرستادہ اوست بدعدم اگر نہ دارم این دشمن دوست  
اسی وقت غیظ و غضب سے بھی تمہارا نفس پاک ہو گیا، دوست پر غضب کیسا؟ اس یقین کے بعد کہ ہر آفت ہر مصیبت سیرت کے کسی نقص کو رفع کرنے آتی ہے، معلوم حقیقی کی طرف سے تشبیہ ہے جو ہمیں اپنے نقائص و ذمائم کی طرف متوجہ کرتی ہے، ان کی اصلاح کا موقع دیتی ہے، ہم کو ظلمت سے نکالتی اور نور کی طرف ہمارا رخ پھیر دیتی ہے، حق تعالیٰ سے جوڑتی اور نفس و شیطان سے توڑتی ہے، ہاں پھر اس یقین و اذعان کے بعد ہمارا سینہ غیظ و غضب کا محل کیسے بن سکتا ہے؟

لہٰذا اس حدیث کے الفاظ ہیں جو صحاح ستہ میں موجود ہے۔ رواہ البخاری عن البراء بن عازب، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وقتِ آخری چیز پڑھتے تھے۔

ریا جو خلق کے لیے اپنے اعمال کی تزیین ہے، اسی وقت ممکن ہے، جب خلق کو نافع و  
 ضار سمجھا جائے، خلق سے توقعات وابستہ ہوں، یا ضرر کا اندیشہ ہو، اس وہم کے دور  
 ہو جانے کے ساتھ ہی ریا کاری اور تصنع و نمائش کی جڑیں کٹ جاتی ہیں، عمل صرف حق  
 تعالیٰ ہی کے لیے جاری ہو جاتا ہے، حور و قصور کے لیے نہیں رہتا، کیونکہ یہ بھی مخلوق ہیں،  
 اور مخلوق سے نہ راحت ہے اور نہ سرور و عزت اور نہ یہ مقصود بالذات۔

کذب یا دروغ بانی کا محرک یا تو نفع کا حصول ہوتا ہے یا ضرر کے دفع کا خیال یا  
 پھر خود بینی و خود ستائی، کبر و فخر، عجب و ریا، ہم نے اوپر دیکھا کہ ربوبیت حق ان صفات  
 ذمیمہ کا استیصال کس خوبی سے کر سکتی ہے، اسی لیے موقد کا قلب صداقت کا خزانہ ہوتا  
 ہے، وہ وعدوں کا پتلا، قول کا سچا ہوتا ہے وَالْمُؤْمِنُونَ بَعْدَهُمْ إِذَا عَاهَدُوا كَامْصِقَاتٍ۔

اسی طرح غیبت شرک فی الربوبیت کا نتیجہ ہے، غیبت کی وجہ یا تو عداوت ہوتی ہے

جس کا محرک نقصان و ضرر کا اندیشہ ہوتا ہے، یا حسد یا محض کذب سے حاصل ہونے والی  
 شیطانی لذت، ربوبیت کا صحیح علم اور اس پر یقین ان تمام ذمائم کی بے خطا دوا ہے، جیسا  
 کہ ہم نے اوپر ثابت کیا، غیر اللہ کو حقیقی نافع و ضار قرار دے کر عداوت و بغض و حسد میں  
 مبتلا ہوں، اور غیبت نتیجہ کے طور پر پیدا ہوتی ہے، خود آفریدہ التباس کو صحت علمی نے  
 دفع کر دیا اور ان ذمائم کی گرفت سے قلب کو نجات ملی۔

غرض تزکیہ نفس و تصفیہ قلب یعنی سیرت سازی کے لیے سب سے پہلے شرک فی  
 المعبودیت اور شرک فی الربوبیت کی بیخ کنی ضروری ہے، لا کی شمشیر سے مالکیت حاکمیت  
 اور ربوبیت ذواتِ خلق سے کاٹ دی جاتی ہے، اور اللہ سے اس کا اثبات ذات حق میں  
 کیا جاتا ہے، اور اس طرح اخلاقِ الہیہ سے آراستہ ہونے کی قابلیت اور استعداد پیدا  
 کی جاتی ہے، اب مجاہدہ اور عمل اس مقصود کے حصول کے لیے ضروری ہیں اس کی توضیح

لہ پورا کرنے والے اپنے اقرار کو جب عہد کریں۔



میں چند مقامات کا پیش نظر رہنا لازمی ہے۔

ابتداء میں ہم نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ علم ہی سے عمل پیدا ہوتا ہے، لیکن علم سے مراد محض نظری علم نہیں لینا چاہیے، جو کانوں کی راہ سے داخل ہوتا ہے، لیکن قلب میں جاگزیں نہیں ہوتا، اس لیے عمل کی صورت میں نمایاں ہونے کی قوت نہیں رکھتا اور اس لیے منفعت بخش نہیں ہوتا۔ علم سے مراد ہماری مراد وہ یقین و اذعان ہے جو قلب کی گہرائیوں میں اپنا مسکن بناتا ہے، خون کی طرح تمام رگوں میں دوڑتا ہے، دماغ پر کامل تسلط رکھتا ہے، اور لازماً عمل کی صورت میں نمودار ہوتا ہے، ایسا یقین تفکر و تردد یا مراقبہ سے پیدا ہوتا ہے۔ اسی لیے تفکر کو عبادت سے افضل قرار دیا گیا ہے، تفکر و مراقبہ سے علم راسخ ہوتا ہے۔ مضبوط ہوتا ہے، تلویں جاتی ہے، تمکین رونما ہوتی ہے اور راسخ عقیدہ ہی عملاً اپنا خارج میں ظہور کرتا ہے۔ جب عمل کی تکرار ہوتی ہے، تو عادت پیدا ہو جاتی ہے، جو فطرتِ ثانیہ کہلاتی ہے، اب عمل کے لیے فکر و غور کی ضرورت باقی نہیں رہتی، غیر شعوری نفس عمل کی باگ اپنے ہاتھوں میں لے لیتا ہے، مضائقہ رفع ہو جاتی ہے، سہولت پیدا ہو جاتی ہے سیرت قائم ہو جاتی ہے، اسی لیے کہا گیا ہے ع

چند روز جہد کن باقی بخند

اب ہمیں سیرت سازی کے دوسرے اہم عنصر مجاہدہ یا عمل و عادت کی طرف توجہ کرنی چاہیے۔

(۲) **مَجَاهِدَةٌ**: پاک سیرت جس طرح بغیر صحیح علم اور عقیدہ کے ممکن نہیں، اسی طرح بغیر عمل صالح اور مجاہدہ کے اس کی تمام خوبیوں کا نمایاں ہونا بھی ممکن نہیں

۱۔ یسے علم سے استاذہ کیا گیا ہے۔ اعوذ بک من علم لا ینفع ومن قلب لا ینتفع۔  
 ۲۔ تفکر ساعة خیر من عبادۃ سبعین سنة (الدیلمی در روی البوشیح من حدیث ابو ہریرۃ)  
 ۳۔ قل انی اعظکم بواحدۃ ان تقوموا للہ مشغولین و فرادی ثم تفکر و ا، (پج۔ ۱۲۷) سے تفکر کا حکم صاف طور پر سمجھ میں آتا ہے۔

اسی لیے فرمایا گیا، جَاهِدُوا فِي اللَّهِ حَقَّ جِهَادِهِ اور صیح عقیدہ مجاہدہ کی حشم بصیرت افزائی کے سامنے نیکیوں کی تمام راہیں کھول دیجاتی ہیں۔ وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا اب ہمیں مجاہدہ کی ماہیت اور اس کے طریقوں کو سمجھ لینا چاہیے۔

ذرا اپنے ذہن کے نہان خانہ کو تو دیکھو کہ کیا یہ ایک لحظہ خیالات، تصورات، خواطر اور وساوس سے خالی بھی رہتا ہے؟ علم کا ایک دریا ہے کہ امڈا چلا آ رہا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک لامتناہی مبداء سے نکل رہا ہے، اس کی ماہیت و نوعیت پر غور کرو تو ظاہر ہوتا ہے کہ اخلاقی نقطہ نظر سے یہ یا تو ہدایتی علم ہے یا اضلالی۔ اس کی آمد کسی طریقہ سے روکی نہیں جاسکتی، کونسی قوت اس کو روک سکتی ہے؟ کسی خیال کو محض ارادہ کی قوت سے پیدا نہ ہونے دینا بشری طاقت سے باہر ہے، خیالات آزادی کے ساتھ ایک نامعلوم منبع سے ظہور کرتے ہیں، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسان نہ ان کے پیدا کرنے پر قادر ہے اور نہ ان کے فنا کرنے پر! لیکن انسان کو اتنی طاقت دی گئی ہے کہ اپنی توجہ اضلالی علم کی طرف سے ہٹا کر ہدایتی علم کی طرف مبذول کرے، یا نفسیاتی اصطلاح میں یوں کہو کہ سلبی خیالات کو ایجابی خیالات میں بدل دے، یہی مجاہدہ کی ماہیت ہے، ذہن میں سلبی یا اضلالی خیال غیر اختیاری و اضطراری طور پر پیدا ہو رہا ہے، اب یہ میرے اختیار میں ہے کہ میں اس خیال کو گلے سے لگاؤں، پیار کروں، قلب کے میدان میں تخت بچھا دوں، اور اس کو معزز مہمان کی طرح عزت و وقار سے بٹھا دوں، یا یہ کہ اس کے ذہن کے دروازہ سے سر نکالتے ہی اس کے مقابل ہدایتی یا ایجابی خیال کو اس کی سرکوبی کے لیے آؤں، اور نور کی قوت کو ظلمت کی طاقت سے لڑا دوں، ظاہر ہے کہ نور و ظلمت کے مقابلہ میں نور ہی کامیاب ہوگا، کیونکہ ظلمت نور ہی کے غیب کا

۱۔ مجاہدہ کرو اللہ کے واسطے جیسا کہ چاہیے اس کے واسطے مجاہدہ کرنا (پس ۷۱)

۲۔ جنہوں نے ہلکے واسطے مجاہدہ کیا ہم ان کو اپنی راہیں سجدانگے (پس ۷۲)

تو نام ہے، نوری کے عدم سے ظلمت پیدا ہوتی ہے، جہاں نور ہو وہاں ظلمت کیسے چھا سکتی ہے! مجاہد حق تعالیٰ ہی کی حول و قوت سے اضلالی علم کے بجائے ہدایتی علم پر عمل کرنے کا نام ہے، اضلالی خیالات کے ذہن میں خطور کرنے ہی مجاہدہ کی روح "خیر کے مبد" کی طرف استعانت کے لیے متوجہ ہو جاتی ہے، استعاذہ کرتی ہے، پناہ مانگتی ہے، اپنی محدود قوت پر بھروسہ نہیں کرتی اپنی بچاؤگی سے واقف ہوتی ہے، لامتناہی قوت کے آستان پر تیزی کے ساتھ پہنچ جاتی ہے، اور توجیح آٹھتی ہے:-

”سبحان ذی الملك و الملکوت سبحان ذی العزّة و الجبروت سبحان الحق  
الذی لا یموت اعوذ بعفوک من عقابک و اعوذ برضاک من سخطک و  
اعوذ بک منک جلّ و جھک لہ“

اور یہ لامتناہی عزت و جبروت، یہ لامحدود ملک و ملکوت والا آقا ہم سے دور نہیں، وہ جو بالذات ہے جہاں میں موجود ہر جگہ ہمارے پاس ہی تو ہے، رگ جان سے زیادہ قریب ہے، با ازمانہ نزدیک تر، وہ الغیث کی اس پکار پر شانِ رحمت کے ساتھ متوجہ ہو جاتا ہے، اور اس کی تجلی کے ساتھ ہی قلب کے ضرر و اضلال سے پوری حفاظت ہو جاتی ہے! یا نفسیاتی اصطلاح میں یوں کہو کہ سلبی خیال کی جگہ ایجابی خیال لے لیتا ہے، اور شرکاء صدور ہی نہیں موعنے پاتا۔ نفسیات کے اس مسئلہ قانون کو یاد کرو، جس پر اس مقالہ کی بنیاد قائم ہے، کہ افکار ہی سے اعمال کا صدور ہوتا ہے، اعمال ہی کی تکرار سے عادت کا قیام ممکن ہے، اور عادات کی تنظیم و ترتیب سے سیرت کی تشکیل ہوتی ہے، مجاہدہ سلبی یا بد یا اضلالی خیالات کا گویا دروازہ ہی پر مقابلہ ہے جو ہی ان خیالات نے کتم عدم سے سز نکالا، ان کے مقابل کے ایجابی یا نیک یا ہدایتی خیالات نے ان سے ٹکری، اپنی محدود کمزور قوت سے ان کا مقابلہ نہیں کیا، بلکہ نامتناہی قوت و جبروت کے مبد سے اخذ فیض کیا۔ اور اس طرح بے پناہ

لے یہ اس حدیث کے الفاظ ہیں جس کو حاکم نے حضرت عمرؓ سے روایت کیا ہے۔

طاقت کے ساتھ ان پر ضرب لگا دی اور ان کا قلع قمع کر دیا جب عمل ہی کا صدور اس طرح روک دیا گیا، اور ابتداء ہی میں روک دیا گیا، تو تکرار کی نوبت ہی کہاں، عادت کا قیام کس طرح ممکن اور سیرتِ بد کی تشکیل کا کیا ذکر، یاد رکھو کہ فاسد خیالات کو قوت اس وقت ملتی ہے جب وہ تخیل کے دروازے سے خانہ قلب میں داخل ہو جاتے ہیں، اور یہ داخل اسی وقت ہو سکتے ہیں، جب دربانِ قلب غفلت کی نیند سو رہا ہو، چوکس نہ ہو، ہوشیار اور خبردار نہ ہو، یا پھر اپنی حول و قوت سے ان کا مقابلہ کرنا چاہے! اس صورت میں معلوم ہوتا ہے کہ ان کا زور مردانگن ہے، ان سے مقابلہ بچوں کا کھیل نہیں، یہ بڑے سے بڑے پہلوان کو آسانی سے پچھاڑ سکتے ہیں، ان کے داؤں پیچ سے بہادر سے بہادر بھی پناہ مانگتے ہیں، ان سے مقابلہ کی ایک ہی صورت ہے، ان کے دروہ کے وقت ہی انہیں پچھاڑا جائے، سنبھلنے کا موقع نہ دیا جائے اور حق تعالیٰ کے حول و قوت سے ان کا سامنا کیا جائے اللّٰهُمَّ اَعِزَّنِي مِنْ شَرِّ نَفْسِي ۱۷ کی فریاد فوراً بلند ہو، اَعُوذُ بِكَ مِنْكَ کی چیخ فوراً نکلے، پھر شکست ناممکن ہے، کامیابی قطعی ہے، حق تعالیٰ کی پناہ میں آکر مغلوبیت کیا معنی رکھتی ہے، ناکامی کیا چیز ہے، ان کی معیت کے ساتھ ہی بلندی نصیب ہوتی ہے اِنَّتُمْ اِلَّا عُلُوْنَ وَاللّٰهُ مَعَكُمْ ۱۸ کا وعدہ پورا ہو جاتا ہے۔

یہ نفسیاتی الہیاتی طریقہ بد عادات کی شکست میں بھی کامیابی کے ساتھ استعمال کیا جاسکتا ہے، بد عادت سے مراد کوئی عادت ہے جو ہمارے اختیار و تصرف میں نہیں، بد عادت کی غلامی تباہ کن نتائج پیدا کرتی ہے، بد عادت کا غلام دنیا میں نہ کامیاب ہو سکتا ہے اور نہ بردِ قلبی اس کو نصیب ہو سکتی ہے، چونکہ افعال ہی کی تکرار سے عادت بنتی ہے، اور افعال کا محرک ہمیشہ خیال یا تصور ہوتا ہے، لہذا بد عادت کی شکست خیال کی تبدیلی پر

۱۷ لے اللہ میرے نفس کے شر سے مجھ کو پناہ دے۔

۱۸ تم ہی رہو گے غالب اور اللہ تمہارے ساتھ ہیں (پت ۸۷)

محصّر ہے، عادت کے قائم ہو جانے پر فعل کے ارتکاب کی ایک طبعی خواہش ہوتی ہے، لیکن ساتھ ہی اس خواہش کی تکمیل کا خیال پیدا ہوتا ہے، ممکن ہے کہ خواہش پر ہمارا قابو نہ ہو، لیکن خیال ہمکے تصرف میں آسکتا ہے، اگر خیال کا صحیح طریقہ سے مقابلہ کر لیا جائے تو خواہش بھی مغلوب ہو جاتی ہے، مثال کے طور پر شرابی کی حالت پر غور کرو۔ اس کو شراب کی خواہش ہوتی ہے، اور یہ خواہش یہ خیال پیدا کرتی ہے کہ چل کر مینا چاہیے، خیال کا کامیابی سے مقابلہ کرنے پر خواہش کے اشتداد میں کمی ہوتی جاتی ہے۔ ایک مرتبہ کا مقابلہ دوسرے دفعہ کے مقابلہ کو آسان تر بناتا ہے، اور مجموعی نتیجہ حیرت خیز ہوتا ہے، یہی معنی ہیں اس قول کے کہ خدا ان لوگوں کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد آپ کرتے ہیں“

بہر طور بڑی عادتوں کے آہنی پنجہ سے رہائی اسی وقت ممکن ہے کہ خیال کے پیدا ہوتے ہی اس کا مقابلہ کیا جائے اور اسی طریقہ سے مقابلہ کیا جائے جس کا اوپر ذکر ہوا، اگر اس کے باوجود ہمیں ناکامی کی صورت دیکھنی پڑے، تو ہمیں مایوس اور ناامید نہیں ہونا چاہیے، مجاہد کے نزدیک یا اس کفر ہے گناہ کے ارتکاب کے بعد یا عادت بد کا پھر ایک مرتبہ (باوجود عزم و نیت کے کہ ایسا نہ ہوگا شکارِ بے گنے کے بعد جو ذامت اس کے دل میں پیدا ہوتی ہے، جو حزن و ملال کہ وہ محسوس کرتا ہے، وہ اس کے ارادوں کو مضبوط کرنے میں غیر محسوس طریقہ پر مفید ہوتے ہیں اور وہ وقت بہت جلد آہنچتا ہے، جب وہ محض اسی طریقہ پر عمل پیرا ہو کر فاتحانہ شان سے اپنی خود ساختہ بیڑیوں کو توڑ کر ہمیشہ کے لیے آزاد ہو جاتا ہے، عارفِ روحی نے مجاہد کے اس اعتبار کو اپنے خاص انداز میں بڑی خوبی کے ساتھ پیش کیا ہے؛

اندریں رہی تراش دمی خراش	تادمِ آخر دمے فارغِ مباحث
تادمِ آخر دمے آخسر بود	کہ عنایت با تو صاحب سر بود
دوست دارد دوست این آشفنگی	کوششِ بیودہ بہ از خفتگی!
کار کے کن تو تو کاہل مباحث	اندک اندک خاک چرامی تراش



چوں ز چہ ہے مئی کنی ہر روز خاک  
عاقبت اندر سی در آب پاک

چوں نشینی بر سر کوئے کسے!  
عاقبت بینی تو ہم روئے کسے

بہر حال مجاہد بہت سے کام لیتے ہیں، حق تعالیٰ نے اس کو جو اختیار دے رکھا ہے، اس کو استعمال کرتا ہے، اور عزمِ راسخ رکھتا ہے کہ جب تک گوہر مقصود ہاتھ نہ آئے قلب کا تزکیہ روح کا تجلیہ نہ ہو جائے، وہ دم نہ لیگا، اور حق مجاہدہ ادا کریگا، ولولہ انگیز طریقہ سے ہر قدم پر وہ گنگناتا جاتا ہے۔

دست از طلب ندارم تا کار من بر آید

یا تن رسد بجاناں یا جان ز تن بر آید

کامیابی و فتح مندی اس مجاہد کے ہاتھ چومتی ہے گانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرَ الْمُؤْمِنِينَ  
کا وعدہ اس سے متعلق ہے! ہدایت کے راستے کھل جاتے ہیں لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا كَا قَوْلِ  
پورا ہوتا ہے۔

مجاہدہ بیوی بچوں کا چھوڑنا، راتوں میں کم سونا، فاقہ پر فاقہ کرنا، حقوقِ نفس کو تلف کرنے کا نام نہیں، مجاہدہ "حقوقِ نفس" کا ادا اور غیر شرعی "خطوطِ نفس" کا ترک کرنا ہی، مجاہدہ قلب کا تصفیہ ہے، روح کا تجلیہ ہے، اس کا بہترین طریقہ خیالاتِ فاسدہ کا دماغ سے تھکیہ ہے، جو شخص اپنے قلب و دماغ میں فاسد خیالات کے بجائے پاک خیالات کو سبلی افکار کے بجائے ایجابی افکار کو جگہ دیتا ہے، وہ اعمالِ سیئہ کا دروازہ بند کر دیتا ہے، اس کے لیے امتثالِ مامور، اجتنابِ مخطور، اور رضا بہ مقدر آسان ہو جاتے ہیں، جو عارفِ اعظم شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے الفاظ ہیں دین کا خلاصہ ہیں!

ایجابی خیالات میں سب سے زیادہ ایجابی خیال حق تعالیٰ کا خیال ہے، جو حشر  
ہیں تمام محامد و محاسن کا، تمام خوبیوں اور نیکیوں کا، جو مبدئ ہیں طمانیت و سرور کا، علو و

لہ فتوح الغیب مقالہ اول۔

بلندی کا، قوت و عزت کا، اگر تم اپنے قلب کو تمام سلبی خیالات سے خالی کر کے حق تعالیٰ کے خیال کو اس میں جملنے کی کوشش کرو گے تو چند روز میں پاؤ گے کہ یہ تمام صفات مقید پیمانہ میں تم میں خود ظاہر ہو رہی ہیں، ان نفسیات کا یہ عام قانون ہے کہ آدمی جس چیز کے خیال اور دھن میں رہتا ہے، رفتہ رفتہ اسی کی خوب اس میں پیدا ہونے لگتی ہے، یا نفسیاتی زبان میں یوں کہو کہ اس کا جو معروض فکر ہوتا ہے وہی وہ بھی بن جاتا ہے! اس قانون کو جان کر اور مان کر تم ہرگز سلبی خیالات پر فکر و توجہ کو زیادہ مرکوز نہ کرو گے، ایجابی خیالات ہی کو جملنے اور بسلنے کی کوشش کرو گے، اب ہم عارف روم کے الفاظ میں پوچھتے ہیں کہ حق تعالیٰ سے بہتر کوئی اور چیز ہو سکتی ہے جس سے تم ایک لحظہ کے لیے حقیقی معنی میں خوش رہ سکتے ہو۔

کیست زو بہتر گوئے ہیج کس      تابداں دلشاد باشی یک نفس؟  
 اگر تمہیں چشم بصیرت ملی ہے، اور تم عارف روم کے ساتھ اتفاق کرتے ہو تو پھر کیا حق تعالیٰ کی دھن سے بہتر اور کسی کی دھن ہو سکتی ہے؟ اب دن کا زیادہ حصہ اسی دھن میں گزارو، گفتار کو چھوڑ کر اسی کار بزرگ میں لگ جاؤ، رفتہ رفتہ جامی سامی نے جو کہا تھا، اس کا تم کو تحقق ہونے لگیگا۔

گرد دل تو گل گزر و گل باشی      در بلبل بے قرار بلبل باشی  
 تو جزوی و حق کل است اگر روزی چند      اندیشہ کل پیشہ کنی کل باشی  
 جو چیز تم کو خود تجربے سے معلوم ہو جائیگی اس کا ذکر ہم کیا کریں، لیکن تحریر کے لیے اتنا کتنا کافی ہے، کہ تم پرسور اور فرح کے دروازے کھل جائیں گے، اطمینان قلب، جو دنیا کی کسی چیز سے حاصل نہیں ہو سکتا ہے وہ نقد دم ہوگا اور اس آئیہ کریمہ کا اپنی ذات کو مصداق پاؤ گے۔

يَا أَيُّهَا النَّفْسُ الْمَطْمَئِنَّةُ اجْعِي      اے وہ جی جس نے چین پکڑ لیا پھر چل اپنے

إِلَىٰ رَبِّكَ رَاضِيَةً قَرْضِيَّةً فَادْخُلِي  
 فِي عِبَادِي وَأَدْخُلِي جَنَّتِي ۝  
 پھر شامل ہو میرے بندوں میں اور داخل ہو میری  
 بہشت میں۔ (پت ۱۲۴)

نفسِ مطمئنہ کا حصول، رضائے الہی کا تحقق، جنت ذات میں دخول، یہ نتائج ہیں اس  
 مجاہدہ کی تکمیل کے؛ جو لذت کہ حق تعالیٰ کی یاد میں ہے، جو مستی اس کی یافت و شہود سے  
 حاصل ہوتی ہے، اس کے مقابلہ میں "لذاتِ جہاں" پیچ ہیں، جامی اس ذوقِ مستی کو اس و المات  
 انداز سے ادا فرماتے ہیں :-

کلے بیلِ جاں مست بیا د تو مرا      وے پایہ غم پست بیا د تو مرا  
 لذاتِ جہاں را ہمہ در پانگند      ذوقیکہ دہد دست بیا د تو مرا  
 حق تعالیٰ کی یاد کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ اس کا ذکر زبان پر جاری رہے، فاذکرُوا  
 اللہَ ذِکْرًا کَثِيرًا۔ پر عمل ہو، اٹھتے بیٹھتے یہی مشغلہ ہو، اس سے مقصود رخصا، و قرب الہی ہو  
 جب تمہاری توجہ ذکر کی وجہ سے خرافاتِ دنیوی سے ہٹ کر ایک نکتہ پر مرکوز ہوگی، تو  
 خود بخود فاسد، سلبی پریشان کن خیالات و وساوس کا دروازہ بند ہو جائیگا، اور جو نہی  
 خیالات کی یہ پراگندگی موقوف ہوئی ایک روحانی کیف و طمانیت سے تمہارا قلب  
 حلو ہو جائیگا اَلَا بِذِکْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ کے یہی معنی ہیں، ذکر کا قیام مشق اور مجاہدہ سے  
 آہستہ آہستہ ہوتا جاتا ہے، اور ذہول و غفلت کا ارتفاع ہو جاتا ہے۔ اس دولت کے حاصل  
 ہو جانے کے بعد تم تمام چیزوں سے غنی ہو جاتے ہو، نہ کسی چیز کے حصول سے تمہیں لذت  
 ہوتی ہے اور نہ کسی چیز کے ضائع ہونے سے رنج؛ لَکِن لَّا تَأْسُوْا عَلٰی مَا فَاْتَاکُمْ وَا لَّا  
 تَقْرَحُوْا بِمَا اٰتَاکُمْ کے مصداق ہونے لگتے ہو، اللہ کو رکھ کر تمہیں کسی چیز کی خواہش  
 نہیں رہتی، تم عارفِ روم کے الفاظ میں کہنے لگتے ہو :-

روز ہا گرفت گور و باک نیت      تو ہاں لے آنکہ جز تو پاک نیت

یاد کے قائم کرنے کا ایک اور آسان گریہ تمہیں بتلاتے ہیں، یہ تو تم مانتے ہو کہ ہر شے کے خالق حق تعالیٰ ہیں، شے ان کی مخلوق ہے، ہزار رات دن سابقہ ان ہی اشیاء سے ہوتے ہیں، یہی ہمارے دل اور دماغ میں بسی ہوئی ہیں، انہی کی محبت سے ہمارے قلوب بھیجے ہوئے ہیں، چونکہ یہ فانی اور گریہ پناہ ہیں، ان کا زوال اور ان کی فنا پذیری ہمارے غم و حزن کا باعث ہوتی ہے، اب قانونِ ایٹلاف ذہنی کی رو سے یہ ممکن ہے کہ مخلوق کو دیکھ کر خالق کی طرف ذہن منتقل ہو جائے، تم یہی کوشش کرتے رہو کہ شے کو دیکھ کر تمہارا خیال شے کے خالق کی طرف جائے، اس طرح تمہیں ہر طرف حق تعالیٰ ہی کا جلوہ نظر آئیگا، اور ایسا تو لوافظہ وجہ اللہ کے معنی کا ابتدائی فہم حاصل ہونے لگے گا۔ شے کی سبھی جہت سے توجہ ہٹ کر جہت حق کی طرف مرکوز ہو جائیگی۔ اور اس طرح یاد قائم ہونے لگیگی، تمہارا معروض فکر اب شے نہیں حق ہوگا، اور ان تمام نوار سے تمہارا قلب معمور ہونے لگیگا جو وجہ الٰہی کی طرف رخ کرنے سے حاصل ہوتے ہیں۔

اس طریقہ سے تمہیں بہت جلد معلوم ہو جائیگا کہ سعادت و مسرت کا سرچشمہ خود ہمارا قلب ہے، حق تعالیٰ کی جلوہ گاہ خود ہمارا قلب ہے، آفاق میں حق تعالیٰ ظاہر ہیں ہر شے کے ساتھ جہت حق موجود ہے، صحیح علم کے استعمال سے دہم اور التباس دور ہوا اور نظر کی اصلاح ہوئی، نقطہ نظر بدلا، معلوم ہوا کہ نفس و آفاق میں حق تعالیٰ نہایت وعیاں ہیں، انہی سے تعلق قائم کرنا، انہی کی یاد کا جمانا تمام مسرتوں اور سعادتوں کا حاصل کرنا ہے، ان سے غفلت اور ذہول اور خلق میں استعراق اور فنا نیت تمام بلاؤں اور آفتوں میں گرفتار ہونا ہے مَن يَعْزِضْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهِ يَسْلُكْهُ عَذَابًا صَعَدًا جُو كُوْنِيْ اپنے رب کی یاد سے منہ موڑتا ہے، چڑھتے عذاب میں ڈال دیا جاتا ہے (روپاء ۱۱)

اسی مفہوم کو رومی کے دل نشین الفاظ میں یاد رکھو :-

گر گریزی بہ امیدِ راحتے ہم از انجا پشت آید آفتے

بیچ کنبے بے ددوبے دام نیست جز بخلوت گاہ حق آرام نیست  
 حق تعالیٰ کو چھوڑ کر خلق میں محویت، خواہ بظاہر وہ کیسی ہی دلفریب اور دل کش نظر  
 کیوں نہ آئے نور کو چھوڑ کر ظلمت میں گرفتار ہونا ہے، اور ظلمت سے ضیق، غم و حزن و  
 خوف کے سوا اور کیا حاصل ہوتا ہے، ظلمت میں چیزیں اپنے صحیح ضد و خال میں کہاں  
 نظر آتی ہیں، کسی شے کا حسن و جمال تاریکی میں کیا دکھائی دے گا! پھر تمہاری نظر میں اشیا  
 کی یہ دلفریب تمہارے نفس کا دھوکہ ہے، التباس ہے، تمہارا واسطہ بھی تو خلاق ہے کیسی  
 کیسی دلربا صورتیں یہ تمہاری خوشی کے لیے پیدا کرتا ہے، ان سے تمہیں بھی لذت حاصل  
 ہوتی ہے، کھوڑی ہی دیر بعد غم کا سا یہ تمہارے قلب پر چھا جاتا ہے، ابھی اعتماد ہوتا ہے  
 ذرا دیر بعد خوف کا زبردست حملہ ہوتا ہے، اور تم کانپ اٹھتے ہو، تمہاری طبیعت میں استقلال  
 نہیں، استحکام نہیں، تمہاری کوئی پناہ گاہ نہیں! اگر تم اپنی غفلت سے جاگ اٹھو، اگر تمہاری  
 چشم بصیرت کھل جائے، اور نور اور صداقت کی دنیا نظر آنے لگے، تو تمہیں اشیا ویسی ہی  
 دکھائی دینے لگیں گی جیسی کہ وہ ہیں، اب تم کو حیاتِ طیبہ نصیب ہوگی۔ طمانیت و بردت سبھی  
 حاصل ہوگی، خوف و حزن زائل ہو جائیگا، استقلال و استحکام عطا ہوگا، اور حق تعالیٰ  
 کے اس وعدہ کا ایفاء ہوگا:

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ وَأُنْشِيَ وَ  
 هُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ۗ  
 يٰۤاٰرْحٰنُ كُوْتَاكُم كَرْنِي، تمہارا رخِ ظلمت سے نور کی طرف پھرنے، مجاہدہ کے راستہ کو آسان  
 کرنے، خلق سے ٹوڑنے اور حق سے جوڑنے میں نیکیوں کی صحبت عجیب و غریب اثر رکھتی ہے، صحبت  
 کا اثر نفسیات کا ایک مسلہ اصول ہے، ہر فرد میں بے سوچے سمجھے ہر قسم کے قضایا کو قبول کرنے

لے و مثل جلیس الصالح كمثل صاحب المسك ان لم يصيبك منه شيء اصابك من ريحه  
 و مثل جلیس السوء كمثل صاحب الكیران لم يصيبك من سواده اصابك من دخانه  
 (ابوداؤد و نسائی عن انس رض)

نیک ہنشین کی مثال مشک والے کی سی ہے اگر تجھے اس سے کچھ نہ ملے تو خوشبو تو ضرور پہنچے گی اور بُرے ہنشین کی مثال لوہار کی  
 جھلی کی سی ہے، اگر اس کی سیاہی تجھ کو نہ لگے تو دھواں تو ضرور پہنچے گا۔



کی استعداد یا صلاحیت پائی جاتی ہے، جب یہ قضایا خود اپنے ذہن کے اندر سے وصول ہوتے ہیں، تو اس کو جدید نفسیات کی اصطلاح میں "خود ایجازی" (AUTO SUGGESTION) کہا جاتا ہے۔ اور جب کسی خارجی ذریعہ سے حاصل ہوں تو "غیر ایجازی" (HETERO-SUGGESTION) کہا جاتا ہے، رات دن ہم خود ایجازی اور غیر ایجازی کے اثر کے تحت خیالات کو قبول کر رہے ہیں، اور ان کو جزو ذہن بنا رہے ہیں، اگر سبلی یا اضلالی افکار غیر ایجازی قوت کی وجہ سے ہمارے قلب میں جگہ پارہے ہیں، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم بری صحبت میں ہیں، اور ان کے تیقنات و افعال کی نقل کر رہے ہیں، اور اضطراری طور پر ان سے متاثر ہو رہے ہیں، ان کے سمی اثرات سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم صحبتِ ناہنس سے قطعی احتراز کریں۔

زاحمقاں بگریز چوں عیسیٰ گر نخت

صحبتِ احمق بسے خونہا بر نخت

سبلی اثرات سے اس طرح بچ کر ایجابی اور ہدایتی علم کے لیے نیکوں کی صحبت کی تلاش کرنی چاہئے، اہل اللہ کی زبان سے حاصل کیا ہوا علم اپنے اندر خاص اثر و قوت رکھتا ہے، وہ قلب کی گہرائیوں تک پہنچ جاتا ہے، یقین و اذعان کی شکل اختیار کر لیتا ہے، علم حق کو شیخ اکبر محی الدین عربیؒ نے "علم ازواق" قرار دیا ہے، اور فرماتے ہیں کہ علم الحق علم الازواق لا عن الازواق وهو العلم الصحیح وَمَا عَدَاهُ فَخَدِثٌ وَتَحْمِیْنٌ لِّیْسَ الْعِلْمُ اَصْلًا یعنی علم حق ذوق و وجدان سے حاصل شدہ علم ہے، محض کتابوں سے حاصل کردہ نہیں، اور یہی علم صحیح ہے، باقی اسکل بچو، مطلق علم نہیں، شاید اس کا مطلب یہ ہے کہ اہل اللہ کا علم قیاسی نہیں، مبدد نبوت سے اخذ کردہ ہے، قطعی و یقینی ہے، حقیقی واقعی ہے، اس کو قبول کرنے اور اس پر عمل کرنے سے حق تعالیٰ خود ان کے معلم ہو گئے ہیں، اور اب وہ براہ راست اسی مبدد سے علم حاصل کرنے لگے ہیں، اِنْفِقُوا اللّٰهَ وَیُعَلِّمَکُمُ اللّٰهَ۔ اس پر دلیل ہے، اسی لیے ایک

لہ اللہ سے ڈرو وہ تمہیں علم دیتے ہیں۔

دوسرے رازداں کی نصیحت ہے کہ خذ العلم بافواہ رجال اللہ، لا من الصحائف الدفاتر  
 مردانِ حق کی زبان سے علم حاصل کرو، کتابوں اور دفتروں سے نہیں، کیونکہ ان کتابوں  
 میں قیاس و تخمین اور ظن و رائے کے سوا کیا رکھا ہے، اہل اللہ کی صحبت خاک کو کھینا کرتی  
 ہے، ان کے افعال و اعمال ان کے افکار و خیالات رفتہ رفتہ قلوب کے زنگ کو دھوتے  
 جاتے ہیں اور تم غیر شعوری طور پر نیکی کی طرف مائل ہوتے جاتے ہو، اور بدی سے مجتنب  
 اور محترز اور بالآخر ظلمت سے نکل کر نور کی طرف تمہارا منہ ہو جاتا ہے، عارفِ روم نے  
 صحبتِ مردانِ حق کے اثرات کو یوں بیان فرمایا ہے۔

خواہی کہ دریں زمانہ فردے گردی یا ورہ دیں صاحبِ دردے گردی

اس را بجز از صحبتِ مردانِ مطلب مرے گردی چو گردِ مردے گردی

یہ کو تو امع الصّادِ قین کے حکم کے پنہاں فائدوں کی اجمالی توضیح ہے۔

سیرت سازی کے قرآنی اصول کی اوپر جو توضیح پیش کی گئی، اس کو اجمالاً ایک دفعہ

پھر دہرایجے اذا تکرر تقرر، تکرار سے چیزیں زیادہ دلنشین ہوتی ہیں، سیرت کی عمارت کا

سنگ زاویہ لا الہ الا اللہ پر نچتہ یقین و اذعان ہے، تمام انبیاء کا اپنی قوم کو یہی پیغام تھا

کہ یا قوم اعبدوا اللہ ما لکم من الاغیوہ، اے قوم اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا

تمہارا کوئی معبود و رب نہیں، اللہ ہی لائقِ عبادت ہیں استعانت انہی سے کی جانی چاہیے

میرا سر انہی کے سامنے جھک سکتا ہے، غیر کے سامنے نہیں اس بنیادی عقیدہ کا زبان

سے اظہار اور قلب سے اقرار ضروری ہے، زبان سے بار بار کی تکرار یقین کو نچتہ کرتی ہے

جس قدر یقین میں نچنگی ہوگی اسی قدر عمل میں سہولت ہوگی، یقین میں شدت پیدا کرنے کے لیے

غور و فکر، تدبیر و مراقبہ ضروری ہیں، یقین اس شدت کا پیدا ہو جائے کہ شک و شبہ کی

مطلقاً گنجائش نہ رہے، تم جانتے ہو کہ آگ میں ہاتھ ڈالنے سے تمہارا ہاتھ جل جائیگا اسی

طرح تمہیں توحید فی المعبودیت و توحید فی الربوبیت کا یقین ہو جانا چاہیے، ذلت (جو عبادت

کی اصل ہے، حق تعالیٰ ہی کے سامنے اس کا ظہور ہو سکتا ہے، جو ہمارے مالک ہیں حاکم ہیں، مولیٰ ہیں، خالق ہیں، رب ہیں، وکیل و نصیر ہیں، حق تعالیٰ ہی نافع و ضار ہیں، معزز و مذلل ہیں، حاجت و مراد سوا ان کے کوئی پوری نہیں کر سکتا، اسی لیے انہی کے سامنے دستِ سوال دراز ہو سکتا ہے، کسی اور کے سامنے ہرگز نہیں، زبان پر یہ دعا جاری رہے اور قلب میں اس کا مفہوم متکمن۔

اللَّهُمَّ كَمَا صَنَعْتَ وَجُوهَنَا تَسْجُدُ إِلَيْهِ مِنْ كُلِّ جَانِبٍ لِيُغْفِرَ لَنَا

لِغَيْرِكَ فَصْنَعْنَا أَيْدِيَنَا تَمْتَدُّ كَرْنًا مِنْ بَعْضِهَا إِلَى طَرَفِهَا لِيُغْفِرَ لَنَا

بِالسُّؤَالِ لِغَيْرِكَ - غیر کے آگے سوال کرنے سے بچائے رکھو۔

اس عقیدہ اور یقین کا شخص اپنے ہم جنسوں کے آگے کیسے خود کو ذلیل کر سکتا ہے، اس کی سیرت غلاموں کی سی کیسے ہو سکتی ہے، وہ نفع و ضرر کی توقع غیر اللہ سے کب رکھ سکتا ہے، اور اپنی عزت اس وہی نفع و نقصان کی خاطر کیسے بیچ سکتا ہے، مجاہد اسی یقین اساسی کو بچتے کرتا ہے، اس کا طریقہ یہ ہے کہ خواطر کی نگہبانی کی جائے، سلبی اور اضلالی علم کو ایجابی و ہدایتی علم سے بدلا جائے قانون تقطیب افکار (Law of the Polarisation of thought) نقیات کا ایک مسئلہ قانون ہے، اسی قانون کے استعمال سے اضلالی علم ہدایتی علم میں تبدیل کیا جاتا ہے، نہ صرف یہ بلکہ ایجابی خیالات ہدایتی افکار کو ذہن میں ہمیشہ جلنے کی کوشش کرنی چاہیے، اور سب سے زیادہ ایجابی خیال حق تعالیٰ کا خیال ہے، جب یہ قلب پر چھا جاتا ہے، تو قلب تمام ظلمتوں سے پاک ہو جاتا ہے، نورانی ہو جاتا ہے، نور ہو جاتا ہے، اللہم اجعل فی نفسی نوراً اللہم اجعلنی نوراً کی دعا قبول ہو جاتی ہے۔ اس کا نتیجہ سرور و طمانیت ہے، مسرت و سعادت ہے جو پاک سیرت کی لازمی خصوصیت ہے، نیک سیرت شخص سرور و مطمئن ہوتا ہے، اس کی جان اس کا تن راحت میں ہوتا ہے، وہ قطرہ نور ہوتا ہے، یہ روحانی مسرت ہے، جو طبعی غم و حزن میں باقی رہ سکتی ہے۔ اَلَا إِنَّ أَوْلِيَاءَ اللَّهِ لَأَخْوَفُ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا وَكَانُوا

يَتَّقُونَ لَهُمُ الْبُشْرَى فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ لَا تَبْدِيلَ لِكَلِمَاتِ اللَّهِ ذَلِكَ هُوَ  
الْفَوْزُ الْعَظِيمُ - (پ ۱۱۶)

## قوة ایمانیہ و ظہور غیب

چشم بگذاشته ازین محوسها یافتہ از غیب بینی بوسها

خود نمی یابم یکے گوشے کہ من نکتہ گویم ازان چشم حسن

دلوں ہم اس خیال میں رہتے ہیں کہ ہمیں "صداقت" کا علم ہے، لیکن یہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا، کہ کیوں صداقت کے وہ آثار ہماری زندگی میں نمایاں نہیں ہوتے جن کو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے الفوز فی القضا امور تکوینی میں کامیابی و کامرانی نزل الشهداء، ایسی اعلیٰ قسم کی میزبانی جیسی کہ شہیدوں کی جنت میں ہوگی، عیش السعداء، سعیدوں کا ساعیش، النصر علی الاعداء، دشمنوں پر فتح کے الفاظ سے تعبیر فرمایا ہے؛ کیوں رحمت کے وہ آثار ظاہر نہیں آتے، جن سے ہماری دل کو ہدایت ہو (تھدی بھا قلبی) ہمارے کاموں میں جمعیت ہو (تجمع بھا امری) ہماری ابتری دور ہو، اور ہماری ساری پریشانیوں سلجھ جائیں (تلم بھا شغتی) ہمارا دین سنور جائے (تصل بھا دینی) ہمارا فرض ادا ہو جائے (تقضى بھا دینی) ہماری نظر سے غائب چیزوں کی نگہبانی ہو (تحفظ بھا غائبی) ہمارے پیش نظر چیزوں کو بلندی عطا ہو (ترفع بھا شأھدی) ہمارا چہرہ نورانی ہو جائے (تبیض بھا وجھی) ہمارا عمل پاکیزہ ہو جائے (تزکی بھا عملی) رشد و ہدایت کا ہمارے قلب میں الھام ہو (تھمنی بھا رشدی) حق تعالیٰ کے ساتھ ہمارے فطری جذبات الفت از سر نو پیدا ہو جائیں (تجدد بھا الفتی) اور ہر برائی سے بچے رہیں (تعصمی بھا من کل سوء)

شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارا علم یقین صادق کے درجہ کا نہیں، یا پختہ یقین نہیں، اور وہ ایمان ہمیں حاصل نہیں جو ہمارے دل میں پیوست ہو گیا ہو، جس کے مانگنے کی ہدایت ان الفاظ میں

کی گئی ہے :-

اللَّهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ إِيْمَانًا يَبْأَشْرُقِلْبِي لِي أَعْلَمَ فِي سَبْعَةِ نَحْمٍ مِنْهُ مَا نَكَلْتَهُمْ بِيَوْمِ رِيءِ دَلِّ

وَيَقِيْنًا صَادِقًا اَلْحَقِّ فِي سَبْعَةِ نَحْمٍ مِنْهُ مَا نَكَلْتَهُمْ بِيَوْمِ رِيءِ دَلِّ

ہمیں علم یقین کی وہ کیفیت حاصل نہیں جس کے پیدا ہو جانے کے بعد حضرت مسیح کے الفاظ میں حریتِ تامہ حاصل ہو جاتی ہے!

ہم میں سے اکثر ایک ایسے سادہ طریقہ کی تلاش میں اپنی مختصر زندگی کے دن گزار دیتے ہیں، جس کا حصول اور جس پر مداومت ہمیں ایمان کے ان آثار و برکات سے مالا مال کرے، جن کا ادھر ذکر ہوا، ہمیں ایک ایسی چیز کی تمنا ہے، جو ایمان کو ہائے قلوب میں پیوست کرے، وہ پختہ یقین عطا کرے جس سے ایک بڑی تعداد محروم ہے، اور جس کے حاصل ہو جانے کے بعد ہماری ساری پریشانیوں سلجھ جائیں، ہمارا چہرہ نورانی ہو جائے اور ہمارا عمل پاکیزہ ہو جائے، اور تمام امور میں کامرانی و کامیابی نصیب ہو!

یقیناً ایک ایسا سادہ طریقہ موجود ہے، اور وہ اتنا سادہ اور سیدھا طریقہ ہے کہ اکثر تو اس کو جان کر بھی اس پر عمل کرنا نہیں چاہتے! بعض کا تو یہ عقیدہ ہے کہ زندگی میں پریشانیوں سے نجات اور جمعیتِ خاطر کا حصول ناممکن ہے! ان کا خیال ہے کہ -

’آدم‘ از کثرتِ پریشانی می کند جستجوئے جمعیت

آدم آمد سے حرف و ہر سے جدا نشود جمع تا دمِ میت

بعض کا خیال ہے کہ یہ طریقہ پایا تو جاتا ہے، لیکن وہ ایک رازِ نہفتہ ہے، اس تک ان کی رسائی ممکن نہیں، وہ لازماً سینہ ہے، سفینہ پر نہیں ملتا، اور اس راز کے جاننے والے کا معدوم ہیں، بعض سمجھتے ہیں کہ یہ طریقہ سخت مشکل ہے، اس پر عمل ناممکن ہے! یہ شخص کے بس کی چیز نہیں، الفاظ یا تعبیرات کی کثرت نے اس کو چھپا رکھا ہے اور دلائل کی کثرت نے اس کا ادراک مشکل کر دیا ہے۔

از دلائل می شود مشکل بما ادراکِ حق !! ایں رہ از بسیاری سنگِ نشاں ہموار نیست!



حقیقت یہ ہے کہ یہ طریقہ موجود ہے اور وہ اتنا سادہ ہے کہ بچے بھی اس کو سمجھ سکتے ہیں، بوڑھی خواتین بھی سمجھ سکتی ہیں! الہامی صداقتوں کو سمجھنے کے لیے ہمیں بچوں کی طرح سلیم فطرت بن جانا چاہیے، اسی وقت ہم میں وہ شعور پیدا ہوتا ہے، جس کی بیداری کے بعد ہمیں کامل حریت نصیب ہوتی ہے! یہ طریقہ مختصر الفاظ میں یہ ہے۔

۱۔ ہمیں حق تعالیٰ کی ان ظاہری و باطنی نعمتوں اور عنایتوں کو یاد کرنا چاہیے، جو ہماری پچھلی زندگی میں ہم پر کی گئیں اور ان پر حق تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیے  
۲۔ ہمیں حق تعالیٰ کی ان آئندہ نعمتوں اور عنایتوں کا شکر ادا کرنا چاہیے جن کا ابھی ظہور نہیں ہوا ہے!

اس اجمال کی تفصیل ضروری ہے :-

۱۔ ایمان ان اشیاء کا جوہر ہے جن کی ہم حق تعالیٰ سے اُمید رکھتے ہیں، اور ان اشیاء کے وجود پر گواہی ہے جن کا ابھی ظہور نہیں ہوا ہے، حق تعالیٰ پر ایمان، ان سے حُسن ظن، ان سے اُنس و محبت مومن کا طرہ امتیاز ہے: **لَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ** اس ایمان حُسن ظن، اُنس و محبت ہی سے وہ تمام نعمتیں جو ابھی پردہ غیب میں ہیں، خارج میں ظاہر ہوتی ہیں، یہ وہ پل ہیں جن سے گزر کر حق تعالیٰ کی نعمتیں مومن تک پہنچتی ہیں، اس راز کو عارفِ روحی بے یوں فاش کیا ہے :-

اَنْ كَمْ شَدَّ اُنْسُ بَشَاہِ فِرْدَوْشِ یَا فِت دَر مَانَكْ جَمَلِ دَر دِوْشِ

ایمان اور اُنس مسلسل شکر و حمد سے قوی ہوتا ہے، جب ہمارے قلب میں ان نعمتوں، راحتوں، عنایتوں اور احسانوں کا احساس موجود ہوتا ہے، جو حق تعالیٰ نے ہم پر ہماری پچھلی زندگی میں کی ہیں، ہم اس احساس کو تازہ کر کے ان نعمتوں کی جزئیات و تفصیلات پر نظر کر کے چیخ مٹھتے ہیں:

بے لطف تو من قرار نتوانم کرد احسان ترا شمار نتوانم کرد

گر برتن من زباں شود ہر محئے یک شکر تو از ہزار نتوانم کرد

(ابوسعید منہ)

جائے پھلی زندگی کی مصیبتوں اور بلاؤں پر شعور کو مرکوز کرنے کے ہیں یاد کرنا چاہیے کہ کس طرح حق تعالیٰ نے پھلے زمانہ میں ہمیں خوف و حزن سے نجات بخشی، غم و مصیبت سے آزادی مرحمت فرمائی، مرض و الم سے شفا عطا کی! ہمیں ان موقعوں کو یاد کرنا چاہیے، جن میں حق تعالیٰ کی کارسائی و بندہ نوازی نے ہماری جان کو آرام بخشا اور ضیق و پریشانی سے نجات دی، غم و مصیبت کی بے پناہ قوتوں نے ہمارے ضعیف جسم کو تباہ کرنا چاہا تھا، اور شرکی تباہ کن طاقتوں نے ہماری روح کے شیرازہ کو منتشر کرنا چاہا تھا لیکن حق تعالیٰ کے کرم نے ہماری حفاظت کی، ان کے احسان نے ہمیں تباہی سے بچالیا!

کجالبِ صدف و شکر ابرنیان ست! کما از شمار بروں قطره ہائے باران ست! (نظم)  
 ہاں ہم اپنے احسان مند قلب کی گہرائیوں سے حق تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہوئے اعتراف کرتے ہیں کہ یہ سب کام اللہ تعالیٰ ہی کے تھے، ہماری حول و قوت کو اس میں کچھ دخل نہ تھا، اَلْحَوْلُ وَ الْوَلَاةُ قُوَّةُ اِلٰہِ بِاللّٰہِ! جب ہم شکست خوردہ دل موختہ تھے ان کی ربوبیت نے ہماری دستگیری فرمائی جب ہم برگشتہ و پریشان تھے ان کی رحمت نے ہمیں راہ دکھائی! جب ہم غلط راہ پر پڑے تھے، ان کی حکمت نے ہدایت کی طرف ہماری رہبری کی، جب ہم غم و مصیبت، خوف و حزن میں مبتلا تھے، اُن کے فضل عمیم نے ہمیں سنبھالا!

اے خدا قربانِ احسانت شوم! ایں چہ احسان است قربانت شوم!

اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ كَمَا يَذْبَعُ لِحِجَابِ لِحْجَابِ وَ جِهَكَ وَ عَظِيْمَ سُلْطٰنَكَ!

ہر روز کچھ دیر کے لیے ہمیں اپنی گزشتہ زندگی کے ان تجربوں کو تازہ کرنا چاہیے، جب کہ حق تعالیٰ نے ہماری خاص طور پر مدد فرمائی، اور ہمارے لیے نجات کا سامان فراہم کیا، ہم میں سے ہر ایک کی زندگی میں ایسے تجربات و واقعات ضرور گزرے ہیں جن کی یاد ہم تازہ کر سکتے ہیں، ہمیں انہیں یاد کرنا چاہیے ان پر حق تعالیٰ کا بہت بہت شکر ادا کرنا چاہیے! عارف حق شناس ہوتا ہے، غیر عارف ناسپاس!

عارف اُن باشد کہ باشد حق شناس ہر کہ عارف نیست گرد ناسپاس (عطار)

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے حق تعالیٰ کے احسانات کا یوں شکر ادا کیا ہے :-

اللَّهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ بِمَا هَدَيْتَنَا تیرے ہی لیے حمد ہے اس پر کہ تو نے ہمیں ہدایت دی اور  
 وَلَكَ الْحَمْدُ بِمَا أَكْرَمْتَنَا وَلَكَ تیرے ہی لیے حمد ہے اس پر کہ تو نے ہمیں عزت دی اور تیرے  
 الْحَمْدُ بِمَا سَتَرْتَنَا وَلَكَ الْحَمْدُ ہی لیے حمد ہے کہ تو نے ہماری ستر پوشی کی، اور تیرے ہی لیے  
 بِالْقُرْآنِ وَلَكَ الْحَمْدُ بِالْأَهْلِ حمد ہے قرآن پر اور تیرے ہی لیے حمد اہل و مال پر اور تیرے ہی  
 وَالْمَالِ وَلَكَ الْحَمْدُ بِالْمَعَاوَةِ لیے حمد ہے درگزر کرنے پر، اور تیرے ہی لیے حمد ہے یہاں  
 وَلَكَ الْحَمْدُ حَتَّى تَرْضَى وَ تیک کہ تو خوش ہو جائے، اور تیرے ہی لیے حمد ہے جب  
 لَكَ الْحَمْدُ إِذَا رَضَيْتَ کہ تو خوش ہو جائے اے وہ جس کی ذات سے ڈرنا چاہیے  
 يَا أَهْلَ التَّقْوَى وَ أَهْلَ (ڈرنے کے قابل بس تیری ہی ایک ذات ہی اے وہ کہ تو  
 الْمَغْفِرَةَ ! ہی معفرت کر سکتا ہے -

ان ہی انعامات پر جو ہماری پھلی زندگی میں حق تعالیٰ نے ہم پر کیے ہیں ہمیں حق تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیے -

نحمد الله خالق الاشياء نشكر الله رازق الاحياء (مظہر الحق)  
 یاد رکھو ایسا کرنے سے ہمارا ایمان مضبوط ہوتا ہے، ہمارا قلب یقین کے نور سے لبریز ہو جاتا ہے  
 اور ہم حق الیقین کے طور پر جاننے لگتے ہیں کہ حق تعالیٰ ہر حال میں ہمارے لیے کافی ہیں، ہمارے  
 قلب کی گہرائیوں سے یہ صیغہ نکلتی ہے -

الله الكافي، كافي! قصدت الكافي وجدت الكافي

لکل كافي كافي كفاني الكافي ونعم الكافي والله الحمد!

ہمارا خوف دور ہو جاتا ہے، امیدیں جاگ اٹھتی ہیں، نور یقین ہمارے قلب کی تاریکی کو دور کرتا  
 ہے اور ہم حق تعالیٰ کے قرب و معیت کی روشنی میں داخل ہو جاتے ہیں، اور ہمیں وہ شاندار آزادی  
 حاصل ہوتی ہے جو مقربین بارگاہ الہی کا حصہ ہے، وہ فرحت و سرور نصیب ہوتا ہے جس کو عیش السعداء

سے تعبیر کیا گیا ہے! اور اسی سرور کی حالت میں ہم بیدل کی زبان میں گنگنا نے لگتے ہیں:

تا مزرع ہزار آسماں خواہد بود      تا خرمی بارغ جہاں خواہد بود

ہر تخم کہ ریشہ بروں خواہد بود      شکرِ کریم ترا زباں خواہد بود

حق تعالیٰ کے ان گزشتہ احسانات کا حمد و شکر کے ساتھ یاد کرنا وہ طریقہ ہے جس کو ہر زمانہ

کے صلحاء و صدیقین نے اپنے ایمان کی قوت کے ازدیاد کے لیے ہمیشہ استعمال کیا ہے، اور اس

حد تک کیا ہے کہ اُن سے عجیب و غریب کرامات و خوارق عادات کا ظہور ہوا ہے، ان کی کامیابی

کا یہی ایک راز تھا، اسی طریقہ نے قوتِ الہیہ کے دروازوں کو ان پر کھول دیا تھا، ان کو حق

تعالیٰ کے قریب کر دیا تھا، اور حق تعالیٰ کو اُن سے قریب، اس کی وجہ سے اُن کے لیے ایسی

چیزیں ممکن ہو گئی تھیں جو عام طور پر انسان کے لیے ممکن نہیں ہوتی۔

دیکھو جب حضرت دانیال علیہ السلام کو بخت نصر نے ایک اندھے کنویں میں ڈوئشروں

کے ساتھ قید کر دیا تھا تو انہوں نے کہا جاتا ہے کہ یہ دعا کی تھی:-

الحمد لله الذي لا يجيب من دعاء      حمد اس خدا کی ہر جو اپنے مانگنے والے کو محروم نہیں

والحمد لله الذي لا يكل من توكل      کرتا، حمد اس خدا کی ہر جو اس شخص سے نہیں ٹھکتا

عليه الحمد لله الذي هو نقتنا حين      جو اس پر بھروسہ کرے، حمد اس خدا کی ہر جو ہمارا آسرا

تنقطع عنا الحيل الحمد لله الذي      ہر جب ہماری تدبیریں منقطع ہو جاتی ہیں، حمد اس خدا

هو رجائنا حين يسود قلوبنا باعمالنا      کی ہر جو ہماری تکلیف کے وقت ہماری مصیبت کو دو

الحمد لله الذي يكشف ضرابنا عند      کرتا، حمد اس خدا کی ہر جو احسان کا بدلہ احسان سے

كربتنا، الحمد لله الذي يجزي      دیتا ہے، حمد اس خدا کی ہر جو صبر کا بدلہ نجات و

بالاحسان احساناً، الحمد لله الذي      رستگاری سے دیتا ہے!

يجزي بالصبر نجاتاً، (رواه ابن ابی الدنيا وسندہ حسن)

یہ ساری دعائیں تعالیٰ کی حمد و ثناء سے بھری ہوئی ہیں، اس کا ہر جملہ ان تجربوں کو حافظہ میں تازہ کرتا ہے

جب کہ حق تعالیٰ کی خاص تائید ہمیں ہوئی تھی اور طوفانِ حوادث سے ہماری کشتی نکل آئی تھی اور ہماری زبان سے بے اختیار یہ جملے نکلے تھے۔

اللَّهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ شُكْرًا وَلَكَ  
الْمِنَّةُ فَضْلًا أَنْتَ رَبُّنَا حَقًّا  
وَمِنْ عِبِيدِكَ رَفِئًا -  
ہر اور ہم تیرے بندے ہیں، ناتوان و محتاج۔

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کے مقابلہ کو چلے اور جب حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خین کی لڑائی کے لیے نکلے، تو ان کی زبان پر حق تعالیٰ کی حمد و ثنا ہی جاری تھی۔

كُنْتَ وَتَكُونُ وَأَنْتَ حَقٌّ لَا يَمُوتُ  
تَتَامُ الْعَيُونُ وَتَكَرَّرُ الْجُؤْمُ وَأَنْتَ  
حَقٌّ قَيُّومٌ لَا تَأْخُذُكَ سِنَةٌ وَلَا  
نَوْمٌ يَا حَيُّ يَا قَيُّومُ!  
تو ہے اور رہیگا، تو ایسا زندہ ہے جس کو موت نہیں!  
آنکھیں سوتی ہیں اور تائے بدلنے نہیں، تو زندہ اور  
زندہ رکھنے والا ہے، تجھ کو اونگھ اور نیند نہیں چھو سکتی!  
یا حییٰ یا قیوم!

یاد رکھو کہ حق تعالیٰ کی رحمت و رافت جو ہماری کھلی زندگی میں ہمارے ساتھ رہی، وہ اب بھی ہم پر محیط رہی، وہی قوت جو گزشتہ زمانہ میں ہماری دستگیری کرتی رہی ہے، اب بھی ہماری مدد کر رہی ہے، وہی فضل عمیم جس نے اب تک ہمیں سنبھالا ہے، اب بھی ہمیں سنبھال رہا ہے۔

حق تعالیٰ اب بھی وہی ہیں، ان میں تغیر نہیں، وہ تغیر سے منزہ و ماوراء ہیں، یہ امر واقعی کہ انہوں نے ہمیں گزشتہ زندگی میں بلا و غم سے نجات دی ہے، اس بات کا قطعی ثبوت ہے کہ وہ اپنے ہی عدم تغیر و عدم تنفر کی وجہ سے، میں ہرگز فراموش نہ کریں گے!

سعدیؒ اسی طریقہ کو جو ہم یہاں پیش کر رہے ہیں، اصولاً استعمال کرتے ہوئے حق تعالیٰ کے گزشتہ احسانات کو یاد دلاتے ہوئے فرماتے ہیں :-

فراموش نہ کر دایزد در آن حال کہ بودی نطفہ مدفون و مدہوش  
روانت داد عقل و طبع و ادراک جمال و حسن و دلئے و فکر و دہوش



وہ انگشتت مرتب کر دہر کفن دو بازویت مرتب ساخت بردوش!

کنوں پنداری اے ناچیز نہمت کہ خواہد گردنت رونے فراموش!

خوب سمجھ لو کہ صداقت جس وقت تک کہ وہ محض ایک ذہنی نقل بنی رہتی ہے ہماری مدد کرنے سے قاصر ہوتی ہے، لیکن جب ہمیں اس کا تحقق ہوتا ہے وہ ایک ہمہ توان قوت بن جاتی ہے، اب اہم بات جاننے کی یہ رہ جاتی ہے کہ صداقت کا تحقق کس طرح ہوتا ہے؟ یاد رکھو کہ جب ہم یہ یاد کرتے ہیں کہ ہماری پچھلی زندگی میں حق تعالیٰ نے ہم پر کیا کیا احسانات کیے ہیں، تو ہم اس صداقت کے تحقق کے قابل ہوتے ہیں کہ حق تعالیٰ نے جو کچھ اس کے پہلے کیا ہے وہ اب بھی کر سکتے ہیں، معاذ اللہ حق کے ہاتھ کمزور نہیں ہو گئے ہیں کہ وہ ہماری حفاظت نہ کر سکیں اور ہمیں بچانہ سکیں، اور نہ معاذ اللہ وہ ہرے ہی میں کہ سن نہ سکیں، وہ سمیع و بصیر، وہ علیم و قدیر ہیں، وہ ہر طرح کافی ہیں: اَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدًا؟ كَفَىٰ بِاللّٰهِ وَلِيًّا وَكَفَىٰ بِاللّٰهِ نَصِيرًا اگر ہم حق تعالیٰ کے ان احسانات کو یاد کرتے رہیں، جو پچھلی زندگی میں ہم پر بارش کی طرح نازل ہوتے رہے ہیں تو ہمیں شدت سے اس امر کا احساس ہوتا ہے کہ ہم حق تعالیٰ کا شکر ادا کریں ان کے جملہ احسانوں کا، جملہ عنایتوں اور کمروں کا، نعمتوں اور راحوں کا، اب ہمیں ایسا کرنا چاہیے، اور خوب خوب کرنا چاہیے! وحی غیر متلو کے الفاظ میں ہیں کہنا چاہیے:

اللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ كَالَّذِي تَقُولُ، وَ

خَيْرًا مِّمَّا تَقُولُ، اللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ

كُلُّهُ، وَلَكَ الشُّكْرُ كُلُّهُ، وَلَكَ لِلْمَلِكِ

كُلُّهُ، وَلَكَ الْخَلْقُ كُلُّهُ، بِبَيْدِكَ

الْخَيْرُ كُلُّهُ، إِلَيْكَ يَرْجِعُ الْأَمْرُ

كُلُّهُ!

اللّٰهُمَّ اللَّهُ الَّذِي كَفَانِي وَأَوَانِي وَ

سب تعریف اس اللہ کی ہے جو مجھ کو کافی ہوا اور جس نے

اطعمنی وسقانی والذی من علیٰ  
 و افضل والذی اعطانی فاجزل  
 فضل کیا، اور مجھ کو مال و دولت دی اور بہت دی،  
 الحمد لله علیٰ کل حال - ہر حال میں اللہ کا شکر ہے۔

اللهم لك الحمد كما ينبغي لجلال  
 وجهك وعظيم سلطانك - بزرگی اور تیری بڑی بادشاہت کے سزاوار ہو!

اس طرح حمد و شکر ادا کرنے سے، تسبیح و تقدیس سے ہم میں ایک اعلیٰ شعور پیدا ہوتا ہے، ایک  
 پختہ یقین، باطنی وقوف، براہ راست وجدان پیدا ہوتا ہے، جو عقلی علم یا تعقل سے ماوراء ہوتا ہے،  
 اس کی کیفیت کالفاظ میں ادا کرنا ممکن نہیں، ہمیں اس امر کا تحقق ہو جانا ہے کہ جو کچھ بھی حق تعالیٰ  
 نے اب تک کیا ہے وہ اب بھی کر سکتے ہیں۔

”إِنَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ وَبِالْجِبَابِ تَجَدِيرٌ نَعْمَ الْوَلِيُّ وَنَعْمَ النَّصِيرُ!“

۲۔ اب ہمیں جو کام کرنا ہے وہ یہ ہے کہ ہم حق تعالیٰ کا جو زمین و آسمان کے خالق ہیں، جن کے  
 ہاتھ میں سب کی بھلائی ہے، اور جن کی طرف سب امور رجوع ہوتے ہیں، ان نعمتوں کے لیے  
 شکر ادا کریں، جن کی ہمیں اب حاجت یا ضرورت ہے، ہمیں اس پر ایمان ہے، ہمیں اس امر کا تحقق  
 حاصل ہے کہ حق تعالیٰ ہر دشوار کو آسان کر سکتے ہیں، ان کے لیے ہر دشواری کو آسان کر دینا آسان  
 ہے، ان تیسیر کل عسیر علیک تیسیر کھلی زندگی میں حق تعالیٰ نے ایسا کیا ہے اور اب بھی وہ کر سکتے  
 ہیں، قطعاً کر سکتے ہیں، اس لیے ہم ان کا شکر ادا کر رہے ہیں کہ انہوں نے ہماری دعائیں لی، اس  
 نعمت کا ظہور جس کی ہمیں حاجت ہے پردہ غیب سے قطعاً ہو رہا ہے، اور غیب میں تو وہ ظاہر ہو چکی، ہماری  
 مراد وہاں ہمیں مل چکی، ہمارا ایمان اس لامتناہی قوت پر ہے جس کے لیے ہر دشوار آسان ہے، جس کے لیے  
 ہر ناممکن ممکن ہے، اور ہم ان چیزوں کا جو ظاہر نہیں ہوئیں اس طرح ذکر کرتے ہیں گویا کہ وہ ظاہر ہو چکیں،  
 یہی تاکید ہے ہمارے محبوب و مطاع صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی۔

أدعوا للہ وانتم موقنون بالاجابة تم دعا مانگو، اور تم کو اس کے قبول ہونے کا یقین ہو۔

حق تعالیٰ کا ایک نام مجیب بھی تو ہے، یعنی دعا اور سوال قبول کرنے والے، ان کا ارشاد ہے:

مَجِدُّكَ لَكَوْجِي اَسْتَجِبْ لَكُمْ

مجھ کو پکارو میں تمہاری دعا قبول کر لوں گا۔

اَجِبْ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا

جب کوئی مجھے پکارتا ہے، تو میں پکارنے والے کی بات

دَعَاكَ

کا جواب دیتا ہوں۔

مَنْ يَدْعُونِي فَاسْتَجِبْ لَهُ

کوئی مجھ سے دعا کرتا ہے کہ میں اس کی دعا قبول کروں

مَا مِنْ مُسْلِمٍ يَدْعُو بَدْعَاءِ

جو مسلمان کوئی دعا کرتا ہے، تو اس کی دعا قبول

الَّا اسْتَجِبْ لَهُ

ہوتی ہے۔

یہ اور اس طرح کی اور یقین آفرینیوں کے بعد اور خود اپنے ذاتی تجربہ کے بعد ہم دعا کے ساتھ ہی اجابت

کی قبولیت کے یقین کے ساتھ حق تعالیٰ کا اس نعمت پر شکر ادا کرتے ہیں جس کی ہمیں حاجت ہے

اور یقین رکھتے ہیں کہ نعمت ہمیں حاصل ہو چکی ہے، گو کہ ابھی پردہ غیب سے اس کا ظہور نہیں ہوا ہے۔

بات یہ ہے کہ عام آدمی چاہتا ہے کہ حق تعالیٰ کا شکر ادا کرنے سے پہلے نعمت کا ظہور ہو چکا ہو وہ

ظہور نعمت کے بعد شکر ادا کرتا ہے، اور یہی وجہ ہے کہ اس کی دعا اکثر موثر نہیں ہوتی، جو شخص نعم

مالی کے لیے ہمیشہ دعا کرتا رہتا ہے اور حق تعالیٰ کا محض اس وجہ سے شکر ادا نہیں کرنا چاہتا کہ ابھی

اس کی دعا کی قبولیت کے آثار و نتائج نہیں پیدا ہوئے ہیں، وہ ایمان کامل کی دولت سے محروم

ہے، شکر گزار (شکار) ذاکر (ذکار) و مطیع و فرمانبردار، روح حق تعالیٰ کی نعمتوں اور عنایتوں کو اپنی

طرف جذب کرتی ہے، تحمید و تسبیح ہم میں وہی شعور پیدا کرتی ہے جو ہم میں اس وقت خود بخود پیدا

ہوتا، جب ہماری دعا قبول ہو چکی ہوتی!

ہم اپنا رخ اس ذات کی طرف کیے ہوئے ہیں، جو فاطرِ سماوات و ارض ہے، اس کے ثنا

خواں ہیں، اس کی نعمتوں کا شکر ادا کر رہے ہیں، عرض کر رہے ہیں کہ حق تعالیٰ آپ خیر محض ہیں، رحمت

مطلق ہیں، فکرِ تام ہیں، کمالِ مطلق ہیں، محسن ہیں، مکرّم و منعم ہیں، مفضل ہیں، واپس ہیں، نافع، حمن و

رحیم ہیں، مجیب ہیں، آپ ہمارے حالات میں کمال الٰہی تطابق پیدا کر رہے ہیں، یہ تطابق ہمارے

تخیل، ہمارے منصوبوں سے کہیں زیادہ کامل ہے، ہم نے اپنی جانیں آپ کے سپرد کر دی ہیں اور اپنا منہ آپ کی طرف کیا ہے، اور اپنا کام آپ کو سونپ دیا ہے۔ (لا ملجاء ولا منجاء الا الیک!) اس دعا و ثنا کے نتیجہ کے طور پر ہمارے شعور میں ایک انقلاب پیدا ہوتا ہے، تاریکی دور ہو جاتی ہے اور قلب کی فضا نورانی ہو جاتی ہے، قلب مسرت سے بھر جاتا ہے، اطمینان، سکینہ، وقار، سرور کا مبداء فیاض کی جانب سے مسلسل فیضان ہونے لگتا ہے، باطن انوار و کیفیتِ محبت سے لبریز ہو جاتا ہے، ہم جان لیتے ہیں کہ اب ہم حصارِ سلامتی میں ہیں، اور ہماری عاقلیہ عالمِ قدس میں پہنچ چکی ہیں، اب جو کچھ ہوگا، وہ خیر ہوگا! گو ابھی خارج میں کوئی تغیر نہیں ہوا ہے، معاملات ویسے ہی نازک ہیں لیکن ہمارا باطن یقین و مسرت سے پُر ہو جاتا ہے، اسی لیے کہا گیا ہے کہ ایمان ان اشیاء کے وجود پر گواہی ہے، جن کا ابھی ظہور نہیں ہوا ہے، ایمان ان اشیاء کی حقیقت یا جوہر ہے، جن کی ہم حق تعالیٰ سے توقع کرتے ہیں۔

اس یقین و مسرت و سکینت کی وجہ سے ہم پھر حق تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں، ان کی حمد و ثنا کرتے ہیں، تسبیح و تقدیس میں مصروف ہو جاتے ہیں، اس نعمت کے لیے اس بخشش و فضل کے لیے جس کا ابھی ظہور نہیں ہوا ہے اور جس کا وقوع ابھی قریب نظر نہیں آتا، ممکن ہے کہ اس کا کچھ عرصہ کے لیے ظہور نہ ہو، وقوع نہ ہو، لیکن یہی عدم ظہور و عدم وقوع ہمیں اپنی قوتِ ایمانی سے کام لینے کا موقع عطا کرتا ہے کہ ہم اس یا "پسندیدہ" کے حمد و ثنا میں مشغول و مصروف رہیں، جس کے ہاتھوں میں سب کی بھلائی ہے، اور ہر چیز کا پورا اختیار ہے، فَسُبْحَانَ الَّذِي بِيَدِهِ مَلَكُوتُ كُلِّ شَيْءٍ وَالْيَمِينُ رَجَعُونَ!

جامی از یارِ پسندیدہ مبریدہ جاشا

کاں پسندیدہ جز کارِ پسندی نکنڈ!

ہم شکر ادا کرتے ہیں، حمد و ثنا کرتے ہیں، اس نعمت پر بھی جس کا ابھی ظہور نہیں ہوا ہے، لیکن جس کے متعلق ہمارا ایمان ہمیں یقین دلاتا ہے کہ یہ نعمت حق تعالیٰ نے ہمیں عطا کر دی ہے، اور وہ

ظاہر ہونے والی ہے، کہا جاتا ہے کہ جب بارش کی دعل کے لیے لوگ جمع ہونے لگے، تو ایک بچی اپنی چھتری ساتھ لیے دعا میں شریک ہونے پہنچی، اس کو یقین تھا کہ بارش اب قطعاً ہوگی، ہمارا ایمان بھی اس معصوم جان کی طرح ہونا چاہیے کہ مبداء فیاض کی جانب سے وہ نعمت ہمیں قطعاً عطا ہوگی جس کا سوال ہم نے کیا ہے! جس قدر ہماری قوتِ ایمانی قوی ہوگی اسی قدر ہمارے تمام امور میں کامیابی و کامرانی نصیب ہوگی، اور ہماری ساری پریشانیاں سلجھ جائیں گی، مومن اپنی قوتِ ایمانی ہی سے ہمیشہ کام لیتا ہے، اور کامراں ہوتا ہے۔

بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ اس نعمت کا خارجی طور نہیں ہوتا، جب ایسا ہو تو یقین رکھو کہ یہ ہمیں ایک بہتر حالت کی طرف منتقل کرنے کے لیے ہو رہا ہے اور ہمیں حق تعالیٰ کی حکمت و رحمت کا عمیق علم عطا کرنا مقصود ہے، اس لیے بچائے حزن و یاس کے ہمیں حق تعالیٰ کی حمد و ثنا میں مصروف رہنا چاہیے، یہ ہمارے ایمان کی بڑی آزمائش ہے، اس خاص وقت کی دعا یہ ہے :-

اللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ حَمْدًا دَائِمًا مَعَ

دوامك و لك الحمد خالدًا مَعَ

خلودك و لك الحمد حمدًا لا منتهى

لَهُ دُونَ مَشِيئَتِكَ و لك الحمد

لَا يَرِيدُ قَائِلُهُ إِلَّا رِضَاكَ و لك

الحمد حمدًا عند كل طرفة عين

و تنفس اللّٰهُمَّ اقبل بقلبي الى

دينك و احفظ من ورائي

برحمتك، اللّٰهُمَّ ثبتني ان

اذل و اهدني، ان اضل

اللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ حَمْدًا دَائِمًا مَعَ  
دوامك و لك الحمد خالدًا مَعَ  
خلودك و لك الحمد حمدًا لا منتهى  
لَهُ دُونَ مَشِيئَتِكَ و لك الحمد  
لَا يَرِيدُ قَائِلُهُ إِلَّا رِضَاكَ و لك  
الحمد حمدًا عند كل طرفة عين  
و تنفس اللّٰهُمَّ اقبل بقلبي الى  
دينك و احفظ من ورائي  
برحمتك، اللّٰهُمَّ ثبتني ان  
اذل و اهدني، ان اضل



ہم اس عا میں مصروف رہتے ہیں حق تعالیٰ کی ثنا و حمد میں مشغول رہتے ہیں، یہاں تک کہ ہمیں اس کی پرواہ نہیں رہتی کہ مصیبت سے نجات کا سامان پردہ غیب سے ظاہر ہوا ہے کہ نہیں اور بالآخر شعور کا وہ نکتہ نمایاں ہوتا ہے، جب اس نجات کا خیال ہی قلب میں خطور نہیں کرتا، اور ہم حق تعالیٰ کی حمد و ثنا میں صرف حق تعالیٰ ہی کی خاطر مشغول و مصروف ہو جاتے ہیں، رضاد موافقت مولیٰ کے مقام کی طرف ہمارا عروج ہوتا ہے، اب نہ ہم میں کوئی ارادہ باقی رہتا ہے، نہ کوئی خواہش، نہ فعل نہ اختیار، یہ سب ارادہ و فعل حق میں غائب و فانی ہو جاتے ہیں۔

آد خبرے ز آمد او من بعد خبر نماند مارا

یہی شیخ جمالی کے الفاظ میں التواحة الكبرى واجتہ المعجزة في الدنيا والاخرة ہے، اسی کا نام اطمینان قلب ہے جس کی طرف اس آیت کریمہ میں اشارہ کیا گیا ہے۔

الَّذِينَ آمَنُوا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوبُهُمْ  
بِذِكْرِ اللَّهِ أَلَا بِذِكْرِ اللَّهِ تَطْمَئِنُّ  
الْقُلُوبُ! (پ ۱۴-۱۰ ع ۱۰)

جو لوگ ایمان لائے، اور ان کے قلب اللہ تعالیٰ کے  
ذکر سے مطمئن ہو گئے، ہاں اللہ ہی کے ذکر سے دل  
کو سکون و اطمینان حاصل ہوتا ہے۔

اطمینان قلب یا نفس مطمئنہ کے حصول کے بعد بندہ مومن حق تعالیٰ سے راضی ہو کر حبت ذات میں داخل ہو جاتا ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً فَادْخُلِي فِي  
عِبَادِي وَادْخُلِي جَنَّتِي . (پ ۳۰-۱۳ ع ۱۰)

یہی حریت تامہ ہے، یعنی حق تعالیٰ کا پانا اور ان سے راضی و مسرور رہنا :-

یار بااست چه حاجت کہ زیادہ ظلم

دولت صحبت آن مونس جاں مارا بس (حافظ)

فَلِلَّهِ نَسَمَةٌ ذَرَّهُمْ!

## ضمیمہ

شکر کے ذریعہ سلوک کے طے کرنے میں مندرجہ ذیل دعائیں اکسیر کا حکم رکھتی ہیں، سحر کے وقت ان کا ورد رقتِ قلبی کے ساتھ جاری رہنا چاہیے :-

اللَّهُمَّ صَلِّ عَلَى مُحَمَّدٍ وَعَلَى آلِ مُحَمَّدٍ إِيَّاهِ الْوَالِدِ الصَّغِيرِ الَّذِي رَبَّيْتَهُ فَكَانَ  
 الْحَمْدُ وَأَنَا الضَّعِيفُ الَّذِي قَوَّيْتَهُ فَكَانَ الْحَمْدُ وَأَنَا الْعَارِيُّ الَّذِي كَسَوْتَهُ فَكَانَ الْحَمْدُ  
 وَأَنَا الْجَائِعُ الَّذِي أَشْبَعْتَهُ فَكَانَ الْحَمْدُ وَأَنَا الضَّمَانُ الَّذِي سَقَيْتَهُ فَكَانَ الْحَمْدُ وَأَنَا  
 الْمَرِيضُ الَّذِي عَافَيْتَهُ فَكَانَ الْحَمْدُ وَأَنَا الدَّاعِي الَّذِي أَحْبَبْتَهُ فَكَانَ الْحَمْدُ وَأَنَا الْفَقِيرُ الَّذِي  
 أَغْنَيْتَهُ فَكَانَ الْحَمْدُ وَأَنَا الْجَاهِلُ الَّذِي عَلَّمْتَهُ فَكَانَ الْحَمْدُ وَأَنَا الْمُهَانُ الَّذِي كَرَّمْتَهُ  
 فَكَانَ الْحَمْدُ وَأَنَا السَّائِلُ الَّذِي أَعْطَيْتَهُ فَكَانَ الْحَمْدُ وَأَنَا الرَّاعِبُ الَّذِي أَرْضَيْتَهُ فَكَانَ الْحَمْدُ وَأَنَا  
 الْخَائِفُ الَّذِي أَمَّنْتَهُ فَكَانَ الْحَمْدُ وَأَنَا الْغَائِبُ الْيَسِيرُ الَّذِي أَوْيْتَهُ فَكَانَ الْحَمْدُ وَأَنَا الْخَاطِي الَّذِي  
 غَفَرْتَهُ فَكَانَ الْحَمْدُ وَأَنَا الدَّلِيلُ الَّذِي عَزَّزْتَهُ فَكَانَ الْحَمْدُ وَأَنَا الْمَجْرُوهُ الَّذِي عَزَّمْتَهُ فَكَانَ الْحَمْدُ  
 وَأَنَا الْعُورُ الَّذِي سَتَرْتَهُ فَكَانَ الْحَمْدُ أَنْتَ غِيَابِي فِي كُلِّ كَرْبٍ فَكَانَ الْحَمْدُ وَأَنْتَ رِجَائِي فِي كُلِّ  
 شِدَّةٍ فَكَانَ الْحَمْدُ وَأَنْتَ خَيْرُ الْأَوْلَاءِ عِنْدِي فَكَانَ الْحَمْدُ وَأَنْتَ قَدِيمُ الْعَقُوفِ فَكَانَ الْحَمْدُ وَلَوْ تَسَلَّمْتَنِي  
 لِسُوءِ عَمَلِي قَطُّ فَكَانَ الْحَمْدُ وَلَمْ تُؤَاخِذْنِي بِمُخْطِئَتِي فَكَانَ الْحَمْدُ وَلَمْ تُشْمِتْ بِي عَدُوِّي فَكَانَ  
 الْحَمْدُ وَمَا يَثِبُ فَضِيحَتِي بِعَمَلٍ فَلَمْ تُعَذِّبْنِي وَلَمْ تُفْضِخْنِي فَكَانَ الْحَمْدُ وَأَسْرَجُوا  
 الْخَيْرَ فَتَيَّبْتَهُ وَأَخَافُ الشَّرَّ فَصَرَّفْتَهُ فَكَانَ الْحَمْدُ وَتَلَطَّفْتَ بِي فِي الصِّغَرِ فَكَانَ الْحَمْدُ  
 وَهَدَيْتَنِي لِلْإِسْلَامِ فِي الْكِبَرِ فَكَانَ الْحَمْدُ وَأَرَبَيْتَنِي التَّنْيَاتِ فَكَانَ الْحَمْدُ  
 وَعَلَّمْتَنِي مَا لَمْ أَكُنْ أَعْلَمُ فَكَانَ الْحَمْدُ وَأَرْزَقْتَنِي مَا لَمْ أَكُنْ أَحْسِبُهُ فَكَانَ  
 الْحَمْدُ وَمَخَّرْتَنِي لِي مَا لَمْ أَكُنْ مُقَرَّرًا فَكَانَ الْحَمْدُ عَظَّمْتَ وَكَثَّرْتَ فَكَانَ الْحَمْدُ  
 بِكَ أَصْبَحُ وَأَمْسِي فَكَانَ الْحَمْدُ بِيَدِكَ مَوْتِي وَحَيَاتِي فَكَانَ الْحَمْدُ رَبِّ لَا تَهْرَبْنِي

وَأَنَا أَسْأَلُكَ وَلَا تُعَذِّبْنِي وَأَنَا أَسْتَغْفِرُكَ . رَبِّ لَا تُحْرِمْ نِي لِقَلَّةِ شُكْرِي وَ  
 لَا تُعَذِّبْنِي لِكثْرَةِ ذُنُوبِي وَارْحَمْنِي مِنْ أَجْلِ ضَعْفِي وَأَعْطِنِي مِنْ أَجْلِ  
 فَقْرِي وَارْحَمْنِي وَأَعْفُ عَنِّي تَعَلُّمِ مِنْ ذُنُوبِي فَإِنْ تُعَذِّبْ  
 فَإِنَّا الظَّالِمُونَ إِن تَعَفُّ فَإِنَّتِ ، أَرْحَمَ الرَّاحِمِينَ  
 وَإِنْ تَعَفُّ فَطَوَّلْ مِنْكَ وَإِنْ تُعَذِّبْ  
 فَغَيْرُ ظَالِمٍ وَلَا مُسْتَوْلٍ

# ماحول پر قابو کس طرح حاصل کیا جائے؟

گرچہ دیوار اُفگند سایہ دراز باز گرد سوئے اوآں سایہ باز  
 ایں جہاں کوہ است فعلِ ماندا سوئے ما آید ندا ہا را صدا

قرآنِ عظیم کی تعلیم یہ ہے کہ کائنات میں ایک لائق ہی حکمت، رحمت و کرم کے ساتھ مصروف  
 عمل ہے اور زندگی کے ہر قدم پر ہماری رہبری کرنے پر آمادہ ہے، اگر ہم اس پر بھروسہ کریں اور  
 اعضام کے طریقوں سے واقف ہو کر اس کے دامن میں خشک ماریں، ہمیں کائنات میں  
 بے یار و مددگار، بے ولی و نصیر نہیں چھوڑا گیا ہے، ساری زندگی لطفِ حق شامل حال رہتا ہے،  
 زندگی حق تعالیٰ کی نعمت و فضل سے مملو ہو جاتی ہے، اطمینانِ قلب و جمعیتِ خاطر نصیب  
 ہوتی ہے، اگر ہم رضائے حق کے تابع ہو جائیں اور حق تعالیٰ کو کافی سمجھ کر سارے کام ان  
 کے سپرد کر دیں!

حق تعالیٰ ہمیں سلامتی و نجات کی طرف لے جانا چاہتے ہیں وَاللّٰهُ يَدْعُوْا اِلٰى دَارِ السَّلَامِ  
 ان تجربات میں کامیاب کرنا چاہتے ہیں جن سے ہم گزر رہے ہیں اور جن سے ہم خوفزدہ ہیں! اِنَّ  
 اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلٰى النَّاسِ (بقرہ ۳۲۶) وہ ہم سے ضعف و کمزوری سے واقف ہیں، وہ ہمارا  
 بوجھ ہلکا کرنا چاہتے ہیں۔ يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُخَفِّفَ عَنْكُمْ وَاخْلِقَ الْاِنْسَانَ ضَعِيْفًا اَلْفَا  
 (۵۶) حق تعالیٰ ہمیں برترین مسرت عطا کرنا چاہتے ہیں اور اس سرور سے ہم سے قلب کو مملو کرنا چاہتے  
 ہیں جس کا خود ہمیں اندازہ نہیں فَلَا تَعْلَمُوْا نَفْسًا مَّا اُخْفِيَ لَكُمْ مِنْ قُرْاٰنٍ جَزَاءً بِمَا كَانُوْا  
 يَعْسَلُوْنَ، آنکھوں کی ٹھنڈک کا جو سامان خزانہ غیب میں موجود ہے اس کی کسی کو خبر نہیں (السجۃ)

لے یہ مقالہ پہلی مرتبہ برہان بابت جنوری ۱۹۵۲ء میں شائع ہوا

دنیا میں ہر جگہ ایک کامل الہی نظم موجود ہے، جس میں توافق و ہم آہنگی بھی ہے اور سرور و سکینہ بھی؛ حق تعالیٰ چاہتے ہیں کہ ہماری زندگی اس نظم الہی کے دائرہ میں بسر ہو اور زمین پر رہ کر ہم جنت کی خوشبو سونگتے رہیں: **هُوَ الَّذِي يُصَلِّحُ عَلَيْكُمْ وَمَا لَكُمْ لِمَنْ يُخْرِجَكُمْ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِينَ رَحِيمًا** (احزاب ۶۲) حق تعالیٰ اور اس کے فرشتے مومن پر رحمت بھیجتے رہتے ہیں، حق تعالیٰ انہیں تارکیوں سے نکال کر نور کی طرف لے جاتے ہیں اور وہ مومن پر بہت مہربان ہیں۔

اسی زندگی میں ہیں نعمت مل سکتی ہے اور حق تعالیٰ ہی ہیں اس کو عطا کر سکتے ہیں، **وَمَا يَكُمُ مِّنْ نِّعْمَةٍ مِّنَ اللَّهِ**! اگر ہم حق تعالیٰ پر کامل بھروسہ کریں تو ہماری مثال اس درخت کی سی ہو جاتی ہے جو پانی کے چشمے کے بازو اگاری، ہر وقت روحانی قوت و حیات کے سردی چشموں سے ہمیں تازگی پہنچتی رہتی ہے!

صد چو عالم در نظر پیدا کند چونکہ چشمت را بخود بینا کند (رومی)  
 اگر ہماری آنکھیں حق تعالیٰ کے مشاہدہ کے لیے کھل جائیں اور ہم ہدایت و نظم الہی کے دائرہ میں اپنی زندگی بسر کریں تو ہماری ساری خارجی مشکلیں حل ہو جاتی ہیں یا غائب ہو جاتی ہیں:  
 گر جہاں پر برف گردد سر بسر تاب خور بگذاروش از یک نظر (رومی)  
 اس عقیدہ یا ایمان کی مضبوط چٹان پر کھڑے ہو کر زندگی کے کچھ قدیم دستور اصول ہم سے سنو اور زندگی کے تجربات، حالات یا ماحول میں ان سے کام لو، زندگی ”گر پیہم“ نہ رہیگی، ”خندہ یکدم“ ہو جائیگی!

یاد رکھو کہ خارجی زندگی باطنی زندگی کا عکس ہے۔ ہماری باطنی زندگی یا نفس، جیسا ہوگا ویسا ہی عکس ہمارے خارجی حالات ہونگے، ویسا ہی ہمارا آفاق ہوگا۔ آفاق تابع نفس ہے۔ آفاق میں تغیر نفس کے تغیر کا تابع ہے۔ اس صداقت کو قرآن حکیم نے ایک سے زیادہ جگہ واضح کہا ہے، **شك و شبہ سے نکلنے کے لیے ہم اس کا ذکر کر رہے ہیں۔**

إِنَّ اللَّهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا وَأَقْبَلِ حَقُّ تَعَالَىٰ كَيْفَ قَوْمٌ كَيْفَ حَالَتِ فِي تَغْيِيرِهِمْ كَمَا



مَا بِأَنْفُسِهِمْ (الرعد ۲۶) جب تک وہ لوگ خود اپنی حالت کو نہیں بدلتے

ذَلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا

نِعْمَةً أَنْعَمَهَا عَلَى قَوْمٍ حَتَّى يُغَيِّرُوا

مَا بِأَنْفُسِهِمْ (الانفال ۷۶) وہی لوگ اپنے نفس کو نہیں بدل دالتے۔

خارج کا تغیر، ماحول کا بدلنا، حالات پر قابو پانا ہو تو باطن کا تغیر، نفس کا بدلنا ضروری ہے اگر باطن میں کجی ہو، نفس خام و ناشائستہ ہو تو خارج میں کجی، ناہمواری، عدم توافق یا دوسرے الفاظ میں درد و غم، قلت و اقلال، ضیق و پریشانی کا ہونا ضروری ہے۔

باطن یا نفس سے مراد ظاہر ہے کہ نفس اور اس کے صفات ہیں اور ان سے پیدا ہونے والے افعال و اعمال ہیں۔ اب ماحول کی ناسازگاری، ضیق و پریشانی، رنج و غم، غم و الم راست نتیجہ ہیں باطنی زندگی کا، یعنی رذائل اخلاق کا، اتباع ہوا کا، جرم و معصیت کا، بدکرداری و گناہ کا، قرآن مبین نے اس کی وضاحت ان الفاظ میں کی ہے:-

وَمَا أَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيبَةٍ فِيمَا

كَسَبْتُمْ أَيْدِيكُمْ وَيَعْفُوا عَنْ

كَثِيرٍ (شوریٰ ۵۶) تو درگزر ہی کر دیتا ہے۔

اسی اصول کو کسی اور جگہ اور زیادہ واضح الفاظ میں ظاہر فرمایا گیا ہے:-

أَوَلَمْ نَأْتِكُمْ مِّنْ مُّصِيبَةٍ قَدْ أَصَبْتُمْ

مِثْلَهَا قُلْتُمْ إِنَّا هَذَا هُوَ مِن

عِنْدِ أَنْفُسِكُمْ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ

شَيْءٍ قَدِيرٌ (پ ۸۶۳) ہی طرف سے پہنچی۔

صاحب قرآن صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اصول کی تفسیر میں فرمایا:

انما ہی اعمالکم ترد علیکم یہ تمہارے اعمال ہیں جو تم پر لوٹے جاتے ہیں۔

دوسری جگہ یوں سرمایا :

إِنَّمَا هِيَ أَعْمَالُكُمْ أُخْصِيهَا يَا أَيُّهَا الْمَرْءُ مَا كَسَبَتْ يَدَاكَ وَأنتَ سَاهٍ فِيهَا وَمِنْ أَجْلِ ذَلِكَ كَتَبْنَا عَلَى الَّذِينَ جَاءُواكَ أَن يَخْبِتُوا لَكَ أَن يَقُولُوا مَن جَاءَكَ يَتَوَدَّعَ وِجْهَهُ لِلَّهِ وَمِنْ وَجْدٍ غَيْرِهَا فَلَا يُلَوِّمُ إِلَّا نَفْسَهُ .

اس کے خلاف پائے تو سوائے اپنے نفس کے کسی پر ملامت نہ کرے

اس اصول کی وضاحت میں صوفیہ کرام نے جو مثال استعمال کی ہے وہ نہایت صحیح اور صاف ہے، وہ شخص اور اس کے سایہ سے اس اصول کو سمجھاتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ ظل یا سایہ شخص کے تابع ہوتا ہے۔ اگر کوئی شے ٹیڑھی ہو تو اس کا سایہ بھی ٹیڑھا ہوگا اور اگر سیدھی تو سایہ بھی سیدھا ہوگا۔ نفس شخص کی مانند ہے اور ماحول اس کا سایہ ہے، یا صفات و اعمال شخص کی مثال ہے، حالات و واقعات ان کا عکس و سایہ ہیں۔ شیخ ابوالنجاء اپنے احباب سے کہا کرتے تھے۔

اعلموا ان جميع الوجود يقابلكم بحسب يعني "جان لو کہ جو اعمال تم سے سرزد ہوتے ہیں وہ مابرز منکم من الاعمال، فانظروا ہی تمہارے ساتھ معاملہ کیا جاتا ہے، اسی لیے ذرا کیف تکون، فان الظل تابع اپنے اعمال پر نظر رکھنا کیونکہ ظل یا سایہ شخص کے الشاخص فی العوج والاستقامة تابع ہوتا ہے کجی و راستی ہر دو میں۔

اس صداقت پر امام شعرانی کو اتنا یقین تھا کہ اگر اپنے دوستوں یا بیوی یا نوکروں سے کجروی یا نشوز و گریز اپنے معاملہ میں پاتے تو ذمہ دار اپنی ذات کو کھٹاتے اور اپنے ہی پر ملامت کرتے ان کا یہ قول مشہور ہے۔

إِنَّ الْوُجُودَ يَعْأَلُنِي عَلَى صُورَةِ عَاقِلَتِ يَسِيءُ فَاللَّوْمُ عَلَى لَأَعْلِيهِمْ فِي الْأَصْلِ جِيسَاكُم مِّنْ أُنْ كَسَاكُم كَرْتَا هُونِ، بِسْطَانِ مِيرِي هِي ذَاتِ بِرْهُونِ كَهْ أَنْ كِي ذَاتِ بِرْ كِيُونِ كِهْ فَانْ كَانِ الشَّخْصُ مُسْتَقِيمًا فَالظِّلُّ أَنْ كِي مَثَالِ كَسِي شَوْ كِهْ سَايَهْ كِي مَانْدَهِي۔ اَگر

مستقیماً اور اعوج فالظل اعوج شے سیدھی ہے تو سایہ بھی سیدھا ہے اور اگر شے  
 ومن طلب الاستقامة الظل ٹیڑھی ہے تو سایہ بھی ٹیڑھا۔ جس شخص نے اس بات  
 مع عوج الشاخص فقد رام کی توقع کی کہ ٹیڑھی شے کا سایہ سیدھا ہوگا تو  
 المحال۔ اس نے محال کی تمنا کی

قرآن عظیم نے کل نفس بما کسبت رھینہ اور کل امریٰ بما کسبت رھینہ اور لھا  
 ما کسبت وعلیہا ما اکتسبت اور من عمل صالحا فلنفسہ ومن اساء فعلیہا کہہ کر  
 اس صداقت کی توضیح کی ہے، اس اصول کو اچھی طرح ذہن نشین کر لو! یہ وہی اصول ہے  
 جس کو امیر مینائی نے عاشقوں کی زبان میں اس طرح ادا کیا ہے۔

یہ رونا بیوفائی کا یہ شکوہ کج ادائیگی کا سزا بردل لگنے کی، مزہ پر آختائی کا  
 فلسفہ اخلاق کی زبان میں اس کو یوں بیان کرتے ہیں: الناس مجزیون باعمالہم  
 ان خیراً فخیروا ان شرّاً فشر۔ لوگوں کو اعمال کی جزا ملتی ہے اگر اعمال اچھے ہوں تو ان کی جزا  
 بھی اچھی ہوتی ہے، اور اگر اعمال بد ہوں تو ویسی ہی ان کی جزا ہوتی ہے!  
 بنیادی اصول کو سمجھ لینے کے بعد اب ماحول یا واقعات زندگی کے سلسلہ میں تمہیں چند  
 باتیں سمجھنی ضروری ہیں۔

اد پر بیان کیے ہوئے اصول پر غور کرنے سے تمہیں یہ بات آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے کہ  
 زمین و آسمان کی پیدائش کا مقصد ہی یہ ہے کہ ہر شخص کو اس کے کیے کا بدلہ دیا جائے اور قرآن  
 کریم نے صاف الفاظ میں اس کی وضاحت کر دی ہے :-

خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ بِالْحَقِّ وَ حَقَّ تَعَالَىٰ نَعَىٰ آسْمَانِ وَ زَمِينِ كُو عِلْمَتِ كَسَا تَق  
 لِيُجْزِيَ كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ وَ هُوَ پید اکیا کہ ہر شخص کو اس کے کیے کا بدلہ دیا جا  
 رَبُّ يَظْلَمُونَ . (البجاثہ ۲۶) اور ان پر ذرا ظلم نہ کیا جاے۔

یاد رکھو کہ زندگی کا مقصد طفل شیرخوار کی طرح ہماری دایہ گری کرنا نہیں! یہ فرائض و واجبات کا

بارہائے کندھوں پر رکھتی ہے تاکہ ان کی ادائیگی میں ہم زیادہ سے زیادہ قوی ہوتے جائیں،  
ہماری اخلاقی اعصاب و عضلات طاقتور ہوں اور ہم انسانِ کامل بن جائیں اور اس سرورِ  
مستی سے بہرہ یاب ہوں جو کالمین کے لیے مقدر کی گئی ہے؛

بایوں کہو کہ ہماری زندگی ایک تربیت گاہ ہے، حق تعالیٰ ہمارے معلم اور استاد ہیں اور  
مرمکے واقعات اور حادثات وہ آلات ہیں جن کے ذریعہ ہماری سیرت کی تکمیل کی جا رہی  
ہے۔ دنیا کی مثال ایک ”روح ساز وادی“ سے دی جاتی ہے۔ یہاں کبھی غم کی مضراب سے  
اور کبھی خوشی کے تاروں سے سیرت کے خفتہ نغمے بیدار کیے جاتے ہیں، راحت و غم، بلا و طرا،  
لذت و الم ہمیں اپنا سلوک طے کرنے میں مدد دے رہے ہیں، دونوں ہمارے لیے خیر ہیں،  
ان میں سے کسی ایک کو دوسرے پر ترجیح نہیں دی جاسکتی ہے۔

بس زبونِ دسو سہا سنی لا      گر طرب را باز دانی از بلا

موت و حیات کی تخلیق قرآن حکیم کے الفاظ میں اس لیے ہوئی ہے کہ اس امر کی آزمائش  
کی جائے کہ ہم میں کون شخص عمل میں زیادہ اچھا ہے:

خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا (المک ۱۶)

جب حقیقت یہ ہو تو عارف نہ زندگی کے تغیرات سے گھبراتا ہے نہ ان سے بھاگنے کی  
کوشش کرتا ہے، یہ تو اس کی تادیب و تزکیہ کے لیے ظہور پذیر ہو رہے ہیں۔ ان تغیرات و  
تحولات سے وہ اسی طرح سبق لیتا ہے جس طرح کہ ایک ذہین و محنتی طالب علم استاد کی تقریر و  
تعلیم سے استفادہ کرتا ہے، اپنے جہل کو دور کرتا ہے، اپنے نفس کا تزکیہ، قلب کا تصفیہ اور  
اپنے دماغ کا خیالاتِ فاسد سے تخلیہ کرتا ہے، ان واقعات و تغیرات کی حیثیت اس کی نگاہ  
میں ایک پردہ کی سی ہے اور اس پردہ کے پیچھے وہ حق تعالیٰ ہی کو مصروفِ عمل دیکھتا ہے اور  
شیخ جیلجیل کے الفاظ میں حق تعالیٰ سے مخاطب ہو کر کہتا ہے:

رَبِّ اَشْهَدْنِي مُطَّلَقًا عَلَيَّتِكَ فِي لِيْ پروردگار مجھے ہر شے میں اپنی فاعلیت کا

كُلِّ مَفْعُولٍ حَتَّى لَا أَرَى فَاعِلًا غَيْرَكَ ۖ مشاہدہ نصیب کرتا کہ تیرا سوکھی کو فاعل نہ دیکھوں تاکہ  
لَا كُوْنَنَّ مُطْمَئِنِّينًا تَحْتَ جِرْيَانِ اِقْدَارِكَ ۖ تیرے اقدار کے جاری ہونے سے مطمئن ہو جاؤں  
مُنْقَادًا اِلَيْكَ حَكْمًا! اور تیرے حکم کا مطیع و فرمانبردار بن جاؤں۔

اسی علم و عرفان کے ایک متوالے کی زبان سے یہ سریلے نغمے نکلے ہیں :-

یار سیت مراد رکے پردہ حُسن رُخ اوسرکے پردہ

عالم ہمہ پردہ مصور اشیا ہمہ نقشہا کے پردہ

ایں پردہ مرا ز توحید ا کرد اینست خود اقتصا کے پردہ

نے نے میانِ ماحب دایئ ہرگز نکند عطا کے پردہ (لا، علم)

جاہل تغیرات کو پسند نہیں کرتا، ان سے کبیدہ قاطر ہوتا ہے، ان کا مقابلہ کرتا ہے، مزاحم ہوتا ہے؛  
لیکن زندگی دائمی تغیر کا نام ہے، سکون محال ہے قدرت کے کارخانہ میں، اس لیے جاہل کا مقابلہ خود  
زندگی کے قانون اور اس کی قوتوں سے ہے، یہ قانون اور اس کی قوتیں مقصد و غایت کے لحاظ  
سے منصفانہ اور مہربان اور عمل کے لحاظ سے غیر جانبدارانہ اور ناقابل شکست ہوتی ہیں۔

ہیں زندگی کے واقعات و تغیرات کا مقابلہ نہیں کرنا چاہیے بلکہ ان کے ساتھ برضا و رغبت  
اشتراکِ عمل کرنا چاہیے! یعنی ہمیں اس سبق پر نگاہ رکھنی چاہیے جو ہمیں ان واقعات و تجربات کے  
ذریعہ دیا جا رہا ہے کیونکہ جب ہم اس سبق کو یاد کر لیتے ہیں اور اس کے مطابق اپنی سیرت و عمل میں  
تغیر پیدا کر لیتے ہیں تو پھر یہ تکلیف دہ، ناخوشگوار اور المناک واقعات و تجربات رفع ہو جاتے ہیں  
اور طمانیت و بردباری ہمیں نصیب ہوتی ہے حقیقی معنی میں کامیاب زندگی کا راز حق تعالیٰ کے  
ارادے اور مقصد کے ساتھ توافق و اتحاد ہے۔ اور اس مقصد و ارادہ کا اظہار ان ہی واقعات و  
تجربات و تغیرات میں ہو رہا ہے جس کے ساتھ توافق ضروری ہے جس کا شرع کی زبان میں "توافق بالقضاء"  
نام ہے، جس کو "رضا بالعطاء" و "حفظ حال" سے بھی تعبیر کیا گیا ہے، اسی لیے واقعاتِ راز لے کہا ہے کہ  
بدیں سپاس کہ مجلس منورست بناز گرت چو شمع جفکے رسد بسوز و بساز



ہیں دنیا میں اس لیے بھیجا گیا ہے کہ تجربات کے ذریعہ سیرت کی تکمیل کریں، اپنی پوشیدہ و  
 منفی روحانی قوتوں کو ظاہر و نمایاں کریں جو الہی قوتیں ہم میں بالقوی ہیں انہیں بالفعل کریں  
 اور ہم اسی صورت میں ارادۃ اللہ کے ساتھ توافق قائم کر سکتے ہیں جب ہم اپنی زندگی کے واقعات و تجربات  
 کے ساتھ برضا و رغبت اشتراک عمل کریں، اور جو سبق وہ ہمیں سکھانے کے لیے رونما ہو رہے ہیں انہیں  
 سیکھیں نہ کہ ان سے تجاہل برتنے کی کوشش کریں۔

در ریاض بندگی رعنا تر از شرح گل گرو نے کز بار تسلیم و رضا خم می شود!

تمام تجربات کا مقصد یہ ہے اس راہ پر لے چلنے ہے جو خدا کی طرف لے جاتا ہے ہم اپنے جبل  
 کی وجہ سے اس راہ سے بھٹک جاتے ہیں، دور جا پڑتے ہیں! جذبات و شہوات ہمیں صراط  
 مستقیم سے ہٹالے جاتے ہیں، صراطِ مستقیم کی طرف ہمارے قدم اسی وقت اٹھ سکتے ہیں جب  
 ہماری سیرت کی تکمیل ہو اور ہمارا روحانی ارتقا عمل میں آئے، اب زندگی میں رونما ہونے والے سارے  
 تجربات و واقعات ہماری سیرت کی تکمیل کرتے ہیں اور ہمارے روحانی ارتقا میں مدد دیتے ہیں تاکہ ہم  
 اس صراطِ مستقیم پر چلیں جو حق تعالیٰ کی طرف ہمیں لے جاتی ہے۔ لہذا تجربات و حالات خوشگوار ہوں  
 یا ناخوشگوار، مسرت بخش ہوں یا غمناک، بہر طور یہ ہمارے خیر برتر کے حصول کے لیے ضروری و لا بدی  
 ہیں، ان میں ہمارے لیے ہدایت کا ایک سبق پوشیدہ ہوتا ہے جس کو معلوم کرنے اور جس پر عمل پیرا  
 ہونے کی ہمیں کوشش کرنی چاہیے اور جوں ہی ہم نے اس ہدایت پر عمل کرنا شروع کر دیا ہے  
 شقاوت و گمراہی سے نجات مل جاتی، اور ان سے پیدا ہونے والے نتائج ضیق، خوف و حزن  
 سے بھی!

مَنْ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقَىٰ تُو جُو شخص میری اتباع کرے گا تو وہ نہ گمراہ ہوگا اور  
 وَمَنْ أَعْرَضَ عَنِّي فَانِّ كُذِّبَتْ عَنْ ذِكْرِي فَإِنَّ لَكَ نَشَقِي اور جو شخص میری نصیحت سے اعراض  
 مَعِينَهُ ضَرْبًا وَنَحْشًا يَوْمَ الْقِيَامَةِ کرے گا تو اس کے لیے تنگی کا جینا ہوگا اور قیامت  
 آغشی (طہ ۱۰) کے روز ہم اس کو اندھا کر کے اٹھائیں گے۔

ہر تجربہ ہر واقعہ زندگی کا خیرِ لاتناہی کی طرف لے جاتا ہے، تصادم کی بجائے اس سے توافق ہی سب سے بڑی عقلمندی ہے، رضا بالقضار اسی کو کہا جاتا ہے، ہماری زندگی میں کوئی حادثہ نہیں نازل ہوتا مگر وہی جو حق تعالیٰ نے ہمارے لیے مقدر فرمایا ہے، وہ ہمارے مولیٰ ہیں، آقا ہیں ہمیں اپنے سب کام انہی کے سپرد کر دینے چاہئیں۔

قُلْ لَنْ يُصِيبَنَا إِلَّا مَا كَتَبَ اللَّهُ لَنَا هُوَ مَوْلَانَا وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ

شاد و خداں پیش تیغش سربندہ ہجو اسمعیل پیشش سربندہ (روحی)

تمام تجربات و حادثات دوا و معالجہ کی غرض سے ظہور پذیر ہوتے ہیں اور جب ان کا مقصد پورا ہو جاتا ہے تو وہ غائب ہو جاتے ہیں، پھر ان دردناک حادثات کی تکرار عموماً نہیں ہوتی، پھر راحت و طمانیت ہی میں زندگی گزرتی ہے۔

بسر و گرم جہاں خاطر چوراضی شد تمام عمر ترا آب سرد و نان گرم است (سلیم)

جب تک ہم حادثاتِ زمانہ سے سبق نہیں لیتے بکجروی و گمراہی میں مبتلا رہتے ہیں،

اتباعِ شہوات میں گرفتار رہتے ہیں اور ان مصائب و آفات کو خود پیدا کرتے رہتے ہیں

جن سے ہم نجات پانا چاہتے ہیں، جب ہم نے سبقِ ہدایت حاصل کیا، ہماری سیرت بدلتی

ہے۔ ہم میں تقویٰ کے صفات پیدا ہوتے ہیں، ہمارا نقطہ نگاہ بدلنا ہے، قانونِ الہی کے مطابق

ہم فکر کرنے لگتے ہیں، حق تعالیٰ سے ربط قائم کرنے لگتے ہیں، ان کی ہدایت پر عمل پیرا ہونے

لگتے ہیں۔ آفات و مصائب کا ورود جس غرض کی تکمیل کے لیے ہو رہا تھا اب وہ غرض چونکہ

پوری ہو چکی ہوتی ہے، وہ بھی بتدریج غائب ہونے لگتے ہیں۔

دردناک تجربات و حادثات ہی سے ہمیں سبقِ ہدایت حاصل کرنا کافی نہیں بلکہ ان تجربات و

حالات سے بھی جو خوشگوار اور راحت بخش ہوتے ہیں سبقِ سیکھنا ضروری ہے۔ آسائش و نعمت

کی حالت میں بھی ہمیں شکر کے ذریعہ حق تعالیٰ کی یاد میں رہنا چاہیے چنانچہ تاکید کے ساتھ حکم دیا گیا ہے

فلیکثوا للذِّعَاءِ عِنْدَ الرِّجَاءِ چین و آسائش کے وقت زیادہ دعا کیے رہو۔

چین کی حالت میں دعا کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہر نعمت کو حق تعالیٰ ہی کی طرف سے سمجھا جائے وَمَا بِكُمْ مِنْ نِعْمَةٍ فَمِنَ اللَّهِ کیونکہ درحقیقت منعم وقاسم نعمت حق تعالیٰ ہی ہیں، لہذا ان ہی کی مرضی کے مطابق نعمتوں کا استعمال ضروری ہے جب ہمیں نعمتیں عطا کی جاتی ہیں، جب ہم عافیت کی حالت میں ہوتے ہیں، جب ہمیں صحت و تندرستی ملتی ہے، امراض و آلام سے محفوظ ہوتے ہیں، فراخی و آسائش سے متمتع ہوتے ہیں تو یہ سب ہماری آزمائش و ابتلا کے لیے ہوتا ہے، دیکھا جاتا ہے کہ اس عافیت کے نتیجے کے طور پر ہم میں کبر و عجب تو نہیں پیدا ہو گیا، ہم شہوتوں اور لذتوں کے درپے تو نہیں ہو گئے، موجودہ نعمتوں کو حقیر و خوار تو نہیں سمجھتے لگے اور ان نعمتوں میں عیب و نقصان تو نہیں نکالنے لگے؛ دیکھا جاتا ہے کہ کیا نعمتوں اور راحتوں کی وجہ سے ہم حق تعالیٰ کی اطاعت سے روگرداں ہو کر گناہوں اور مصیبتوں میں مہلک تو نہیں ہو گئے؛ اسی لیے سمجھا جاتا ہے کہ نعمت کی آزمائش مصیبت کی آزمائش سے زیادہ سخت ہوتی ہے، خوشی کا فتنہ تکلیف کے فتنہ سے بہت بڑا ہوتا ہے؛ صاف بات ہے کہ گناہوں پر قدرت ہونے کے باوجود ان سے رک جانا یا صبر کرنا بہت دشوار ہوتا ہے؛ عیش و آرام سے انسان کا جسم فریب ہونے لگتا ہے عیش و آرام بغیر اس کو صبر نہیں آتا اور دوام عیش اسی وقت ممکن ہے جب اس کے حصول میں وہ لوگوں سے مدد چاہے اور ظالموں سے التجا کرے اور یہ امور نفاق، کذب، ریا، بغض، دشمنی کا سبب ہو جاتے ہیں اور ان سے تمام روحانی مہلکات پیدا ہوتے ہیں، قلب کے سارے امراض جنم لیتے ہیں، اسی لیے صادق مصدق صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ ”دنیا کی محبت ہر گناہ کی جڑ ہے!“

جب انسان نعمت و عافیت کی حالت میں ہوتا ہے تو وہ عموماً حق تعالیٰ کی یاد سے غافل ہو جاتا ہے، از دیار دولت کی تدبیریں، اپنے بچاؤ کا خیال، مال کی حفاظت کا بندوبست، اس کے خرچ کرنے کا انتظام، یہ تمام امور اس کے قلب پر ہجوم کرتے ہیں، اور یہ سب اس کے

لہ حب الدنيا راس كل خطيئة (رواه البيهقي في الشعب وابن ابى الدنيا)

دل کو سیاہ کرتے اور حق تعالیٰ کی یاد سے غافل کرتے ہیں جیسا کہ حق تعالیٰ نے فرمایا:

الْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ حَتّٰی تَرْضُوهُ  
الْمَقَابِرَ .  
تک کہ تم قبرستانوں میں پہنچ جاتے ہو!

اسی لیے عیش سے بچنے کی ہدایت فرمائی گئی حضور انور صلعم نے معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا کہ ”تم تنعم سے بچو، کیونکہ اللہ کے بندے عیش کرنے والے نہیں ہوتے (اِنَّ عِبَادَ اللّٰهِ لَیْسُوْا بِالْمُنْعَمِیْنَ)

یعنی کہ نعمت کا فتنہ مصیبت کے فتنے سے بہت زیادہ سخت ہوتا ہے اور نعمت و مصیبت ہر دو ہمارے لیے ابتلا یا آزمائش ہیں! اسی حقیقت کو قرآن حکیم میں حق تعالیٰ اس طرح ادا فرما رہے ہیں:

وَقَطَّعْنٰهُمْ فِی الْاَرْضِ اُمَمًا مِّنْهُمْ  
لِّصَّالِحِیْنَ وَمِنْهُمْ دُوْنَ ذٰلِكَ  
بَلَوْنٰهُمْ بِالْحَسَنٰتِ وَالسَّیِّئٰتِ لَعَلَّہُمْ  
یَرْجِعُوْنَ (پ ۱۱۶)

ہم نے دنیا میں ان کی مختلف جماعتیں کر دیں۔  
ان میں سے بعض نیک تھے اور بعض اور طرح  
کے اور ہم ان کو خوش حالیوں اور بد حالیوں  
سے آزماتے رہے کہ شاید باز آجائیں۔

اسی طرح فرمایا:-

وَنَبَلُوْكُمْ بِالسَّیْرِ وَالْخَیْرِ فِتْنَةً (پ ۳۶) اور ہم تم کو بری بھلی حالتوں سے بھی طرح آزماتے ہیں۔

نعمت و عافیت کی حالت میں مردمومن مشکور ہوتا ہے، یہی اس حالت کا ادب ہے۔

المؤمنُ مشکورٌ عندَ الرَّحْمٰنِ المؤمنُ چین کی حالت میں حق تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہے

دل و زبان و اعضاء کے شکر ہی سے نعمتیں سلب نقصان سے محفوظ ہوتی ہیں اور ان میں اضافہ

ہوتا ہے!

لَیْسَ شُكْرُكُمْ لَآ زَیْدٌ شُكْرٌ اِذَا تَمَّ شَاكِرٌ وَتَوْقِیْنًا ہم نعمتوں میں اضافہ کرتے ہیں

خوب سمجھ لو کہ اجابت دعا، رزق و غنا، توبہ و مغفرت کا انحصار اپنی مرضی پر رکھا ہے کہ چاہا

تو دیا، چاہا تو نہ دیا، لیکن شکر کے معاوضہ میں زیادتی نعمت بلا تخلف ہے! اسی لیے حضور انور صلعم

نے سزا پایا :

مَنْ تَوَلَّتْ إِلَيْهِ نِعْمَةٌ فَلْيَشْكُرْهَا جس کو نعمت ملے وہ اس کا شکر ادا کرے !  
 نیز فلیكثر الدعاء عند الرخاء چین و آسائش کی حالت میں زیادہ دعا کرتے رہو  
 زندگی کے تجربے، حادثے، تغیر و تحول ہماری آزمائش، ہماری سیرت کی تعمیر و تکمیل ہماری  
 صلاحیتوں کو بیدار کرنے، بالقویٰ کو بالفعل کرنے ہی کی غرض سے رونما ہو رہے ہیں، ان کی  
 دو قسمیں ہیں ملامت و ناملاتم اور انسان کے نفس کی بھی دو حالتیں ہیں، تیسری حالت نہیں۔  
 ایک عافیت دوسری بلا، ناملاتم یا دردناک حادثات کا درد اس لیے ہوتا ہے کہ ہم کجروی سے  
 باز آجائیں، شہوتوں کے اتباع سے رک جائیں، سیرت کی اصلاح کر لیں! سوہانِ قضا ہمارے  
 پیکرِ خالی کو پختہ و ہموار بناتا ہے، اس کی کمی و خامی کو غم و الم کے انگارہ سے دور کرتا ہے بقولِ آقا:

جہانِ ما کہ جزا نگارہ نیست      اسیرِ انقلابِ صبح و شام است  
 ز سوہانِ قضا ہموار گردد      ہنوز ایں سپیکرِ گلِ ناتمام است

نفس کی اس حالت کو بلا و مصیبت کی حالت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

ملاتم یا نعمت و عافیت کے حالات سے بھی ہماری آزمائش ہوتی ہے، اگر ہم ان حالات میں  
 یا حق سے غافل نہ ہو جائیں، اپنا رخ حق تعالیٰ ہی کی جانب رکھیں، ان کی نعمتوں کو ان کی  
 مرضی کے مطابق استعمال کریں تو ہم اپنے باطن میں یہ ندا سنتے ہیں :-

اَزْكَضْ بِرَجْلِكَ هَذَا مَغْتَسَلًا      اپنا پاؤں مارو یہ نہانے کا ٹھنڈا پانی ہے  
 بَارِكْهُ وَ شَرَابًا      (پہ ۱۳۶) اور پینے کا۔

یعنی ہم حق تعالیٰ کی رحمت و رافت، لطف و منت کے دریا سے سیراب ہوتے ہیں، ہم پر ان  
 کی نعمت و ناز و محبت کے دروازے کھل جاتے ہیں، ظاہر و باطن کی نعمتیں ہم پر تمام کر دی جاتی  
 ہیں اور حق تعالیٰ اپنے لطف و کرم سے ہماری پرورش و پرورش کرتے ہیں اور یہ حالت  
 موت کے وقت تک باقی رہتی ہے اور موت کے بعد وہ اپنے فضل و کرم سے ایسی نعمت عطا



کہتے ہیں جس کو کسی آنکھ نے دیکھا اور نہ کان نے سنا اور نہ کسی کے دل پر اس کا خطرہ گزرا۔

فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا أُخْفِيَ لَهُم مِّن قُرَّةِ أَعْيُنٍ جَزَاءً بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ (السجده ۲۶)

نا ملائم یا دردناک واقعات و حادثات پر غالب آنے کا طریقہ تعطل، عجز، کسل، صبر، بزدلی،

ماتم و سینہ کو بی نہیں، نہ مزاحمت و مقابلہ، سرکشی و سب و شتم ہی ہے بلکہ جیسا کہ اوپر وضاحت

کی گئی ان حادثات کے سبق ہدایت سے مستفید ہونا، صبر و استقامت، حکمت و عقلمندی کے

اپنی سیرت و اخلاق میں تغیر پیدا کرنا ہے! ہم میں سے اکثر کے لیے اس امر کا اعتراف سخت

مشکل ہے کہ ہماری زندگی میں جو کچھ بھی درد و غم، اندوہ و الم کی صورت میں وقوع پذیر ہو رہا ہے،

اس کی اصلی علت خود پہلے نفس میں پوشیدہ سرگرم عمل ہوتی ہے، شیخ محی الدین اکبرؒ کی یہ تہذیب

کہ "یلاک کسبتا و فوک فح" یہ تیرے دونوں ہاتھوں کی کمائی ہے اور تیرے منہ کی مانگ

ہے۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتی اور ہم الزام زندگی پر رکھتے ہیں، حق تعالیٰ پر تہمت لگاتے ہیں

یا اپنے ہم جنسوں کو متہم ٹھہراتے ہیں، اور اس سبق کو سیکھنے سے انکار کرتے ہیں جو حادثات

و المناک واقعات کے ذریعہ حق تعالیٰ کی لائنا ہی حکمت ہمیں سکھلانا چاہتی ہے۔ ہم ٹوٹے

ہوئے دل لے کر چیخ اٹھتے ہیں کہ "لوگو! دیکھو، میرے ساتھ کیا معاملہ کیا جا رہا ہے! ایک

مصیبت ختم نہیں ہونے پاتی کہ دوسری اس سے زیادہ آفت مجھ پر نازل ہوتی ہے!

بتلاؤ میرا کیا قصور ہے؟ یہ سب میری تقدیر کا نوشتہ ہے! اے تقدیر!

طلحے دارم آنکہ از پے آب

گر روم سوئے بحر بر گردد

ور بدو رخ روم پے آتش

آتش از رخ فسرده تر گردد

ور زکوه التماس سنگ کنم

سنگ نایاب چوں گہر گردد

گر سلامے برم بہ نزو کسے

ہر دو گو شتم بحکم کر گردد

در بصر ا روم بچستن خاک

خاک حالی بہ نریخ زر گردد

ایں چنین حالما بہ پیش آید

ہر کرا روزگار بر گردد

لہ دیکھو فتوح الغیبیہ ج ۲۱

مولانا لطف اللہ شاد پوری

لیکن سچ بات تو یہ ہے کہ ہمارے روحانی ارتقا کے لیے جن حالات کی ضرورت ہے ہم خود انہیں اپنی طرف جذب کرتے ہیں، ان تمام بلاؤں اور آفتوں کا باعث خود ہم ہیں، حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے جامع و مانع الفاظ میں ہماری "ھوی متبع و شہ مطاع" (خواہشاتِ نفسانی جن کا اتباع کیا گیا اور وہ مرضِ جس کی پیروی کی گئی ہے) جب ہماری آنکھوں سے غفلت کا پردہ اٹھ جائے اور ہماری سمجھ میں آجائے کہ "ازماست کہ برماست" "ازماخیزد برماخیزد" اور زندگی میں کامل انصاف ہے تو پھر ہم سچ اٹھتے ہیں:

إِنَّ اللَّهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْئًا وَلَكِنَّ  
النَّاسَ أَنفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ (یونس ۶)

بے شک حق تعالیٰ لوگوں پر ظلم نہیں کرتے لیکن  
لوگ خود اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں۔

اب ہم اپنا رخ حق تعالیٰ کی طرف کر لیتے ہیں "انصار اللہ" بن جاتے ہیں، حق تعالیٰ کی مخالفت ترک کر دیتے ہیں، ان کے قائم کردہ حدود سے تجاوز نہیں کرتے، ان کے قوانین کی پابندی کرنے لگتے ہیں، اسی میں ہماری عظیم الشان کامیابی ہے!

ماحول پر غالب آنے کا بس یہی طریقہ ہے کہ ہم اپنے قلب کا جائزہ لیں اور خارجی مشکلات و آفات کے اسباب و علل کی تلاش "انفس" میں کریں۔ اگر ہم دیکھیں کہ حق تعالیٰ کی محبت سے ہمارا قلب عاری یا خالی ہے، ذبیوی لذتوں اور شہوتوں سے مملو ہے، اس کے گرد فریر گردیدہ ہے، اس کے رنگ و بو پر فدا، اس کے "خندہ گریہ آمیز" پر قربان، تو ہمیں اپنے نفس کو مخاطب کر کے کہنا چاہیے کہ

فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيَاةُ الدُّنْيَا وَلَا  
يَغُرَّنَّكُم بِاللَّهِ الْغُرُورُ (۱۳۶)

سو تم کو دنیاوی زندگی دھوکہ میں نہ ڈالے اور تم کو  
دھوکہ باز شیطان اللہ سے دھوکہ میں نہ ڈالے۔

اور "انفس" کے تغیر کی طرف فوراً متوجہ ہونا چاہیے اور اس وقت کے انتظار میں نہ رہنا چاہیے جب آفات کا نزول ہونے لگے اور ہمیں مجبوراً ایسا کرنا پڑے۔ عموماً یہی ہوتا ہے کہ ہماری یہ کاری کی وجہ سے ہمارے قلب کی محبوب ترین چیز ہم سے چھین لی جاتی ہے، اور اس وقت ہم شدتِ حزن و

فرطِ غم سے ہر چیز سے ٹوٹ کر حق تعالیٰ کے قدموں پر گر جاتے ہیں اور ہمارے قلب سے چیخ نکلتی ہے۔

اللَّهُمَّ أَنْتَ تَسْمَعُ كَلَامِي وَتَرَى

مَكَانِي وَتَعْلَمُ سِرِّي وَعَلَانِيَتِي

لَا يَخْفَى عَلَيْكَ شَيْءٌ مِنْ أَمْرِي

وَإِنَّا الْبَائِسُ الْفَقِيرُ الْمُسْتَغِيثُ

لِلْمُسْتَجِيرِ الْوَجَلِ الْمَشْفُوقِ الْمَقْرَأِ

الْمُعْتَرِفِ بِذُنُوبِي أَسْأَلُكَ

مَسْأَلَةَ الْمَسْكِينِ وَابْتِهَالِ الْيَاكِ

ابْتِهَالِ لِلذَّنْبِ الذَّلِيلِ لِادْعَاكَ

دُعَاءِ الْخَائِفِ الضَّرِيرِ وَدُعَاءِ

مَنْ خَضَعَتْ لَكَ رَقَبَتَهُ وَ

فَاضَتْ لَكَ عِبْرَتُهُ وَذَلَّ لَكَ

جَسْمَهُ وَرَعَمَكَ انْفِ اللَّهُمَّ

لَا تَجْعَلَنِي بَدْعًا يَكُ شَقِيًّا وَكُنْ

لِي سَرُوفًا رَحِيمًا يَا خَيْرَ الْمَسْئُولِينَ

وَيَا خَيْرَ الْمُعْطِيِينَ !

دکنز العمال عن ابن عباس و عبد بن جعفر

بلا کے نزول کے بعد ہم وہی کرتے ہیں جو نزول سے پہلے بھی رضا و رغبت کے ساتھ کر سکتے

تھے غم و الم کے انکار سے جھلنے کے پہلے اگر ہماری عبادت، کی یہی کیفیت ہوتی تو ہم پر یہ عذاب

ہی نازل نہ ہوتا:

مَا يَفْعَلُ اللَّهُ بِعَذَابِكُمْ إِن شَكَرْتُمْ

اللَّهُ تَعَالَى أَلَمْ يَكُنْ أَكْرَمَ شَاكِرِينَ

وَأَمْنٌ مِّنكُمْ وَكَانَ اللَّهُ شَاكِرًا عَلِيمًا (پ ۸۶) اور ایمان لے آؤ اور اللہ تعالیٰ بڑی قدر کرنے والا اور خوب جاننے والا ہے!

عذاب یا دردناک تجربوں اور مصیبتوں سے بچنے کا طریقہ "ایمان و شکر" ہے، عقیدہ و عمل ہے ایمان باللہ، عمل صالح ہے، یعنی "انفس" کا تغیر ہے، نقطہ نظر کا بدلنا ہے، سیرت کی اصلاح ہے، تقویٰ کا پیدا کرنا ہے، حق تعالیٰ کا دامن پکڑنا ہے، ان کی ہدایتوں پر عمل کرنا ہے، ان کے بتائے ہوئے طریقوں پر چلنا ہے، ہم خود اپنے ہاتھوں اپنی عافیت کے خرمین میں آگ لگاتے ہیں، ہم خود اپنے نفس پر ظلم کرتے ہیں، ہم خود اپنی جانوں کے دشمن ہیں، ہمارے سوا ہمارا کوئی دشمن نہیں، شیخ ابوسعید ابوالخیر نے اس حقیقت کو خوب لکھا ہے:

آتش بد و دست خویش در خرمین خویش چوں خود زده ام چہ نالم از دشمن خویش

کس دشمن من نیست منم دشمن خویش اے وائے من و دست من دامن خویش

اسی لیے حق تعالیٰ نے جو ہمارے مولیٰ ہیں اور سب سے زیادہ خیر خواہ ہیں، ہم سبھوں کو انگلوں اور پچھلوں کو ایک ہی وصیت فرمائی ہے اور وہ یہی ہے کہ ہم تقویٰ کی زندگی بسر کریں۔

وَلَقَدْ وَصَّيْنَا الَّذِينَ أُوتُوا كِتَابَ مِن قَبْلِكُمْ وَإِيَّاكُمْ

کتاب ملی تھی اور تم کو بھی کہ حکم خداوندی کی اطاعت کرو اور

آنِ اتقوا اللہ (پ ۱۶۶) اس کی مخالفت سے بچو یعنی تقویٰ کی زندگی اختیار کرو

# کامیاب زندگی کا قرآنی تصور

۶ تقصیر مکن دانہ خود را شجرے کن (صائب)

کامیاب زندگی! کتنا پاکیزہ، کتنا بلند نصب العین ہے، زندہ دلوں کا مقصود ہے، مطلوب ہے، محبوب ہے، اس کے چہرہ زیب سے ذرا نقاب تو اٹھا دو، دن کی پوری روشنی میں اس محبوب کے خدو خال نظر آئیں اور ہم چیخ اٹھیں۔

دستے کہ پیکر تو بدیں آئے تاب نخت گرد رمت بر آئینہ آفتاب رخت (بخودمانی)  
ورنہ بقول عرفی "خوابِ نادیدہ" کی تعبیر تو کچھ بے معنی چیز ہوگی۔

کامیابی کا لفظ آپ اپنا مفسر ہے، مقصود کا پانا کامیابی ہے، زندگی وہ کامیاب ہے جو اپنے مقصود سے ہم آغوش ہے، اب زندگی کا مقصود کیا ہے؟ بچوں کو سادہ زبان میں سمجھا کر اس سوال کا جواب پوچھو، تو وہ کھیل کود، تماشاء، لہو و لعب ہی کو مقصود زندگی قرار دینگے۔ لیکن جب بیچپن کی منزل سے گزر کر جوانی کی دلفریب وادی میں قدم زن ہوتے ہیں، تو اب ان کا مقصود نئی صورت میں جلوہ افروز ہوتا ہے، اب وہ زیب و زینت، آرائش و زیبائش اور تفاخر کو غایتِ حیات قرار دیتے ہیں، اور اس سے حاصل ہونے والی لذت کو تمام "اقدار" سے بالاتر! التماس کا یہ زمانہ بھی گریز پا ہوتا ہے، اور وہ بہت جلد زینت و تفاخر کو بچپن کی بے معنی خواہش سمجھنے لگتے ہیں۔ جب ان کی عقلوں میں خنگی پیدا ہونے لگتی ہے تو پلٹ کر اپنی حالت پر نظر ڈالتے ہیں، اور کہہ اٹھتے ہیں

اے آنکہ تمام آرزو ہوئی طفلی مستی مخبطی خود چہ کسی! (رفیج واعظ)

۷ مطلوبہ معارف سکھائے



اب زینت و آرائش سے زیادہ ٹھوس قیمتوں کی طرف ان کی نگاہیں اٹھنے لگتی ہیں، وہ مالِ دولت کے نکاح، جاہ و مرتبت کے ترفع کو اپنی زندگی کا مقصود قرار دیتے ہیں، اوز بچپن اور جوانی کی خام آرزوؤں کو ضبط اور مستی سے تعبیر کرتے ہیں، پختہ عقل کی پسند کی ہوئی قیمتیں اب ان کا نصب العین ہوتی ہیں، انہی کے حصول میں وہ شب و روز سرگرم عمل رہتے ہیں، سمجھتے ہیں کہ بس ان کو پا کر وہ سارے عالم سے غنی ہو جائیں گے، طمانیتِ قلب ان کو میسر ہوگی، اور راحتِ جان نصیب! اسی مغالطہ میں ان کی زندگی کے مختصر و معین دن گزرتے جلتے ہیں، رنج و راحت کی مقدر مقدار انہیں ملتی ضرور ہے لیکن اہل کی درازی اور عمر کی کمی بالآخر ان کی زبان سے یہ کہلواتی ہے۔

شد عمر تمام و نامتاً میم ہنوز درد و نوحِ حسرتیم و خایم ہنوز  
 عمریت کہ در راہ طلب گام ز نیم وں طرفہ کہ در نخست گامیم ہنوز (مومن یزدی)

پیری کی منزل میں قدم رکھ کر انسان کی بصیرت میں عموماً روشنی پیدا ہو جاتی ہے، اب وہ زندگی کے مختلف تجربات سے واقف ہو جاتا ہے، ان کے تمام التباسات کو جانتے لگتا ہے اور نظر کا دھوکا جس کا ہر قدم پر جوانی میں وہ شکار ہو رہا تھا، اب اس سراب کو آبِ خوب کو خرابِ عطر کو شراب کہنے اور سمجھنے پر مجبور نہیں کرتا، اب وہ اشیا کے حقائق کا کسی قدر عارف ہو جاتا ہے، زندگی کے گونا گوں تجربات کا ذخیرہ تصورات کی شکل میں اس کے حافظہ میں محفوظ ہوتا ہے، ان ہی سے کام لے کر وہ زندگی کی ماہیت سے واقف ہو جاتا ہے، اس کا تخیل زندگی کو بہری بھری کھیتی کے مشابہ پاتا ہے، جس کی چند روزہ رونق و بہار نظر فریب ہوتی ہے، دلکش ہوتی ہے ہوش رہا ہوتی ہے، فریب خوردہ عقل اس کو دائمی اور مستقل سمجھتی ہے، اس کی پریشانی کے لئے لگتی ہے، اس کو اپنا مطلوب بنا لیتی ہے، اور اس کی گرویدہ ہو جاتی ہے، یکایک اس کھیتی کا رنگ بدلنے لگتا ہے، یہ زرد پڑ جاتی ہے، آدمی اور جانور اس کو روند کر چورا کر دیتے ہیں۔ کَانَ لَمْ تَعْنِ بِالْاَمْسِ!

احوالِ جہاں وصلِ ابنِ عمر کہ ہست خولے وخیلے و فریبے و دے است (خیام)

قرآن کریم نے اس حقیقت کو چند پاکیزہ جملوں میں یوں ادا کیا ہے :-

إِعْمَلُوا إِنَّمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ تم خوب جان لو کہ دنیوی حیات محض لہو و لعب اور

وَلَهُمْ فِيهَا زِينَةٌ وَتَفَاخُرٌ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ زینت اور باہم ایک دوسرے پر فخر کرنا اور اموال

فِي الْأَمْوَالِ وَالْأَوْلَادِ كَمَثَلِ غَيْثٍ واولاد میں ایک دوسرے سے اپنے کو زیادہ بتلانا

أَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَأُهُ ثُمَّ يَهَيِّجُهُمْ فِتْرَاهُ ہر صے میں ہر کہ اسکی پیداوار کا شکاروں کو اچھی

مُصَفَّرًا ثُمَّ يَكُونُ حُطَامًا (پ ۶) معلوم ہوتی ہر پھر وہ خشک ہو جاتی ہر، تو اس کو زرد

(ترجمہ از مولانا اشرف علی تھانوی) دیکھتا ہر، پھر وہ چورا چورا ہو جاتی ہر

ہستوں کے لیے زندگی کا مقصود یا تو لہو و لعب ہے یا زینت و تفاخر، یا تکاثر اموال و اولاد، فلسفیانہ و اصطلاحی زبان میں اس کی تحلیل کرو تو معلوم ہو گا کہ اہل دنیا برترین اقداریا تولذت کو قرار دیتے ہیں یا دولت کو یا شہرت کو، اور دولت و شہرت سے بھی ایک قسم کی لذت و راحت ہی مطلوب ہوتی ہے، اور ان کے نزدیک کامیاب زندگی سے مراد وہ زندگی ہے جو ان اتدر کی تحقیق میں کامیاب ہوتی ہے۔ یہیں ذرا سنجیدگی سے یہاں زندگی کے ان اقداریا غایات کا امتحان کرنا ہے :-

ہشدار کہ راہ خود بخود گم نہ گنی

کیا لذت مقصود زندگی ہو سکتی ہے؟ کیا ہم لذت اندوزی اور دل خوشی کے لیے پیدا ہوئے ہیں؟ کچھ مفکرین کا یہ خیال ضرور رہا ہر، مشرود و رس کا خیال تھا کہ ہر اچھی چیز کا تعلق شکم سے ہوتا ہے اور فرائڈ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ساری کائنات کا محور و مرکز آلہ تناسل ہے، سائینسی مذہب کا بانی ارس بتوس لذت ہی کو مقصود حیات قرار دیتا ہے۔ اپنے پیروں کو اس

لہ اور انسان کی حالت کبھی سے بہتر نہیں جو ہمیشہ حلوے ہی کی شیفٹہ ہوتی ہر :-

ہر جا کہ مگس پر وجہ بالا و پست جز شیفٹہ و ر بودہ حلوانیست (سجالی استریادی)

اس کی تلقین تھی ۷

ہجومنت اعتقاد باید کردن

مخوردن اندوہ جہاں ناخوردن

اپیکورس خوش باشوں کا بادشاہ اپنی اخلاقیات کا اولین محرک جلب لذت اور دفع الم قرار دیتا ہے، لیکن اتنی بات مسلم ہے کہ لذت کو خیر برتر قرار دینے سے اپیکورس کی مراد کسی عیاش کی لذتوں سے تھی نہ شہوانی تعیشات سے بلکہ بدن کا درد و الم سے اور روح کا پریشانی و غم سے نجات دلانا اس کے پیش نظر تھا، فرصت کی زندگی ہو، آلام و افکار سے نجات ہو، دوستی و محبت کا لطف ہو، فلسفے کا مطالعہ ہو، یہ تھے لذت کے تضمینات

اپیکورس کے خیال میں، خیام کی زبان میں ان کو اس طرح ادا کیا جاسکتا ہے ۷

تنکے پر محل خواہم و دیوانے

وانگہ من و تو نشستہ بہ ویرانے

سدر مقلے باید و نصفِ ثانی

خوشتر بود از مملکتِ سلطانی

خود خیام نے جہاں بی وفا کا حاصل لذت کے سوا کچھ نہ پایا، صاحب نظر جب عالم پر غور

کرتا ہے، ہر شے کا جائزہ لیتا ہے، تو اس کو خیام کی رائے میں اقرار کرنا پڑتا ہے کہ ۷

در عالم خاک از کراں تا بکراں

چندانکہ نظر کنند صاحب نظراں

حاصل ز جہاں بی وفا چیزے نیست

آلایے لعل و عارضِ خوش پسراں

ایک روز مرنا ضرور ہے "بے مونس و بے حریف و بے ہمد و جفت" قبر کے گوشے میں سونا

ضرور ہے، اور یہ بھی صحیح ہے گو ایک راز نہفتہ کہ ۷

ہر لالہ پڑ مردہ نخواہد بشگفت!

تو پھر جلب لذت و دفع الم کے سوا زندگی کا مقصود ہو کیا سکتا ہے؟ لذتیت کے اسی

بنیادی اصول کو خیام قوت کے ساتھ پیش کرتا ہے ۷

کم خور غم روزگار نا ساز شدہ

مے خور زلفت ساقی دمساز شدہ

کاں کز کس مادر آمد امروز بروں

فردا بینی بکون زن باز شدہ

کسی راستہ چلنے والے عامی کو روک کر پوچھو کہ وہ دنیا سے کیا چاہتا ہے؟ الفساد کوئی استعمال کرے اس کا مدلول و مفہوم ہوگا وہی جو جلب لذت و دفع الم سے تم سمجھتے ہو! وہ درد و غم سے نجات چاہتا ہے، اور لذت و خوشی کا طلب گار ہے، اشیاء کا اچھا یا بُرا ہونا اس کے نزدیک لذت بخش یا الم رسان ہونا ہے، وہ الم رساں و تکلیف دہ شے کو بُری سمجھتا ہے، اور لذت بخش اور فائدہ رساں چیز کو اچھی! اس کی خواہش کا انتہائی مطلوب کسی نہ کسی صورت میں لذت ہی ہوتی ہے! یہ ہے "نفسیاتی لذتیت" کے حامیوں کی تحقیق اور ادعا، اس نفسیاتی تحقیق سے قطع نظر کر کے کہ انسان ہمیشہ لذت ہی ڈھونڈتا ہے، لذت ہی پر جان دیتا ہے، لذت ہی کو اپنا محبوب قرار دیتا ہے، یہ دعویٰ کہ انسان کو لذت ہی ڈھونڈھنی چاہیے لذت ہی کو اپنا مقصود حیات قرار دینا چاہیے، "اخلاقیاتی لذتیت" کے قائل پیش کرتے ہیں۔

ذرا غور تو کرو کہ کیا یہ بات صحیح ہے کہ انسان صرف لذت ہی کی خواہش کرتا ہے، لذت ہی کی تلاش میں اس کے روز و شب بسر ہوتے ہیں؟ یا اس کو صرف لذت ہی کی تلاش کرنی چاہیے؟ لذت ہی کو اپنی غایتِ قصویٰ قرار دینی چاہیے؟ کیا یہ صحیح ہے کہ

جہان از پئے شادی و دل خوشی است      ناز بہر بیداد و محنت کشی است؟  
یا سچی بات دراصل یہ ہے کہ

نہ ایم آمدہ از پئے دل خوشی      مگر گزیرے رخ و محنت کشی؟

متفکرا ولا تکنونوا من المستعجلین!

لذتیت کی نفسیاتی شکل کا بطلان تو تم پر کھوڑے سے نفسیاتی غور و فکر سے خود ظاہر ہو چکا ہے، دیکھو بات یہ ہے کہ ہماری خواہشات کا مبداء دراصل ہماری احتیاجات ہیں، اشتہات ہیں، ہماری خالص انسانی اغراض ہیں جب ان احتیاجات وغیرہ کی تشفی ہوتی ہے، تو لذت نتیجہ کے طور پر پیدا ہوتی ہے، لہذا کم از کم بعض مثالوں میں تم کو یہ ماننا ہی پڑیگا کہ ہماری خواہشات کا مطلوب اصل میں وہ اشیاء ہیں جن سے ان خواہشات کی تکمیل ہوتی ہے، نہ کہ مجرد لذت، دیکھو، ہمیں پہلے

بھوک لگتی ہے، اور پھر کھانے کی لذت حاصل ہوتی ہے، یعنی اول احتیاج، پھر اس کی تشفی اور نتیجہ کے طور پر لذت، یہی بات تمام لذتوں کے متعلق صحیح ہے، لذت ہماری احتیاجات کی تشفی کے نتیجہ کے طور پر پیدا ہوتی ہے اور احتیاجات کا وجود تشفی سے مقدم ہوتا ہے، اس میں شک نہیں کہ جب اس طرح ہم لذت کی چاشنی سے واقف ہو جاتے ہیں تو بعض دفعہ لذت کی لذت ہی کی خاطر خواہش کرنے لگتے ہیں، مثلاً بھوک کی تشفی سے جو لذت حاصل ہوتی ہے، اس کو جان لینے کے بعد ممکن ہے کہ بغیر بھوک کے لذت ہی کی خاطر نگلنے لگیں، اور اس طرح دانتوں سے اپنی قبر اپنے ہی پیٹ کے اندر رکھ دینے لگیں، اس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ ہر حالت میں ہماری خواہشات کا مطلوب لذت نہیں ہوتا، احتیاج کی تشفی، درد کی دوا، اشتہا کی تسکین ہر فرد چاہتا ہے، اور اس کے نتیجہ کے طور پر اس کو لذت و فرحت محسوس ہوتی ہے، تو لذت بریڈے کے کے الفاظ میں نام ہے تحقق ذات یا تکمیل نفس کے احساس کا، کیونکہ فطری احتیاجات و اشتہات کی تشفی ہی سے ہماری ذات کی بڑی حد تک تکمیل ہوتی ہے، ان احتیاجات میں بدن و ذہن باوجود دونوں کی ضروریات شامل ہیں۔ انہی ضروریات کی تکمیل سے لذت پیدا ہوتی ہے، لہذا خواہش براہ راست لذت سے متعلق نہیں ہوتی لذت براہ راست معروض خواہش نہیں، اور نہ بذات خود ہمارے لیے قیمت رکھتی ہے ہاں اس کو "مقیاس قیمت" قرار دیا جاسکتا ہے بالکل اسی طرح جس طرح کہ تھرمامیٹر کا درجہ حرارت خود حرارت نہیں ہوتا، بلکہ مقیاس انحرارت ہوتا ہے، لذت ہر جسمانی و روحانی اقتضا کی تکمیل کے بعد لاحقہ کے طور پر نمودار ہوتی ہے لیکن خود کبھی مقصود بالذات نہیں ہوتی، اس لیے لذت کا یہ کہنا کہ انسان صرف لذت ہی کی خواہش کرتا ہے، نفسیات کی رو سے صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ اگر ہماری یہ سیدھی سادھی بات تمہاری سمجھ میں نہیں آرہی ہے، تو خود تجربہ کر کے دیکھو، لذت کو مقصود بالذات قرار دو، اور اس کے حصول کی کوشش کرو بہت جلد تم کو معلوم ہونے لگیگا کہ اس طرح لذت کا پانا اپنے سایہ کے پکڑنے سے زیادہ دشوار ہے، یہ عجیب بات ہے، اور ہر تجربہ کار لذت پرست کو شاید اس کا اقرار ہے، (فلاسفہ اس کو "استیعاد لذتیت" کے نام سے موسوم



کرتے ہیں، کہ لذت کی جتنی تلاش کرو اتنی ہی وہ بے تکلفی ہے، جتنی زیادہ اس کی خواہش کرو اتنی ہی وہ کم ملتی ہے، اور جس قدر بے پروا اس کی طرف سے ہو جاؤ، اسی قدر وہ تمہارے پیچھے دوڑتی ہے، پروفیسر ڈیویس کے یہ الفاظ حکیمانہ صداقت کے حامل ہیں :-

جب جذبہ کارجان باطن کی طرف ہوتا ہے، تو وہ اپنی فنا کا آپ باعث ہوتا ہے، اور اس کے نتیجے کے طور پر انسان یا تو کلیت اختیار کر لیتا ہے اور سرد و قوی میں مبتلا ہو جاتا ہے، یا پھر ہر لحظہ نئی چیز کی تلاش میں رہتا ہے، جدید ترین احساس کا خواہشمند ہوتا ہے، جو اس کی پست اور در ماندہ جذباتی فطرت کو اکسائے، اور اس میں نئے نئے سرے سے جان ڈالے، اگر کوئی شخص محض جتنی زندگی بسر کر کے اپنے وجود کے قوانین کو توڑتا ہے، اور ان اشیاء سے بے نیاز ہونا چاہتا ہے جن کے ساتھ یہ احساسات طبعاً پائے جاتے ہیں تو اس کی قوتِ احساس رفتہ رفتہ مضمحل ہو جاتی ہے، اور وہ اپنے مقصد کی شکست کا آپ باعث ہوتا ہے، وہ جذباتی خودکشی کا مرتکب ہوتا ہے۔

اسی صداقت کا علم ہونے کے بعد سیرینیا اور انتاباع اسپیکورس نے یہ مان لیا کہ ایجابی لذت کا حصول انسان کے لیے ناممکن ہے، ان کی لذتیت میں قنوطیت کی جھلک پیدا ہو گئی اب وہ بجائے حصولِ لذت کے دفعِ الم کو مقصدِ حیات قرار دینے لگے، اسپیکورس کا یہ قول مشہور ہے جو چیزیں زندگی کو مسرور بناتی ہیں، وہ نہ سیم شرب مدام ہے اور نہ صنف نازک کی صحبت اور نہ مرغِ واہی اور قیمتی ماکولات سے آراستہ کیے ہوئے دسترخوان بلکہ سنجیدہ و متین غور و فکر جو ہر عملِ انتخاب و اجتناب کے اسباب و وجوہ کا امتحان کرتا ہے، اور ان بہودہ خیالات و اوام کو دور کرتا ہے، جو روح کی پریشانی اور اختلال کا باعث ہوتے ہیں۔

پیچھے :-

۲۹۹ ص ۲۹۹ لے دیکھو بیک ول کی کتاب *The Source Book of Ancient Philosophy* ص ۲۰۰ مقابلہ کرو راقم کی کتاب *فلسفہ یاس* ص ۸۹۔

اصلاح مزاج از ضروریات است یک تنقیہ دماغ می باید کرد! (واقف)

ارسطی بوس کا مشہور پیرونگے سیس (Hegasius) لذت کو مقصود حیات قرار دیتا ہے، اور اس کی طلب میں کوشاں ہوتا ہے، بہت جلد تجربہ اس کو سکھاتا ہے کہ بارغ جہاں میں غم ہی کا تو میوہ ہر شخص کو نصیب ہوتا ہے، اور اگر کوئی بے غم ہے تو وہ بنی آدم نہیں، طرفہ جانور ہے!

عالم ہمہ دردست درو میخواید از خوانِ کرم برگ و نوا میخواید  
کس بے حاجت نمی تواند دیدن درویشِ غذا شدہ اشتہا میخواید (سجائی استر آبادی)

جب لذت مقصود حیات اور وہ ناقابل حصول تو پھر زندگی کی کوئی قیمت نہیں ہو سکتی، دنیا استخوانِ بے مغز ہے، عاقل اس استخوان کو کتوں کے آگے پھینک دیتا ہے، موت کو زندگی پر ترجیح دیتا ہے، موت ہی میں راحتِ جان پاتا ہے، موت ہی سے سائے درد و الم رفع ہو جاتے ہیں، اور غم و ہم دور! ایجابی لذت ناقابل حصول، لیکن سلبی لذت ممکن اور وہ موت کے ذریعہ، لہذا

با چرخِ ستیزہ کار مستیز و برو با گردشِ دہر در میا میز و برو  
یک کاسہ زہر است کہ مرگش خواند خوش درکش و جرعه در جہاں نیر و برو (امیرالبحرین)

یہ تھا استدلالِ بگے سیس کا، اور اس قوت و اثر کے ساتھ یہ پیش کیا گیا، کہ لوگوں نے خود کشی شروع کر دی اور اس کو "داعی الی الموت" کا خطاب دیا، جو لوگ زندگی کا مقصد و حید لذت اندوزن اور ذواقیت کو قرار دیتے ہیں، انہیں اسی طرح استدلال کرنا پڑے گا۔

لذتیت سے قنوطیت ایک ہی قدم کا فاصلہ ہے، جب لذت پرستوں کا تجربہ یہ ہو تو بتاؤ کہ ۶

باقیہ مستورہ لذت چہ کند کس؟

اخلاقیاتی لذتیت کے حامیوں کا یہ دعویٰ کہ لذت ہی کو زندگی کی غایتِ قصویٰ

قرار دینا چاہیے، دیوانگی نہیں تو کیا ہے؟ نہیں لذت زندگی کی غایت نہیں، عقلمند لذت کی ماہیت و مقام سے واقف ہوتا ہے، طیباتِ حیات کو حقارت کی نگاہ سے نہیں دیکھتا لیکن وہ زندگی کا مقصود لذت اندوزی نہیں قرار دیتا، مجرد لذت کا کبھی تعاقب نہیں کرتا اس کو موجِ سراب اور جوشِ حباب سمجھتا ہے، اور اس کے دھوکے میں نہیں آتا۔ ۶

إِنَّ اللَّيْبِ بِمِثْلِهَا لَا يَخْدَعُ

وہ اپنے مقصود کے حصول میں سرگرم عمل ہوتا ہے اور مسرت خود سایہ کی طرح اس کا پیچھا کرتی ہے، مقصود کے حصول میں اس کا ہر عمل لطف انگیز، ہر حرکت فرحت بخش ہوتی ہے، جانتے ہو کہ یہ مقصود کیا ہے؟ رضائے حق! حق تعالیٰ ہی سے اس کو آرامِ جاں اور بردِ قلبی نصیب ہوتی ہے اور عارفِ روم کے ساتھ مل کر وہ لذت سے کتنا ہے۔

گر گریزی بہ اُمیدِ راحتی ہم از آنجا پیشت آید آفتی  
ہیچ کنبے بے درد و بے دام نیت جز بخلوت گاہِ حق آرام نیت

جب لذت مقصودِ زندگی نہیں تو کیا شہرت یا اشتہارِ خلق، جاہ و مرتبت نام و نمود وہ اعلیٰ اقتدار ہیں جن کا حصول زندگی کی غایت قرار دیا جاسکتا ہے؟ ہم میں سے بہت سارے ایسے ہیں جنہیں زبان کی لذت سے کان کی لذت زیادہ مرغوب معلوم ہوتی ہے، وہ اس لطیف لذت کے لیے اپنی تمام کثیف لذتوں کو قربان کر لے پر تیار ہو جاتے ہیں، مصائب میں گرفتار ہونے سے نہیں گھبراتے، درد و غم برداشت کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں، آفتوں اور خطروں کا مقابلہ کرتے ہیں، جب ان سے کہا جاتا ہے کہ شہرت کی قیمت بلا و مصیبت ہے تو بھی ان کی ہمت پست نہیں ہوتی، ان کے لیے شہرت غایت الغایات ہے، خیر برترین ہی مطلق قیمت ہے، اضافی قیمت نہیں!

شہرت کی خواہش ہر انسان میں کسی قدر ضرور موجود ہوتی ہے، اس کا راز یہ ہے کہ انسان کا نفس تنقیص کو فطرۃً ناپسند کرتا ہے، اور علو و بلندی کو طبعاً پسند! بندہ ہونا اس کے

نفس پر شاق ہوتا ہے، ربوبیت طبعاً محبوب ہے، ہر شخص کے باطن میں وہ جذبہ موجود ہے جس کی تصریح فرعون نے اپنے اس قول سے کی تھی "انارثکم الا علی" اس کی رفعت کا جب لوگ اقرار کرتے ہیں، تو وہ خوش ہوتا ہے، بقول عارفِ روم، فریب ہوتا ہے:-

جانور فریب شود از راہِ نوش آدمی فریب شود از راہِ گوش

شہرت کا طالب دراصل لذت ہی کا پجاری ہے، اس کا معبود بھی ایک قسم کی لذت ہی ہے، وہ اپنے نفس کی کبریائی کا اعلان چاہتا ہے، تشہیر چاہتا ہے اور اس کو حاصل کرنے کے لیے ہر قیمت کو ادا کرنے پر تیار ہوتا ہے۔

اب غور کرو وہ اپنی مسرت، اپنی بردِ قلبی کی عمارت کس بنیاد پر قائم کر رہا ہے، ہوا پر تعریف جو خلق کی زبان سے نکل رہی ہے، وہ آخر ہوا ہی تو ہے، جس کا حقیقت سا جھوٹا بھی ہمارے بیمار شہرت کے دل کے غنچے کو شگفتہ کر دیتا ہے، مگر کیا کوئی عقلمند اپنی مسرت کے قلعہ کو اس قدر کمزور بنیادوں پر قائم کریگا؟ کیا ہوا پر اس کا اقتدار ہے؟ کون جانتا ہے کہ آج ہوا کا رخ کس طرف ہوگا؟ عوام کا لانعام آج اپنے ہیرو کو اور ج آسمان پر جگہ دیتے ہیں اور کل بغیر کسی وجہ کے خاکِ مذلت پر پٹک دیتے ہیں، آج تحسین و تصفیق ہو اور کل زبرد تویح، اور کچھ دن بعد مطلق ذہول اور فراموشی، یہ ہے المناک تجربہ تقریباً ان تمام پرستارانِ شہرت کا جنہیں عوام نے کچھ دن کے لیے بت بنا کر پوجا تھا، ولنکٹن و اٹرلو کا فاتح اعظم نیپولین کو شکست دیتا ہے، اپنے زمانہ کی تہذیب و تمدن کو غارت و برباد ہونے سے بچا لیتا ہے، عوام اس کو سزا نکھوں پر بٹھاتے ہیں، بطل اعظم کا خطاب دیتے ہیں، اور کچھ ہی دن بعد لندن کی گلیوں میں یہی مشتعل و غضب آلود مجمع پتھروں سے اس کے خود کو توڑ پھوڑ ڈالتا ہے، جس کو ولنکٹن اپنی موت کے دن تک محفوظ رکھتا ہے۔ جوئیس سیزر ایک دن دنیا پر حکومت کرتا ہے اور دوسرے دن احسان فراموش دوستوں کے ہاتھ موت کے گھاٹ اُتار دیا جاتا ہے۔ سکندر اعظم کی لاش تیس دن تک بے گور و کفن پڑی رہتی ہے، اس کو عزت کے ساتھ خاک کے سپرد کرنے کو

بھی کوئی نہیں ملتا، یہ ہے انجام ہر شہرت و رفعت کا!

گرم پیرا کہ رستم و شام شدی      یا خسرے نیمروز یا شام شدی  
نہ زور گوری توں برد نہ زر      افسوس کہ کیمیا کے اوہام شدی

شہرت کا اثر سیرت پر کیا ہوتا ہے؟ شہرت سے عجب و پندار پیدا ہوتا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان اپنی ہی ذات کو کبیر اور سائے عالم کو اپنے مقابلہ میں حقیر سمجھتا ہے! مقید ہو کر مطلق ہونے کا دعویٰ کرتا ہے، بندہ ہو کر خدا بنتا ہے، جب اس کو خدا سے ڈرایا جاتا ہے تو اپنے تکبر اور عزت کے گھنٹے میں حدود اللہ سے تجاوز کرتا ہے۔ **وَإِذَا قِيلَ لَهُ اتَّقِ اللَّهَ أَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْإِثْمِ** (پ ۹۶۲) جس شخص کا دماغ اس قدر اُلٹ جائے اس کو مسرت و طمانیت قلبی کہاں نصیب ہو سکتی ہے؟ اس کو ہر قدم پر خلاف طبیعت عناصر سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے، کوئی اس پر طعن کرتا، اور کوئی حسد، کوئی اس کو قطرہ آب گندہ کہتا ہے، اور کوئی طرفہ جانور اس کا ہر عیب دنیا کے سامنے نمایاں طور پر پیش کیا جاتا ہے، اس کی کوئی غلطی لوگوں کی نگاہوں سے چھین سکتی شہرت کی وجہ سے گویا وہ آفتاب کے نیچے کھڑا ہوتا ہے، اور اس کا ہر نقص اب نمایاں ہی اور بقول عارف روم اس کی حالت یہ ہوتی ہے۔

خستہما و چشمہا و اشکھا!      برسرت ریزد چو آب از مشکھا!

ایک آرزوئے شہرت، تمنائے رفعت، خواہشِ علو اس کو ہزاروں غموں اور آفتوں میں مبتلا کرتی ہے، اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ وہ حق سے کٹ کر خلق سے اپنا رشتہ جوڑتا ہے، اور خلق سے سوائے غم و اندوہ کے اور کیا ہاتھ آسکتا ہے، وہ خلق کے قلوب کو ہمیشہ مسخر رکھنا چاہتا ہے، ان پر اعتماد کرتا ہے، سمندر کی موجوں پر گھر بنا رہا ہے اور سمجھتا ہے کہ اس کا پائدار اور مستقل ہے، فی اللعجب! خلق کے وعدوں سے وہ خوش ہوتا ہے، لیکن اس کی خوشی کی مدت ایک رات سے زیادہ نہیں۔

وعدہ ارباب دنیا ہجو خوابِ احتلام      شب ہر شب عیش و عشرت باشد فردا دروغ



ایسے احمق پر ترس آتا ہے، مگر اس کے مقصودِ حیات کو کوئی عاقل اپنی زندگی کا مقصود بنانا پسند نہیں کرتا۔

نہیں، ہم محض حصولِ جاہ کو زندگی کی غایت نہیں قرار دے سکتے، اس میں گو کسی قدر لذت ضرور ہے، لیکن یہ غیر مخلوط لذت نہیں، درد و آفت، رنج و مصیبت کا عنصر اس مرکب میں بہت زیادہ ہے، یہ انسان میں کبر و غرور پیدا کرتا ہے، اور متکبر نہ دنیا میں راحت و طمانیت پاسکتا ہے، اور نہ آخرت میں فوز و کامیابی، وہ دل کا اندھا ہوتا ہے، حق تعالیٰ کی نشانیوں کی پہچان سے محروم رہتا ہے، حق بات اس کو نظر نہیں آتی، حق کی طرف سے اس کی آنکھیں بند ہو جاتی ہیں، جب دید حق نہ رہے تو پھر اس میں پوست کے سوارہ کیا جاتا ہے؟

آدمی دیدت و باقی پوست ست      دیداں باشد کہ دید دست است (رومی)  
 سا صرف عن اياتي الذين  
 میں ایسے لوگوں کو اپنی نشانیوں سے برگشتہ ہی  
 يتكبرون في الارض بغير  
 رکھو گا جو دنیا میں تکبر کرتے ہیں، جس کا ان کو کوئی  
 الحق (پ ۶۹)

اسی کی طرف اشارہ ہے، اور اسی وجہ سے وہ حق تعالیٰ کا مبغوض ہو جاتا ہے۔ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْتَكْبِرِينَ! جب دید حق کھو چکا، حق تعالیٰ کا مبغوض قرار پا چکا، تو پھر اس کے ہلاک ہونے میں باقی کیا رہا، امانیت، اپنی ذات سے محبت اپنے ہی ذکر کے انتشار کی خواہش، اپنی ہی تعریف کی محبت اور اس سے پیدا ہونے والی لذت، یہی تو ہیں اجزاء اس کی ہلاکت اور بربادی کے! اسی لیے نفس انسانی کے امراض سے پوری طرح واقفیت رکھنے والے حکیم نے فرمایا تھا کہ

انما هلاك الناس باتباع      ہوئی دہوس کی پیروی اور اپنی تعریف و توصیف  
 الهوى و حبت التناء      کی محبت لوگوں کی ہلاکت کا باعث ہوتی ہے۔

ایک اور طریقے سے اسی صداقت کا اظہار شدت کے ساتھ فرمایا گیا ہے۔

ذئبان ضاربان ارسلانی ذرۃ  
دو بھیڑیے حملہ کرنے والے جو بھیڑوں کے گلے  
غنم لیسابا اکثر فسادا من حب  
میں چھوڑ دیے جائیں اتنا نقصان نہیں کرتے  
الشرع والمال فی دین الرجل  
جتنا کہ شرف اور مال کی محبت مسلمان آدمی کے  
(المسلم) دین میں کرتی ہے۔

اسی حب الشرف سے ارادہ رخصت یا ارادہ علو پیدا ہوتا ہے، اور جب تک انسان اس سے خالی نہیں ہوتا، اپنی آخرت درست نہیں کر سکتا۔

تِلْكَ الدَّارُ الْآخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِينَ  
یہ عالم آخرت ہم ان ہی لوگوں کے لیے خاص کرتے  
لَا يُرِيدُونَ عُلُوًّا فِي الْأَرْضِ وَلَا  
ہیں جو دنیا میں نہ بڑا بننا چاہتے ہیں اور نہ فساد کرنا  
فَسَادًا وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ (پ ۱۲)

اور نیک نتیجہ متقی لوگوں کو ملتا ہے۔  
کہا جاتا ہے کہ حضرت خلیفہ عمر بن عبدالعزیز اس آیت کو مرنے وقت پڑھتے تھے، یہاں تک کہ پڑھتے پڑھتے جان دی!

خوب سمجھ لو کہ ہم حصول کمال سے نہیں منع کر رہے ہیں، ہم علم میں منفرد با کمال ہونے کی آرزو کو جائز سمجھتے ہیں، ہم کمال حریت یعنی شہوات و جذبات سے آزادی، ذنبوی ترددات سے نجات کو حقیقی کمال قرار دیتے ہیں، ہم حق تعالیٰ اور ان کے صفات و افعال، الکیت و حاکمیت کے علم کو سب سے زیادہ اعلیٰ و حقیقی کمال سمجھتے ہیں، اور ہمارے عقیدے کی رو سے یہ علم یہ معرفت عارفین کے لیے مرنے کے بعد نور بنیگی یہ

نُورُهُمْ يَسْعَىٰ بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَيُؤْتِيهِمُ  
ان کا نور ان کے سامنے اور ان کے سامنے دوٹوتا  
يَقُولُونَ رَبَّنَا أَتْمِمْ لَنَا نُورَنَا  
ہوگا، یوں دعا کرتے ہونگے کہ اے ہمارے پروردگار

ہمارے لیے ہمارے اس نور کو آخر تک رکھ۔ (پ ۲۸ ع ۲۰)

۱۰ دیکھو مذاق العارفین ترجمہ احیاء العلوم جلد سوم ص ۲۷۹۔

اور جو اس نور معرفت سے بے بہرہ ہونگے ان کا حال اس شخص کا سا ہوگا، جو اندھیروں میں پڑا ہے۔  
 کمین مثله فی الظلمات لیس اس شخص کی طرح جس کی حالت یہ ہو کہ وہ تاریکیوں  
 بخارج منها (پ ۲۷) میں ہے، ان سے نکلنے ہی نہیں پاتا۔

ہم اس جذبہ کی مذمت کر رہے ہیں، جس کی وجہ سے کمال کے پیدا ہونے کے بعد ایک شخص اپنی  
 ذات کو کبیر اور سارے جہان کو حقیر و صغیر سمجھتا ہے، یا پھر کمال اس لیے حاصل کرنا چاہتا ہے  
 کہ لوگوں کے دلوں اور جسموں پر حکومت کرے، اور اس سے حاصل ہونے والی لذت و خوشی  
 کو اپنی زندگی کا مقصود قرار دے، اس خصوص میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دعا کی  
 صورت میں سیدھے راستے کی تعلیم فرمادی تھی۔

اللَّهُمَّ اجْعَلْنِي صَبُورًا وَشَكُورًا وَحَقَّ تَعَالَى تَجِبْ صَابِرًا وَشَاكِرًا، مجھے اپنی آنکھوں میں  
 اجْعَلْنِي فِي عَيْتِي صَغِيرًا وَفِي آعِينِ صَغِيرًا كَمَا دُرُورًا لُغُوْنِي فِي كَبِيرًا،  
 صغیر رکھ اور لوگوں کی آنکھوں میں کبیر بنا۔  
 لِلنَّاسِ كَبِيرًا

جب میں خود اپنی آنکھوں میں حقیر رہوں، اپنی بندگی و بیچارگی کو بھول نہ جاؤں، اپنی ظلمت و  
 جہل سے باخبر رہوں، تو پھر مجھ میں نہ اپنی تعریف کی خواہش پیدا ہوتی ہے، اور نہ کبر کا مذموم  
 جذبہ، اب حق تعالیٰ اپنے اس متواضع بندہ کو رفعت عطا فرماتے ہیں، اور حقیقی کمال سے حصہ  
 وافر ایہ بزرگی اور کمال کا عطیہ ہے اور اس کا استعمال معطی کے احکام کے مطابق ہی کیا  
 جاسکتا ہے۔

مقصود حیات اگر شہرت یا اشتہارِ خلق نہیں تو کیا مال و دولت کو زندگی کی انتہائی غایت  
 قرار دیا جاسکتا ہے۔

اس امر میں شاید کسی کو ہم سے اختلاف نہیں ہوگا کہ مال ہمیشہ ایک ذریعہ ہے کسی غایت کے  
 حصول کا، خود غایت نہیں، ہم نے ان غایات میں سے بعض پر اوپر بحث کی ہے، اور ان کو

لے یہ دعا حضرت بریدہ کی روایت سے مسند بزار میں ملتی ہے۔

زندگی کا مقصود نہیں قرار دیا، یعنی اگر مال سے جاہ طلبی یا لذت اندوزی مقصود ہو تو پھر مقصود کے ابطال سے ذریعہ کا باطل ہونا بھی لازم آئیگا، اور اگر جائز مقصد حیات کے حصول میں یہ استعمال ہو تو پھر یہ ایک زبردست قوت ہے اور عظیم الشان نعمت ہے۔

مال را گر بر دین با شتی جمول نعم مال صراح گفتش رسولؐ

اب ہمیں زندگی کے حقیقی مقصد کے تعین کی طرف توجہ کرنی چاہیے۔ قرآن کریم کی ہدایت کی روشنی میں مقصود حیات کا تعین ضروری ہے، حق تعالیٰ کی معرفت اور ان کی عبادت جہان کی تخلیق کی غایت ہے صریح ارشاد ہے، مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ

عبادت بغیر عرفان حق کے ممکن نہیں، لہذا وحدت ذاتیہ حق کی معرفت اور اس کی عبادت کے سوا جہان کا کوئی مقصود نہیں، ہر نبی اور ہر رسول کے پیغام کا خلاصہ بس یہی تھا۔

يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُمْ مِنْ  
إِلٰهِ غَيْرِهِ (پ ۵۷)

تمہارا کوئی معبود اور رب نہیں۔

جاتی نے اس مقصود کو ان دل پذیر اشعار میں ادا کیا ہے :-

از زندگیم بندگی تست ہوس بر زندہ دلاں بے تو حرام ست نفس

خواہد ز تو مقصود دل خود ہر کس جاتی ز تو ہمیں ترا میخواستد بس

زندگی کا مقصود، برترین مقصود، غایت الغایات حق تعالیٰ ہیں، ان کی یافتہ ہے، ان کی عبادت و بندگی ہے، ان کا عشق و محبت ہی، یا یوں کہو کہ ہماری ساری عبادت، ہمارا جینا اور ہمارا مرنا سب خالص حق تعالیٰ ہی کے لیے ہے :-

قُلْ إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ

وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ لَا شَرِيكَ

لَهُ وَبِذَلِكَ أُمِرْتُ وَأَنَا أَوَّلُ الْمُسْلِمِينَ

(پ ۷۷) (ترجمہ مولانا اشرف علی تھانوی) اور میں سب ماننے والوں سے پہلا ہوں۔

لے حضرت ابن عباس نے ليعبدون کی تفسیر ليعرفون سے کی ہے۔ ۱۲۔

حق تعالیٰ ہمارے مقصود ہیں، اسی لیے ہمارے محبوب و مطلوب بھی۔

وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ اور جو مومن ہیں ان کے ساتھ نہایت قوی محبت

رپ ۲۶۲ - ۷ -

وہ ہماری جان و مال، فرزندوں سے زیادہ عزیز و محبوب ہیں۔

خواہم کہ ہمیشہ درہموائے تو زیم خاک کے شوم و بزیر پائے تو زیم

مقصود میں خستہ زکونین توی از بہر تو میرم و برائے تو زیم

جب زندگی کا مقصود حق تعالیٰ ہیں، تو اب دیکھو کہ وہ ہماری اس زمینی زندگی کو کس طرح

بسر کرنے کا حکم دے رہے ہیں۔ پہلے اجال، پھر تفصیل۔

اجالائیوں سمجھو کہ جب حق تعالیٰ ہمارے معبود ہیں اور محبوب ہیں تو ہمارا کام ایسا ہونا

چاہیے کہ وہ کسی نہ کسی طرح عبادت میں شامل ہو جائے، یعنی ان ہی کے امتثال امر میں ہو،

ان ہی کی رضا مندی و خوشنوی کے خاطر موافقت و ہوا کی پیروی میں نہ ہو، یعنی لذت اندوزی

کے لیے نہ ہو، عیش پرستی کے لیے نہ ہو، جاہ طلبی کے لیے نہ ہو، ہمارے قلوب پر مالکیت و حاکمیت

اللہ کی ہو، غیر اللہ کی نہ ہو، اور ہمارے فعل کا تعین امر حق سے ہو، نفس و شیطان کے حکم سے نہ

ہو، ایسی زندگی قرآن کی اصطلاح میں تقویٰ کی زندگی ہے، اور یہی کامیاب زندگی ہی اقبال

کے ہم دیدی الفاظ کا اس جگہ ذکر کرنا ضروری ہے، یہ اپنے الفاظ میں تقویٰ کی زندگی اور کامیاب

زندگی کا خلاصہ پیش کر رہے ہیں۔

دلے مالے دلے این دیر کہن تیغ لاد رکف نہ تو داری و نہ من

دل ز غیر اللہ بہ پردازے جواں این جہان کہنہ در بازے جواں

تا کجا بے غیرت دین زیستن اے سلمان مردن مست این زیستن

مرد حق باز آفریند خویش را جز بہ نور حق نہ بیند خویش را

بر عیار مصطفیٰ خود را زند تا جہلے دیگرے پیدا کند



اب ذرا تفصیل میں جا کر تقویٰ کی ماہیت کو اچھی طرح سمجھ لو قرآن میں متقیوں کی تعریف اجمالاً یوں کی گئی ہے۔

مَا الَّذِي جَاءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ  
بِهِ أَوْلِيَاكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ (پ ۱۷۷)

جو سچی بات لے کر آیا، اور جس نے اس کو سچ مانا، وہی لوگ پرہیزگار یا متقی ہیں۔

جو سچی بات لے کر آیا وہ نبی اور جس نے سچ مانا وہ مومن و متقی، تقویٰ نبی کو سچ ماننا اور اس کی تصدیق کرنی ہے، حق تعالیٰ انبیاء ہی کے ذریعہ علم صحیح عطا فرماتے ہیں، انبیاء اللہ ہی کے علم کو پیش کرتے ہیں، اپنی طرف سے اس میں کسی قسم کی نہ زیادتی کرتے ہیں اور نہ کمی، جو لوگ اس پر ایمان لاتے ہیں، اور اس کے مطابق عمل کرتے ہیں، وہی متقی کہلاتے ہیں۔

تقویٰ کی کچھ تفصیلات کو اس آیت میں پیش کیا گیا ہے۔

لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُولُوا وَجُوهَكُمْ قِبَلَ  
الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلَكِنَّ الْبِرَّ مَنْ  
آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَالْمَلَائِكَةِ  
وَالْكِتَابِ وَالنَّبِيِّينَ وَآتَى الْمَالَ عَلَى  
حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَ  
الْمَسَاكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ وَالسَّائِلِينَ  
وَفِي الرِّقَابِ وَأَقَامَ الصَّلَاةَ وَآتَى  
الزَّكَاةَ وَالْمُؤْمِنُونَ بِيَهْدِهِمْ إِذَا  
عَاهَدُوا وَالصَّابِرِينَ فِي الْبَأْسَاءِ  
وَالضَّرَّاءِ وَحِينَ الْبَأْسِ أُولَئِكَ  
الَّذِينَ صَدَقُوا وَأُولَئِكَ هُمُ  
الْمُتَّقُونَ (پ ۱۷۷)

کچھ سارا کمال اسی میں نہیں کہ تم اپنا منہ مشرق کو کر لو یا مغرب کو، لیکن کمال تو یہ ہے کہ کوئی شخص اللہ پر یقین رکھے اور قیامت کے دن پر اور فرشتوں پر اور کتب پر اور پیغمبروں پر اور مال دیتا ہو اللہ کی محبت میں رشتہ داروں کو اور یتیموں کو اور محتاجوں کو، اور مسافروں کو اور سوال کرنے والوں کو اور گردن چھڑانے میں، اور نماز کی پابندی رکھتا ہو، اور زکوٰۃ بھی ادا کرتا ہو، اور جو اشخاص اپنے عہدوں کو پورا کرنے والے ہوں جب عہد کر لیں، اور وہ لوگ مستقل رہنے والے ہوں تنگدستی میں اور بیماری میں اور قتال میں یہ لوگ ہیں جو سچے ہیں اور یہی لوگ ہیں جو متقی ہیں۔

(ترجمہ از مولانا اشرف علی تھانوی)

(پ ۱۷۷)

اس آیت کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے، کہ تقویٰ کا انحصار چند عقائد، اعمال اور اخلاق پر ہے، عقائد میں اللہ پر، آخرت پر، ملائکہ پر، کتب منزلہ پر، اور انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام پر ایمان لانا داخل ہے، یہ تقویٰ کے اساس ہیں، عمل کا صدور ایقان و ایمان سے ہوتا ہے، متقی کے ایقانات جن کا نتیجہ اعمال صالح ہیں، یہ ہونے چاہئیں جن کی تفصیل بیان کی گئی ہے، اس کے بعد ان اعمال کی بھی کسی قدر تفصیل پیش کر دی گئی ہے۔ ان کی تین قسمیں کی گئی ہیں۔ انفاق، اقامتِ صلوٰۃ و ایاتے زکوٰۃ، انفاق رشتہ داروں، یتیموں، محتاجوں، مسافروں سوال کرنے والوں کے لیے ہو، اور قیدیوں کے چھڑانے میں کیا جائے، انفاق کی شرط مقدم حق تعالیٰ کی محبت ہے، یعنی جو کچھ خرچ کیا جا رہا ہے، وہ ان ہی کی محبت میں خرچ کیا جا رہا ہے، ان ہی کی خوشنودی و رضا کی خاطر، اس لیے نہیں کہ نام ہو، شہرت ہو، لوگوں کی نگاہوں میں برتری حاصل ہو، اخلاق میں ایقانے عمد اور صبر کا خصوصیت کے ساتھ ذکر ہے، صبر تنگدستی میں، بیماری میں اور کفار کے ساتھ جنگ میں

تقویٰ کے متعلق دوسری تمام قرآنی تصریحات کو پیش نظر رکھ کر حضرت امام غزالیؒ اس کی جامع و مانع تعریف یوں کرتے ہیں کہ تقویٰ بچپن سے ہر اس شے سے جس سے دین میں ضرر کا خوف ہو، محاورہ عرب سے بھی اس تعریف کی تائید ہوتی ہے، کیونکہ جو بیمار پرہیز کرتا ہے اس کو عرب "متقی" کہتے ہیں، اس لیے کہ وہ ہر مضر چیز سے خواہ کھانے کی ہو یا پینے کی بچتا ہے اسی طرح دین کا تقویٰ تو اسی سے اجتناب ہے حضرت غزالیؒ کی اس تعریف میں امتثالِ مامور یا عبادت پر زور نہیں دیا جا رہا ہے، بلکہ صرف اجتنابِ محظور یا گناہوں سے پرہیزی کی تاکید کی جا رہی ہے۔ منہاج العابدین میں وہ کسی جگہ فرماتے ہیں، کہ عبادت کے دو بڑے حصے ہیں، ایک عبادت کرنا، دوسرا پرہیز کرنا، اور یہ آدھا حصہ یعنی گناہوں اور شہوات سے پرہیز انسان کے لیے پہلے آدھا حصہ یعنی عبادت سے زیادہ بہتر ہے، بتدی عبادت کے حصہ پر زیادہ زور

لے دیکھو منہاج العابدین ص ۵، (مطبوعہ زلکشور)

دیتا ہے، اور کامل اہل بصیرت پر بہیز کا حصہ اختیار کرتے ہیں، اور ان کو ہر وقت یہ دھیان رہتا ہے کہ دل کو غیر اللہ کی طرف مائل ہونے سے بچائیں، لیکن اگر دونوں حصے حاصل ہو جائیں یعنی عبادت و پرہیز تو کمال حاصل ہوتا ہے، اور سلامتی اور غنیمت میسر ہوتی ہے۔

عبادت کے دونوں حصوں کا خیال رکھ کر تقویٰ کی جامع و مانع تعریف اس طرح کی جاسکتی ہے، تقویٰ کفر و شرک و نفاق و بدعت سے احتراز ہے، امثال مامور، اجتنابِ مخطور اور رضا بمقدور ہے، متقی کا قلب ایمان و توحید و صدق سے آراستہ ہوتا ہے، سنت پر قائم ہوتا ہے، اور امر کا اتباع کرتا ہے، نواہی سے بچتا ہے، راضی برضا حق رہتا ہے، اسی چیز کو حضرت غوث اعظم شیخ عبدالقادر جیلانیؒ اس طرح ادا فرماتے ہیں: لَا يَدَّ لِكُلِّ مُؤْمِنٍ فِي سَائِرِ اَحْوَالِهِ مِنْ ثَلَاثَةِ اَشْيَاءَ: - امرٌ يَمْتَنَلُهُ وَنَهَى يَجْتَنِبُهُ وَقَدِيرٌ يَرْضَى بِهِ - یعنی ہر مومن کے لیے تمام احوال میں تین چیزیں ضروری ہیں، امر الہی بجالائے، نہی سے اجتناب کرے، اور تقدیر پر راضی رہے۔ اتنی بات یہاں سمجھ لینی ضروری ہے کہ امر الہی دو طرح پر ہوتا ہے، ایک تشریحی، یہاں وظیفہ عبودیت پر ہے کہ اس امر کو بجالائے اور امر منفی کی صورت میں ممنوعات سے بچے، دوسرا تکوینی، یہاں بندگی کا وظیفہ ہے کہ اس کو تسلیم کرے، رضا بالقضار کا اشارہ اسی طرف ہے۔ بالفاظ دیگر جو حق تعالیٰ کہیں وہ کہے اور جس طرح وہ رکھیں اس طرح رہے اول عبادت ہے، اور ثانی عبودیت "ایسی ہی زندگی تقویٰ"

۱۹ دیکھو سراج السالکین ترجمہ منہاج العابدین ص ۱۱۹

۲۵ احتراز کا ذریعہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ ہے، ذات اللہ ہی کو الہ قرار دینا یعنی مہبود و مستعان، مانا زبان سے اقرار اور دل سے تصدیق کرنا توحید ہے، اس اقرار سے شرک کا خروج ہو جاتا ہے اور توحید داخل ہو جاتی ہے، جس ذات پاک نے یہ پیغام ہم تک پہنچایا محمد صلی اللہ علیہ وسلم ان کی رسالت کے اقرار سے دل سے کفر کا خروج ہو جاتا ہے، اور ایمان جلوہ افروز ہوتا ہے، اس کا زبان سے اقرار اور دل سے انکار نفاق ہے۔ اس کی تصدیق کے بعد انکار ارتداد ہے۔ بدعت دین میں کسی نئی بات کا پیدا کرنا یا جو دین کی بات نہیں، اس کو دین سمجھنا ہے۔ مجملاً شرک کے جانے سے توحید، کفر کے جانے سے ایمان و نفاق کے جانے سے صدق، بدعت کے چھوڑنے سے سنت حاصل ہوتی ہے ردیکھو باب اول عبادت و استعانت ص ۱۱۹ فتوح الغیب مقالہ اول۔

کی زندگی ہے، اور ہر معنی میں کامیاب زندگی!

اب دیکھو، زندگی میں کامیابی و شرحِ روئی کے لیے کن صفات کی ضرورت ہے، جو متقی کی سیرت کا جزو ہیں، وہ حق تعالیٰ پر شدت سے ایمان رکھتا ہے، ان سے شدت سے محبت کرتا ہے، ان کو وہ خیر مطلق اور قدوس مانتا ہے، زندگی اور کائنات کا مبدؤ و حق تعالیٰ ہی کو جانتا ہے اور لازماً زندگی کو بھی خیر سمجھتا ہے، جب اس کے اعتقاد اور اذعان کی رو سے زندگی اچھی اور زندگی کے تجربات اچھے ہیں تو پھر وہ ان سے زندہ دلی اور خوشی کے ساتھ تعاونِ عمل کرتا ہے، قنوطیت و یاس کا اثر اس کے قلب پر مطلق نہیں ہوتا، اس کی زندگی اور خارجی حالات میں توافق پیدا ہو جاتا ہے، اس کو شادمانی و کامیابی نصیب ہوتی ہے۔

عارفِ رومی نے کہا تھا، انما اللہ بغير تبديل المزاج آدمی میں سب سے زیادہ اہم اور سب سے زیادہ عملی چیز کائنات کے متعلق اس کا نقطہ نظر ہے۔ مومن کا کائنات کے متعلق نقطہ نظر تم نے اوپر دیکھا کہ کیا ہے، اس کے نزدیک کائنات ایک قدوس و قادر و عظیم مطلق ذات کی تجلیات کا منظر ہے، اسی یقین کی وجہ سے وہ زندگی میں کامیاب ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اپنے مزاج کی اسی خوشگوار تبدیلی کی وجہ سے وہ جہان کے ناموافق عناصر کو اپنے موافق بنا لیتا ہے، چار سوٹے کائنات اس کو بدلے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اقبال کے اس گمان کو صحیح کر دکھانا ہی یہ تری خودی میں اگر انقلاب ہو پیدا عجب نہیں ہے کہ یہ چار سو بدل جئے

خالق کائنات و رب کائنات سے حسن ظن رکھنے کی وجہ سے کائنات بھی اس کے ارادے کے مطابق بن جاتی ہے اور انا عند ظن عبدی کی بشارت صحیح ہوتی ہے، وہ حق تعالیٰ سے راضی ہوتا ہے، تو حق تعالیٰ اس سے راضی ہوتے ہیں۔ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ كَقَوْلِ سَچا ہوتا ہے، صادق مصدوق نے بھی تو اس کی خبر دی تھی۔ انِ اللهُ رِجَالًا

لے تدبیر اس کے سوا کچھ اور نہیں کہ مزاج ہی بدل جئے۔  
یہ جی کے چپٹرن کا مقولہ ہے جو انگلستان کا ایک مشہور ادیب گزرا ہے۔

یرضی برضاکم و یغضب بغضبکم انہم یرضوا برضاکم و یغضبوا بغضبکم، بعض رجال شہ  
 ایسے بھی ہیں جن کی رضا سے حق تعالیٰ بھی راضی ہوتے ہیں، اور جن کے غصہ سے وہ بھی غضب فرماتے  
 ہیں جس طرح کہ خود یہ مردان حق اپنے مولیٰ کی رضا سے راضی اور اس کی ناراضی سے خود بھی ناخوش  
 ہوتے ہیں، منتقی کی اس شان کو دیکھ کر کسی عارف کے اس قول کی تصدیق ہوتی ہے۔

فارغ بنشین و غم مخور و شاد بزی این معنی لایزالہ الا اللہ است!

مومن منتقی کے خمیر میں وہ سب عناصر موجود ہوتے ہیں جن کی وجہ سے وہ ایک حقیقی معنی  
 میں کامیاب زندگی بسر کرتا ہے، ان ہی کا خیال رکھ کر امام غزالی فرماتے ہیں کہ "جس نے تقویٰ  
 اختیار کیا اس کے سارے ترددات رفع ہو گئے، اب وہ آرام سے جدھر چاہے سو رہے بات  
 اصل بھی سو حاصل ہو گئی، اپنی تائید میں وہ قتادہ کا یہ قول نقل فرماتے ہیں کہ توریت میں لکھا  
 ہے کہ "اے فرزند آدم تقویٰ اختیار کرو و جدھر چاہے سو رہے" مومن منتقی مجاہد ہوتا ہے، سو نہیں  
 رہتا۔ مطلب یہ ہے کہ اس کو اپنی ناکامیابی کا اندیشہ نہیں، بالفاظ غوث اعظم ساکن الجوارح،  
 مطہن الجنان، مشروح الصدر، منور الوجه، عامر البطن، غنی عن الاشیاء بخالقہا ہوتا ہے۔ لوگ اشیاء  
 کی ملکیت کی وجہ سے خود کو غنی سمجھتے ہیں، وہ غنی بالمشے ہوتے ہیں، مجاہد منتقی اشیاء سے بے نیاز ہوتا ہے  
 وہ خود خالق اشیاء کو رکھتا ہے، اس لیے وہ غنی عن اشیاء ہوتا ہے، اس کے دل و افتقار کی نسبت  
 حق تعالیٰ سے ہے، وہ حق تعالیٰ کا فقیر ہے، اشیاء سے غنی ہے، اس کے ہاتھ میں لایزالہ الا اللہ  
 کی شمشیر ہے، اسی لیے وہ فرمانروائے موجودات ہے، اسی فقیری ہی کی وجہ سے اس کو امانت  
 ملی، اور اس امانت کی وجہ سے خلافت عطا ہوئی اب وہ خلیفۃ اللہ ہے، اسی لیے  
 ہاتھ ہے اللہ کا بندہ مومن کا ہاتھ غالب و کار آفرین کار کشا و کار ساز (اقبال)

اے ساکن الجوارح (بلا حرکت اعضاء) اور قلب مطہن اور فراخ و کشادہ سینہ، روشن چہرہ، باطن آباد و تعلق خالق  
 کی وجہ سے تمام چیزوں سے بے پرواہ (فتوح الغیب مقالہ ۶)  
 تھ ہرگز اندر دست اور شمشیر لاسنت بہ جملہ موجودات را فرماں روا است (اقبال)



تم دنیوی نقطہ نظر سے کامیاب زندگی کس قسم کی زندگی کو قرار دیتے ہو؟ وہی نہ جو آسمان  
وزمین کے برکات سے مالا مال ہو؟ دیکھو اس کا حصول ایمان و تقویٰ پر منحصر ہے۔

وَلَوْ أَنَّ أَهْلَ الْقُرَىٰ آمَنُوا وَاتَّقَوْا لَآتَيْنَا عَلَيْهِم بَرَكَاتٍ مِّنَ السَّمَاءِ  
وَالْأَرْضِ (پ ۲۴)

پرہیز کرتے تو ہم ان پر آسمان و زمین کی برکتیں  
کھول دیتے۔

ان برکات کے ساتھ پھر نہ رنج و تعب ہو گا نہ حزن و خوف۔

فَمَنِ اتَّقَىٰ وَأَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (پ ۱۱)

پس جو شخص تقویٰ اختیار کرے اور درستی کرے سو  
ان لوگوں پر نہ کچھ خوف ہی، اور نہ حزن۔

کامیاب زندگی وہی ہے نا، جس میں دشمنوں سے محفوظیت حاصل ہے؛ بشرط تقویٰ اس  
کا وعدہ کیا جا رہا ہے۔

إِن تَصْبِرُوا وَاتَّقُوا لَا يَضُرُّكُمْ  
كَيْدُهُمْ شَيْئًا (پ ۳۴)

یعنی تم استقلال اور تقویٰ کے ساتھ رہو تو ان لوگوں  
کی تدبیر تم کو ذرا بھی ضرر نہ پہنچا سکیگی۔

حق تعالیٰ کی معیت اور اعانت کی وجہ سے متقی غالب و منصور ہوتا ہے۔

إِنَّ اللَّهَ مَعَ الَّذِينَ اتَّقَوْا وَالَّذِينَ  
هُمْ أَحْسِنُونَ (پ ۲۲)

اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے جو متقی  
ہوتے ہیں اور نیک کردار ہوتے ہیں۔

کامیاب زندگی وہی ہے نا، جس میں سختیوں سے نجات ہو، رزقِ حلال ہو، دیکھو اسی

کا تو وعدہ متقیوں سے کیا گیا ہے۔ مَنْ يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَلْ لَهُ مَخْرَجًا وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا  
يَحْتَسِبُ متقی کی نجات کی شکل حق تعالیٰ نکال دیتے ہیں اور اس کو ایسی جگہ سے رزق  
دیتے ہیں، جہاں اس کا گمان بھی نہیں ہوتا (پ ۱۷) اس کے ہر کام کو آسان کر دیتے ہیں  
وَمَنْ يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَلْ لَهُ مِّنْ أَمْرِهِ يُسْرًا (پ ۱۷)

اخریٰ نقطہ نظر سے بھی متقیوں ہی کی زندگی کامیاب ہوتی ہے، کیونکہ وہ حق تعالیٰ کے

محبوب ہوتے ہیں اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ۔ ان ہی کی عبادت قبول ہوتی ہے۔  
 اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ۔ حق تعالیٰ متقیوں ہی کا عمل قبول کرتے ہیں۔  
 ان ہی کو حق تعالیٰ کے نزدیک بزرگی حاصل ہے :-

اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ  
 اللہ کے نزدیک سب میں بڑا شریف وہ ہے جو  
 سب سے زیادہ پرہیزگار یا متقی ہو۔ (پ ۱۳۴)

ان ہی کے اعمال قبول ہوتے ہیں، اور گناہ معاف ہوتے ہیں :-

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اتَّقُوا اللّٰهَ وَقُوْا لَئِيْ  
 لَئِيْ يُّصَلِّحَ لَكُمْ اَعْمَالَكُمْ وَاَنْتُمْ  
 لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ  
 اے ایمان والو اللہ سے ڈرو اور راستی کی بات  
 کہو اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال کو قبول کرے گا اور  
 تمہارے گناہ معاف کرے گا۔ (پ ۲۴)

دوزخ کی آگ سے ان ہی کو نجات ملتی ہے۔

وَمِنْ حَيِّ اللّٰهِ الَّذِيْنَ اتَّقُوا بِمَقَازِمِهِمْ  
 لَئِيْ يُّصَلِّحَ لَكُمْ اَعْمَالَكُمْ وَاَنْتُمْ  
 لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ  
 اور جو لوگ متقی ہیں حق تعالیٰ ان کو کامیابی کے  
 ساتھ نجات دینگے، ان کو نہ تکلیف پہنچے گی اور نہ  
 وہ غمگین ہوں گے۔ (پ ۳۶)

ان ہی کے لیے بالا آخر جنت ہے اور سامان عیش و عشرت :-

اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنَّةٍ وَّ نَعِيْمٍ  
 متقی لوگ بلاشبہ باغوں اور سامان عیش میں ہوں گے  
 بہر حال مومن متقی کے لیے دونوں جہان کی خوشخبری ہے، دنیا کی خوشخبری، آرام و آسائش  
 اور برکتیں، غم و خوف و حزن سے نجات، دشمنوں سے حفاظت اور حق تعالیٰ کی معیت و نصرت  
 اور آخرت کی بشارت معاملہ قبر، حساب و کتاب کا آسان ہونا، یعنی حساب و حساب قیامت  
 سے رستگاری اور شیش خداوند غفار و ستار پھر روح دریاں و جنات نعیم یہ  
 اَلَا اِنَّ اَوْلِيَاءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ  
 یاد رکھو کہ اللہ کے دوستوں پر نہ کوئی اندیشہ ہے

لہ راحت اور غذائیں ہیں اور آرام کی جنت (سورہ واقعہ)

وَلَا هُمْ يَخْزَنُونَ، الَّذِينَ آمَنُوا اور نہ وہ مغموم ہوتے ہیں، وہ وہ ہیں جو ایمان لائے  
 وَكَانُوا يَتَّقُونَ لَهُمُ الْبُشْرَىٰ فِي اور تقویٰ اختیار کرتے ہیں، ان کے لیے دنیوی  
 الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ لَا زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی خوشخبری ہے  
 تَبْدِيلَ لِكَلِمَاتِ اللَّهِ ذَلِكَ الْقَوْلُ الْعَظِيمُ (پ ۱۲۶)

دیکھو یہی راز ہے، جس کو پالینے کے بعد تمہاری سمجھ میں آجائے گا کہ کیوں حق تعالیٰ جو ہمارے مولیٰ  
 ہیں اور سب سے زیادہ خیر خواہ، سب اگلے پھلوں کو ایک ہی وصیت فرماتے ہیں، اور وہ یہی ہے  
 کہ ہم تقویٰ کی زندگی اختیار کریں اور بس، بتاؤ تم زیادہ جانتے ہو کہ اللہ انتم اعلم اور اللہ؟  
 وصیت ان الفاظ میں ہوئی ہے وَلَقَدْ وَصَّيْنَا الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَإِيَّاكُمْ أَنْ  
 اتَّقُوا اللَّهَ (پ ۱۲۶) واقعی ہم نے ان لوگوں کو بھی حکم دیا تھا، جن کو تم سے پہلے کتاب ملی تھی  
 اور تم کو بھی کہ تقویٰ اختیار کرو۔

مومن کی خصلت تقویٰ ہے اور یہ خصلت دنیا و آخرت دونوں کی جامع ہے اور سب کاموں  
 کے لیے کافی! مومن جانتا ہے کہ ۶

عقل کو تنقید سے فرصت نہیں!

اسی لیے وہ عشق و ایمان پر اعمال کی بنیاد رکھتا ہے الَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ حق تعالیٰ  
 کی تقویٰ سے متعلق یہ وصیت ہمیں محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے پہنچی ہے، ان  
 کی بات کا انکار کفر، ان کی بات میں شبہ نفاق، ان کی بات میں اپنی بات کا ملانا بدعت  
 ہے اور ان کی بات کا جوں کا توں مان لینا ایمان ہے، اس لیے گو

تعلیم پر فلسفہ مغربی ہے یہ

نادان ہیں جن کو ہستی غائب کی ہر تلاش

پیکر اگر نظر سے نہ ہو آشنا تو کیا؟

ہے شیخ بھی مشالِ برہمن صنم تراش  
 محسوس پر بنا ہے علومِ جدید کی  
 اس دور میں ہر شیشہ عقائد کا پاش پاش  
 مذہب ہر جس کا نام وہ ہر اک جنونِ خام  
 ہے جس سے آدمی کے تخمیل کو ارتعاش  
 کہتا مگر ہے فلسفہ زندگی کچھ اور

مجھ پر کیا یہ مرشدِ کامل نے راز فاش

باہر کمال اندکے اشتغلی خوش است  
 ہر چند عقلِ کل شد مٹے جنوں مباحث  
 (اقبال)

آئیے اسی جنون یا عشق کی اپنے مولا سے التجا کریں :-

عطا اسلاف کا جذبِ دروں کر      شریکِ زمرہ لایحزنوں کر  
 خرد کی گتھیاں صلجھا چکا ہوں      مے مولا مجھے صاحبِ جنوں کر

(اقبال)

## قرآن اور علاجِ خوف

اس مختصر مقالہ میں میں نے ایک خو خوار جذبہ سے نجات کے چند نفسیاتی اصول پر روشنی ڈالی ہے، جو اول سے آخر تک قرآن کریم سے ماخوذ ہیں۔ خوف سے میری مراد ماسواۃ اللہ کا خوف ہے۔ میں خشیت اللہ کو کوئی قابلِ علاج چیز نہیں سمجھتا، معاذ اللہ، یہ تو یمن مقصود ہے۔ اِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ اصول کو میں نے اختصار کے ساتھ پیش کیا ہے، اور تفصیلات کو ترک کر دیا ہے۔

دور روزہ عمر پر زخوف و خطرات از غصہ غذائے خلق خونِ جگر است

آسودہ دلی ز بعد مردن ہم نیست زیرا کہ خطرہ دریاں طرفِ بیمار است

انسان کی دور روزہ زندگی خوف و خطر سے بھری نظر آتی ہے، اس کے قلب پر اس خو خوار

جذبہ کا پورا تسلط دکھائی دیتا ہے، جب وہ بستر سے اٹھتا ہے تو لرزاں و ترساں اٹھتا ہے،

اور تمام دن کے غم و غصہ کے بعد جب وہ پھر بستر کی طرف لوٹتا ہے، تو بھی خائف و ہراساں

ہوتا ہے، وہ ڈرتا کس چیز سے ہے؟ کسی کو تو بیماری کا خوف ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ بیمار ہو جائے

اور دنیوی کامیابی کی ساری توقعات مٹی میں مل جائیں، جب کسی عزیز یا دوست کی بیماری

کی خبر سن لیتا ہے تو بچپن و پریشان ہو جاتا ہے، ڈرتا ہے کہ کہیں مر نہ جائے! کسی کو خوف ہے

کہ وہ ساری دولت کھو کر فقر و فاقہ میں مبتلا نہ ہو جائے، ضعف و ذلت کا شکار نہ ہو جائے

کسی کو اپنی ملازمت کی طرف سے خطرہ ہے، وہ حالات کو تشفی بخش نہیں پاتا، ڈرتا ہے

کہ کہیں بہت جلد اس کو بے روزگاروں کی صف میں شریک ہونا پڑے، ٹکڑوں کو

لے یہ مقالہ موثر علوم اسلامیہ جامعہ عثمانیہ میں پڑھا گیا، اور پہلی مرتبہ معارف نومبر ۱۹۳۷ء میں شائع ہوا۔



محتاج نہ ہو جائے، رزق کا دروازہ بند نہ ہو جائے، کوئی اپنی ذمہ داریوں سے گھبرار رہا ہے، یہ ناقابل برداشت نظر آ رہی ہیں، اور وہ محسوس کر رہا ہے کہ اس کی قوتیں زائل ہو رہی ہیں، اس کا دل بیٹھا جا رہا ہے، اور وہ اپنے بلند مقام سے گر رہا ہے، کوئی ہے کہ اپنے ہم جنسوں سے ملنے سے گھبرار رہا ہے، وہ ان سے گفتگو نہیں کر سکتا، خوف سے اس کی زبان سوکھی جا رہی ہے، اور پسینوں میں ڈوب رہا ہے، کوئی خوف زدہ ہے، لیکن نہیں جانتا کہ کس چیز سے خوف زدہ ہے اس کو اپنا مستقبل تاریک نظر آ رہا ہے، خطرہ کا وہ تعین نہیں کر سکتا، لیکن خوف کی لہریں اس کے قلب میں اٹھ رہی ہیں اور وہ بزدلی کی موت مر رہا ہے، غرض خوف کا جذبہ عالمگیر ہے، ہر شخص اس کا شکار ہے، کون ہے جس کو فکر نہیں، غم نہیں، خوف نہیں، شیخ عطاء اللہ بن فضل اللہ نے جو بات غم کے متعلق کہی ہے، وہ خوف کے متعلق بھی صحیح معلوم ہوتی ہے، اور نفسیاتی طور پر غم نتیجہ ہے خوف کا۔

غم رازِ من و مرا گر یز از غم نیست      یارانِ قدیم را شکست از غم نیست  
غم خوی بمن کرد من خوئے بغم      بچوں من و غم دو یار در عالم نیست

کیا خوف سے نجات بھی ممکن ہے؟ کیا اس ظالم جذبہ کی مردانگی قوت کا مقابلہ کیا جاسکتا ہے اور اس پر فتح حاصل کی جاسکتی ہے؟ کیا زندگی کے چند روز طمانیتِ خاطر اور بردِ قلبی کے ساتھ بسر کیے جاسکتے ہیں؟ علماء نفسیات نے اس کا کیا علاج تجویز کیا ہے؟ حکماء نے کائنات کی گنہ و حقیقت پر غور کرنے کے بعد کیا اس کو خوفناک اور بے درد بے رحم قوتوں کا نتیجہ قرار دیا ہے؟ کیا کائنات انسان کے لیے ایک صلیب کے مانند ہے، جس پر بالآخر اس کو جان دینا ہے، خواہ پامردی اور ہمت کے ساتھ، یا نامردی اور بزدلی کے ساتھ، لرزاں ترساں؟ قرآن کریم خوف سے کس حد تک نجات دیتا ہے؟

لَا تَخَافُوهُمْ وَخَافُواْ اِن كُنْتُمْ مَّؤْمِنِينَ (پ ۹۷) کے کیا معنی ہیں؟ کیا کوئی مخلوق

و مر بوب شے حقیقت میں نافع و ضار ہو سکتی ہے؟ اگر نہیں تو پھر خوف کیوں؟ کیا یہ وہم کا نتیجہ

نہیں، باطل علم کی پیداوار نہیں؛ کیا اس سے نجات علم کی تصحیح سے ہو سکتی ہے، اختصار کے ساتھ بعض اہنی اعتبارات پر یہاں بحث کرنی مقصود ہے۔

قرآن کریم کی تعلیم کی رو سے خوف سے نجات اور زنجیروں سے رہائی جن سے خوف نے ہماری گردنیں باندھ رکھی ہیں، دو طریقوں سے ہو سکتی ہے، ایک طریقہ ذہنی ہے اور دوسرا خارجی، پہلا طریقہ علم کی تصحیح پر مشتمل ہے اور دوسرا علم صحیح کے استعمال پر۔

(۱) علم کی تصحیح:۔ خوف سے دستگیری حاصل کرنے کے لیے ہمیں سب سے پہلے اپنے مابعد الطبیعیاتی مسلمات کا جائزہ لینا چاہیے، مذہب کی زبان میں یہ عقائد کہلاتے ہیں ان کو عقل سے ثابت کرنے کی فلسفہ میں کوشش کی جاتی ہے، اور مذہب میں ان پر محض ایمان لایا جاتا ہے، اور وراہ طور عقل سمجھا جاتا ہے، لیکن یہ خلاف تجربہ اور خلاف وجدان نہیں ہوتے یہ مذہبی زندگی کے وہی جذباتی اور حسی میلانات کی گہرائیوں میں اپنی جڑیں جماے ہوئے ہوتے ہیں، تجربہ ان کی تائید کرتا ہے، وجدان ان کو اپنے ذوق کے مطابق پاتا ہے، عقل ان کی تردید نہیں کر سکتی۔

ایسا پہلا عقیدہ جس کو مان لینے کے بعد خوف سے قطعاً رہائی مل جاتی ہے، حق تعالیٰ کا رحیم اور حکیم ہونا ہے، فلسفیانہ الفاظ میں یوں سمجھو کہ کائنات تمہاری دشمن نہیں دوست ہے، تم روحانی کائنات میں زندگی بسر کر رہے ہو روحانی قوانین کی تم پر حکمرانی ہے، یہ قوانین کو راند نہیں، ان کی ایک غایت اور مقصد ہے، اگر تم ان کی نوعیت کو سمجھ کر ان کے ساتھ توفیق پیدا کرو گے تو تم ان کو اپنا رفیق کار پاؤ گے اور نتیجہ طمانیت اور تسکین قلبی ہوگا، اگر تم نادانی اور جہل سے ان کی خلاف ورزی کرو گے، تو نقصان تمہارا ہی ہوگا، خوف و غم میں مبتلا ہو گے، حزن و یاس سے نجات نہیں ملیگی، اور اس کا باعث خود تمہارا جہل ہوگا، اور جہل سے پیدا شدہ غلط عمل، یقین و ایمان کی شانہ قوت سے قطعی طور پر بان لو کہ دنیا اچھی چیز ہے، کیونکہ اس کا مبدئ خیر ہے، یہ مبدئ حق تعالیٰ ہیں جو حکیم بھی ہیں اور رحیم بھی؛ حق تعالیٰ خالق کائنات ہیں، جان کر

کائنات کو پیدا کیا ہے، وہ جو کچھ کرتے ہیں، حق ہے، بجا ہے، سراسر حکمت سے مملو ہے، باطل کا  
 وہاں کوئی شائبہ نہیں۔ مَا صَنَعَ اللَّهُ فَهُوَ خَيْرٌ - ۶

زنیکو ہرچہ صادر گشت نیکو است!

جب تمہارا یہ عقیدہ راسخ ہو جائیگا تو جہت خیر تم پر سر بہن ہو جائیگی، خیر کا جلوہ تمہیں ہر طرف نظر آنے  
 لگیگا، کمالات پر تمہاری نظر جائیگی، دل میں اور فطرت میں، بظہر میں اور بصیرت میں حق جلوہ افروز  
 ہوگا، یعنی تمہاری طبیعت اور تمہاری فطرت بدل جائیگی، وہ عیب جو اور عیب ہیں نظر باقی نہ  
 رہیں گی، وہ ذہنیت باقی نہیں رہے گی، جو ہر جگہ نقص کی تلاش کرتی ہے، اور اس پر اعتراض کرتی  
 ہے، مستقبل کو خوف کی نگاہ سے دیکھتی ہے اور واقعات کے وقوع کے پہلے ہی ان پر شر بونے  
 کا حکم لگاتی ہے، اور وہی بھوتوں سے لرزتی اور کانپتی ہے!

ایمان کی آنکھ سے دیکھو اور یقین کرنے والے قلب کی باتوں پر غور کرو کہ حق تعالیٰ رحیم ہیں  
 كَانَ بِالْمُؤْمِنِينَ رَحِيمًا ان کا قول ہے، وہ مومن پر رحیم ہیں، وہ اس کے دوست ہیں، مددگار  
 ہیں، مولیٰ ہیں، نصیر ہیں۔ وَاللَّهُ وَلِيُّ الَّذِينَ آمَنُوا (پ ۲۶) جب حق تعالیٰ مومن کے ولی ہیں  
 اس پر رحیم ہیں تو پھر اس کو کس چیز سے خوف ہو سکتا ہے؟ حق تعالیٰ کو اپنا ولی جان کر وہ کس  
 چیز سے ڈر سکتا ہے؟ وہ تو حق تعالیٰ کے زیر پرورش ہو جاتا ہے، اور حق تعالیٰ اس کے ساتھ  
 نشانِ رحمت پیش آتے ہیں، اس کے تمام معاملات کے کفیل ہوتے ہیں، وکیل ہوتے ہیں،  
 جب یہ ادراک مومن کے قلب میں قوی ہو جاتا ہے، تو اب وہ بیک جہت خوف و حزن  
 سے آزاد ہو جاتا ہے، اور لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ کا مصداق بن جاتا ہے!

خوف کے وقت حق تعالیٰ کے رحیم و حکیم ہونے پر غور کرو، مضطرب قلب کو، پریشان باغ  
 کو، معطل جو اس کو، کچھ دیر کے لیے اس نقطہ پر مرکوز کرو، یہی وہ نقطہ ہے جو انوار کا منبع ہے، قوتوں کا مرکز  
 ہے، تو انانیوں کا مبدیہ ہے، اسی پر نظر جما کر تم خوف سے نجات حاصل کرو گے، تمہارا ضعف دور ہوگا  
 حزن رفع ہوگا، سکون حاصل ہوگا، سرور حاصل ہوگا، طمانیت و تسکین قلبی نصیب ہوگی۔

جب حق تعالیٰ حکیم و رحیم ہیں اور وہی جہاں دار ہیں تو ظاہر ہے کہ ۶

جہاندار داند جہاں داشتن!

اب مجھے کسی تجربہ سے خوف زدہ ہونے کی کیا ضرورت ہے۔

ہر چہ آن خسرو کند شیریں بود!

ہر واقعہ کی تخلیق اس ہمہ خیر قوت سے ہو رہی ہے، جو حکیم مطلق بھی ہے، اور رحم و کرم مطلق بھی! اب زندگی کا کوئی واقعہ میرے لیے مضر نہیں ہو سکتا، وہ بحیثیت مجموعی میرے لیے مفید ہے، خیر برتر کے حصول کا ذریعہ ہے، یہ میرا جہل ہے کہ باوجود حق تعالیٰ کو رحیم اور ولی مان کر پھر یہ خیال کرتا ہوں کہ وہ مجھے نقصان پہنچانا چاہتے ہیں، درپے آزار ہیں، جب کھوڑے سے غور و فکر کے بعد میری سمجھ میں یہ بات آگئی کہ حق تعالیٰ رحیم ہیں، اور میرے حال کے علیم، تو جمعیتِ تامہ مجھے نصیب ہوتی ہے اور خوف بالکل رفع ہو جاتا ہے!

دوسرا اصول جس کے مان لینے کے بعد خوف قطعی طور پر دور ہو جاتا ہے، حق تعالیٰ کی معیت کا عقیدہ ہے۔ حق تعالیٰ ہمارے ساتھ ہیں، جہاں کہیں ہم ہوں وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَمَا كُنْتُمْ (پا ۱۶) جب مجھے اس امر کا تحقق ہو جاتا ہے کہ حق تعالیٰ ہمیشہ میرے ساتھ ہیں، مجھ سے بہت قریب ہیں "اقرب" ہیں، میری حفاظت فرما رہے ہیں، ان کی معیت کی وجہ سے میں تمام شر و گزند سے محفوظ ہوں، ان کے حفظ و امان میں ہوں، تو پھر خوف میرے قلب سے بالکل دور ہو جاتا ہے اور سرور و اطمینان بلکہ ایک ذوق و مستی پیدا ہو جاتی ہے!

ازدصل تو رفت ہستی و پندارم      در بھر تو بودہ اندوہ و آزارم

اکنون جان و تن خویش را بر آزارم      شادی آمد و نصیب جانم شد

جب بھی خوف کے حالات پیدا ہوں، واقعات خطرناک نظر آئیں، غم کے بادل قلب پر چھانے لگیں تو ہمیں اس امر کا احساس کرنا چاہیے کہ حق تعالیٰ ہمارے ساتھ ہیں، وہ رحیم ہیں، قادر مطلق ہیں، ان کی معیت کی وجہ سے مجھے علوئے تمکین حاصل ہے اَنْتُمْ اَوْ عَلَوْنَ

وَاللَّهُ مَعَكُمْ كَامَصْدَاقٍ هُوں، ان کو رکھ کر مجھے کس چیز سے نقصان پہنچ سکتا ہے، ان کی معیت کی وجہ سے میں ہر شے سے بلند ہوں ان کو رکھ کر مجھے کسی شے کی نہ خواہش ہے، اور نہ اس کے نہ ملنے کا غم جب مجھے کسی چیز کی خواہش ہی نہ ہو، تو پھر شکستِ خواہش کا بھی احتمال نہیں، اور اس کے نتیجہ غم و خوف سے بھی آزاد ہوں!

لیکن غم و مصیبت و خوف کی حالت میں حق تعالیٰ کی معیت کا احساس اسی وقت پیدا ہو سکتا ہے جب ہم راحت اور آسودگی، فراغت و اطمینان کی حالت میں بھی حق تعالیٰ کی یافت و شہود سے غافل نہ رہے ہوں، ان کی یاد سے ذہول نہ رہا ہوں، اور کسی عارف کے یہ الفاظ ہمارے پیش نظر رہے ہوں۔

تشنہ او میر گر تو زندہ      خاکِ آن در باش گر تو بندہ  
ذره در دِ خدا در دل ترا      بہتر از ہر دو جہاں حاصل ترا

جب ہمارے دل میں حق تعالیٰ کا درد ہو، ان کی معبودیت و ربوبیت کا اقرار ہو، ذلت کا اظہار ان ہی کے سامنے ہو، ذل و افتقار کی نسبت ان ہی کے ساتھ وابستہ ہو تو پھر خوف اور پریشانی کے وقت ہمیں ان کی معیت کا شدید احساس ہوتا ہے، ہم محسوس کرتے ہیں کہ وہ ہمارے ساتھ ہی تو ہیں، مونس ہیں غمخوار ہیں، نصیر ہیں، وکیل ہیں، اسی طرح ہمارے قلب کی حفاظت ہو جاتی ہے، سکینت و طمانیت پیدا ہوتی ہے، اور خارجی حالات میں بھی خوشگوار تغیر پیدا ہو جاتا ہے اور ہم تمام مصائب سے محفوظ ہو جاتے ہیں، اور حزن سے خوف سے رہائی مل جاتی ہے!

اگر تم خوف سے بالکل رہائی کے خواہاں ہو، اس کی تیج و بنیاد کو صحن دل سے اکھاڑ کر پھینک دینا چاہتے ہو، جمعیتِ ناتمہ کے حصول کے خواہشمند ہو تو خود شناس ہو، عرفانِ نفس حاصل کرو، اپنی حقیقت سے آگاہ ہو جاؤ اس عرفان کا آلہ محض عقلِ نظری نہیں، اس کے لیے اس عقل کی ضرورت ہے، جو بقول اقبال ”ادبِ خورہ دل“ ہے، عقلِ نظری (قیاساتِ عقلِ یونانی) ہمیں خود شناسی میں زیادہ مدد نہیں دے سکتی، یہ زیادہ تراوہامِ باطل کا نقشہ تمہاری نگاہوں کے سامنے پیش کرتی اور



پھر اس کو بجاڑتی رہتی ہے، یہی اس کا محبوب مشغلہ ہے، یہ تمہیں لذتِ حضور سے محروم رکھتی ہے، کیونکہ خود اس کی تقدیر میں حضور نہیں۔

انجامِ خود ہے بے حضوری ہے فلسفہ زندگی سے دوری  
تمہیں اس جگہ اقبال کی نصیحت پر عمل کرنا چاہیے جو ”پیروم“ کی ہدایت کے مطابق تم سے کہہ رہی ہیں  
عقلے بہم رساں کہ ادب خوردہ دل است  
یہ عقل تمہیں اس وقت حاصل ہوگی جب شیخ بوعلی سینا کی تحقیقات سے صرف نظر کر کے ”سخنِ محمدی“ سے دل بستگی پیدا کرو۔

دل در سخنِ محمدی بند اے پور علی زبوعلی چند (عکیم خاقانی در تحفۃ العراقرین)  
اب تمہیں اس عقل کے ذریعہ جو نورِ وحی کی ہدایت و رہبری میں قدم اٹھارہی، اپنی ذات کی معرفت حاصل کرنی چاہیے، اس معرفت کے حصول کے بعد تم کو اپنی ”عبودیت“ کا علم ہو جائیگا کہ تم ذات و ماہیت کے لحاظ سے معلوم ہو خارجاً مخلوق ہو، غیر ذاتِ حق ہو، حق تعالیٰ تمہارے ظاہر و باطن میں، اول و آخر میں، تم کو محیط ہیں، تمہارے ساتھ ہیں، تم سے قریب و اقرب ہیں تم حق تعالیٰ ہی کے وجود سے موجود ہو، ان ہی کی حیات سے زندہ ہو، ان ہی کے علم سے جانتے ہو، ان ہی کی قدرت و ارادے سے قوت و ارادہ کا استعمال کرتے ہو، وجود اور تمام صفات و جوہر تمہارے پاس امانت ہیں، یہ تمہارے لیے اصالتہً نہیں امانتہً ہیں، تم فقیر ہو اور امین، امانت کا استعمال جب کائنات کے مقابلہ میں کرتے ہو تو خلیفۃ اللہ کہلاتے ہو، اور جب امانت کا استعمال حق تعالیٰ کے مقابلہ میں کرتے ہو ولی اللہ کہلاتے ہو۔ یہی چار اعتبارات ہیں، عبد اللہ کے فقر، امانت، خلافت، ولایت، عبد اللہ کے پاس اللہ ہیں، ان کی ہویت و انیت ہے، صفات و افعال ہیں ملک و حکومت ہیں، عبد اللہ کا قیام ذات اللہ میں ہوتا ہے، ذات اللہ میں خوف کا کیا اعتبار ہو سکتا ہے، وہ تو سرورِ محض ہے، اس لیے عبد بھی اللہ کی جہت سے اپنے اندر ناقابلِ بیان سرور

لہ توضیح کے لیے دیکھو مصنف کی کتاب ”قرآن اور تصوف“

محسوس کرتا ہے، طمانیتِ محض و ذوقِ خالص کا مخزن بن جاتا ہے، کیا خوب کہا ہے کسی عارف  
تمام معرفت نے ۷

چوں بدانتی کہ ظلِ کیستی      فارغی گرمردی و گزریستی  
قطرہ نوری سراپا نور باش      بگذرا ز غم دائم اسرور باش

انسان اپنی اس حقیقی جدت کو فراموش کر کے خوف و حزن میں مبتلا ہوتا ہے، یا پھر خوف و  
حزن اس کے قلب پر محیط اس لیے ہیں کہ وہ سرے سے اپنی حقیقت سے آگاہ ہی نہیں اس  
کے ہر درد و غم، ہر خوف و ہراس کا علاج خود اس کے ہاتھ میں ہے اور وہ اس سے جاہل اس  
سے زیادہ محرومی کیا ہو سکتی؟

یک سبد پر نان ترا فرقِ سر      تو ہی جوئی لبِ ناں در بدر  
تا بزانوئے میانِ قعرِ آب      در عطش و زجوع گشتا ہستی خراب

(۲) علم صحیح کا استعمال :- جب تم کو اپنی حقیقت کا عرفان حاصل ہو گیا، جب تم نے یہ  
جان لیا کہ حق تعالیٰ مومن کے ساتھ ہیں، اس سے قریب اور اقرب ہیں، اس کے ظاہر و  
باطن ہیں، جب تم کو یقین ہو گیا کہ حق تعالیٰ مومن کے ولی ہیں، مولیٰ و نصیر ہیں، اس پر رحم  
ہیں، تو اب خوف کے وقت اپنے ایمان کی قوت سے کام لو، جرأت کے ساتھ کہو کہ کائنات  
کی کوئی چیز تم کو خوف زدہ نہیں کر سکتی، اپنے خوف زدہ نفس کو مخاطب کر کے کہو۔

أَلَيْسَ اللَّهُ بِكَافٍ عَبْدَهُ وَ  
يَخْوَفُونَكَ بِالَّذِينَ مِنْ دُونِهِ (پتہ ۱۶)  
کیا اللہ اپنے بندہ کے لیے کافی نہیں؟ کیا تجھ کو یہ  
ان سے ڈراتے ہیں جو خدا کے ماسوا ہیں؟ (ڈرمت)

ہمیں اپنے تحت الشعور نفس کے ساتھ بچوں کا سا ہرناؤ کرنا چاہیے، دیکھو بچہ اندھیری رات میں  
جاگ پڑتا ہے، اور ڈر کر رونے لگتا ہے، تم اس سے کہتے ہو، ڈر مت، یہاں کوئی چیز ایسی نہیں  
جس سے تم کو ڈر ہو، خوف کی چیزیں صرف تمہارے خیال میں ہیں، کمرے میں نہیں، اس  
طرح خوف کی نفی کرنے کے بعد تمہیں ان چیزوں کا اثبات کرنا چاہیے جو سچ ہیں۔ مثلاً تم کہو گے

میں تمہارے ساتھ ہوں، تمہارے بازو ہی میں تو ہوں، کیا مجال کہ کوئی چیز تم کو چھو سکے، اس طرح اطمینان دلانے کے بعد کہ تم پاس ہی ہو، اور اس کو تمہاری قوت پر یقین ہونے کی وجہ سے کہ تم اس کی حفاظت کرنے کے قابل ہو، بچہ پھر بے فکری کی نیند سو رہتا ہے!

یہی طریقہ تم کو اپنے تحت الشعوری نفس کے ساتھ استعمال کرنا چاہیے، پہلے خوف کے اسباب کی نفی کرنی چاہیے، جرأت و بہمت کے ساتھ اس کو یقین دلانا چاہیے کہ ساری دنیا میں خدا کے سوا تمہیں کوئی چیز ڈرا نہیں سکتی! تم جانتے ہو کہ شیخی نہیں، واقعہ ہے حقیقت کے عین مطابق ہے، مومن جس پر حق تعالیٰ رحیم ہیں، جس کے ساتھ وہ ہیں جس کی نصرت کا وہ اپنے اوپر حق سمجھتے ہیں، حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِينَ جس پر وہ ستر ماؤں سے زیادہ شفیق اور مہربان ہیں، ایسا مومن کائنات میں سوائے حق تعالیٰ کے کس چیز سے ڈر سکتا ہے اور ڈر کر مومن رہ کیسے سکتا ہے؟ دیکھو ساری اشیاء مخلوق ہیں، مربوط ہیں، محکوم ہیں، مملوک ہیں جب تک خالق و حاکم مالک و رب نہ چاہے، یہ ہمیں نقصان کیسے پہنچا سکتی ہیں؟ حکم اللہ ہی کا چلتا ہے الْحُكْمُ لِلَّهِ مُتَّصِفِ فِي الْأُمُورِ حق تعالیٰ ہی ہیں، ان ہی کے قبضہ قدرت میں تمام جائیدادوں کی پیشانی کے بال ہیں مَا مِنْ دَابَّةٍ إِلَّا هُوَ آخِذٌ بِنَاصِيَتِهَا، ڈرنا، ہمیں ان ہی کے جلال سے چلے، نافع وہ ہیں اور ضار وہ، معز وہ ہیں، اور بذل وہ، اور سارا عالم فقیر اور محتاج، نہ نفع کی قوت رکھتا ہے اور نہ ضرر کی، اسی لیے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

وَلَوْ جَمَدَ الْعِبَادُ أَنْ يَنْفَعُوا بَشِيئَةً لَمْ يَقْضِهِ اللَّهُ لَكَ لَمْ يَقْدِرْ وَأَعْلِيَهُ وَلَوْ جَمَدَ الْعِبَادُ أَنْ يَضُرُّكَ بَشِيئَةً لَمْ يَقْضِهِ اللَّهُ عَلَيْكَ لَمْ يَقْدِرْ.

اگر سب بندے مل کر کوشش کریں کہ تجھے اس چیز سے نفع پہنچائیں، جو اللہ نے تیرے لیے

یہ اس حدیث کا ایک حصہ ہے، جو حضرت عبداللہ بن عباس سے مروی ہے، اور جس کو حضرت غوث الاعظم شیخ عبدالقادر جیلانی رضی اللہ عنہما نے شرح الغیب مقالہ ۳۲ میں پیش فرماتے ہیں، اور تاکید کرتے ہیں کہ ہر مومن کو چاہئے کہ اس حدیث کی اپنے دل سے تکرار کرتا رہے تاکہ دنیا و آخرت میں تمام آفات سے محفوظ رہے اور اللہ کی رحمت سے دونوں جہان میں عزت پائے۔

مقدر نہیں کی، تو وہ ایسا کرنے کی قدرت نہ پائیں گے اور اگر سب بندے مل کر تجھے کسی چیز سے ضرر پہنچانے کی کوشش کریں، جو اللہ نے تیرے لیے مقدر نہیں کی، تو وہ اس پر قدرت نہ پائیں گے۔ اس صداقت پر پورا یقین رکھ کر اپنے نفس سے کہو کہ تجھے قطعاً کسی چیز سے ڈرنا نہیں چاہیو! اور زندگی کا عجیب قانون ہے کہ جوں ہی خوف قلب سے دور ہوا، اب دنیا کی کوئی چیز ہمیں گزند نہیں پہنچا سکتی، حضرت دانیالؑ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ انہیں شیروں کے غار میں ڈال دیا گیا لیکن شیروں نے انہیں چھوٹا تک نہیں، اس کی نفسیاتی توجیہ یہی ہو سکتی ہے کہ حضرت دانیالؑ کا حق تعالیٰ پر اتنا اعتماد تھا کہ خوف ان کے سینہ میں مطلق نہ تھا، اور اسی وجہ سے شیر انہیں چھوڑ سکے۔ یہ تو ہم سمجھی جاتے ہیں کہ کتنا جو خوف زدہ شخص پر حملہ کر دیتا ہے، اس شخص کے قریب بھی نہیں آتا جو بالکل بے خوف ہوتا ہے، یہ جو سیاسی جنگوں میں جا بیٹھتے ہیں جہاں ہر دم کے موزی اور درندہ جانوں بھی موجود ہوتے ہیں، کیسے محفوظ رہتے ہیں؟ ان کی بے خوفی ان کے لیے سب سے بڑی حفاظت کا کام دیتی ہے، جو شخص حق تعالیٰ کو محافظ سمجھتا ہے، وہ بے خوف ہوتا ہے۔ کامل بے خوفی نتیجہ ہے ایمانِ راسخ کا۔

نفسی کے بعد اثبات، یعنی نفس کو یقین دلانے کے بعد کہ خوف کی کوئی وجہ نہیں، اب ہمیں حق تعالیٰ کی معیت، احاطت، قرب و اقربیت کا ادراک کرنا چاہیے جس طرح کہ چھوٹے بچے کو ہم نے اپنی موجودگی کا یقین دلایا تھا، اسی طرح نفس کو حق تعالیٰ کے حضور و معیت کا یقین دلانا ضروری ہے۔ جب وہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ اس کا قیام حق تعالیٰ کی ذات میں ہے، وہ حق تعالیٰ کے نور میں منکشف ہے، اس کے رہنے بائیں اوپر نیچے آگے پیچھے حق تعالیٰ کا نور ہے، وہ نور کے قلعہ میں محسوس ہے، محفوظ ہے، تو پھر خوف کا سایہ اس کے قلب سے اٹھ جاتا ہے، (ظلمت نور کی موجودگی میں کیسے ٹھہر سکتی ہے؟) سرور و طمانیت حقیقی کا نفوذ اس کی رگ و پے میں ہونے لگتا ہے، وہ قطرہ نور بن جاتا ہے سراپا نور ہو جاتا ہے، اور مسرتِ دائمی سے ہلکار ہو جاتا ہے۔

اس مقصود کے حصول کے لیے تمہیں بعض ازلی وابدی صداقتوں کا دہرانا پڑی ہو گا، جب خوف و ہراس کی لہریں تمہارے قلب میں قیامت خیزی کر رہی ہوں، اور وہ بیٹھا جا رہا ہو، اور تمہاری نظر میں دنیا تاریک ہو رہی ہو تو تمہیں بیٹھ جانا چاہیے، اور آہستہ سے لیکن استقلال و ثابت قدمی کے ساتھ معیت حق کا ادراک کرتے ہوئے، ان صداقت بھرے الفاظ کی تکرار کرنی چاہیے۔

حَسْبِيَ اللَّهُ نِعْمَ الْوَكِيلُ نِعْمَ الْمَوْلَىٰ وَ نِعْمَ النَّصِيرُ

مجھے اللہ کافی ہے، اور وہ کیا خوب کار ساز ہے،  
کیا خوب مولیٰ ہے، اور کیا خوب مددگار ہے۔

ان کی تکرار سے ہماری بصیرت کی آنکھیں کھلتی ہیں، ہمیں حق تعالیٰ کی کفایت کا یقین ہوتا ہے اور اسی یقین کی وجہ سے ہمیں خوف سے نجات ملتی ہے، آزادی نصیب ہوتی ہے۔ جامع ترمذی میں ہے کہ جب حضور انور صلعم کو کوئی مشکل پیش آتی، فکر کا بار قلب انور پر ہوتا ہے تو حق تعالیٰ سے مخاطب ہو کر فرماتے :-

يَا حَيُّ يَا قَيُّوْمُ بِرَحْمَتِكَ أَسْتَغِيْثُ

درد بھرے دل سے العیاذ کی یہ پکار نکلی کہ حتی القیوم کی رحمت نے قلب کو سنبھالا دیا، اور اس کی حفاظت کے سامان فراہم کر دیے!

یاد رکھو کہ خوف طاری ہوتا ہے خوف پیدا کرنے والے خیال کو قبول کر لینے کی وجہ سے، اس خیال کا مقابلہ ذہن کی اس سطح پر نہ کرنا ممکن ہے جس سطح پر خوف کی موجیں اٹھ رہی ہیں، کوشش اس بات کی کرنی چاہیے کہ قلب اس سطح سے بلند ہو جائے، اور بالا تر سطح پر قدم جمانے کی کوشش کا طوفان اسی وقت فنا کا باعث ہوتا ہے، جب ہم اس کی تباہ کن موجوں میں گھر جاتے ہیں۔ لیکن اگر ہم کسی بلند پہاڑی پر چڑھ جائیں، تو پھر ان بلا خیز موجوں کے شر و شور سے ہمیں نجات مل جاتی ہے، کیونکہ اب ہم ان کے پیچھے سے باہر ہیں! بالکل اسی طرح جب ہم خوف کی حالت میں حق تعالیٰ کی طرف متوجہ جاتے ہیں تو ہمارا قلب خوف کی سطح سے بلند ہو جاتا ہے، اور



اس مقام پر پہنچ جانا ہے، جہاں سکون ہی سکون ہے، شانتی ہی شانتی، سکھ ہی سکھ! یاد رکھو قرآن کریم کی تعلیم کی رو سے ہمارے سائے دردوں کی دوا حق تعالیٰ ہیں، خوف و حزن کا علاج حق تعالیٰ کی محبت ہے، غیر اللہ سے بیزاری ہے، درد و الم خوف و ہراس کے وقت اپنے رخ کو حق تعالیٰ کی طرف اخلاص کے ساتھ پھیر دو، اور عجز کے ساتھ ان کے قدموں پر پڑ جاؤ، اور پھر تمہارا کام بن نہ جائے تو شکایت کرنا۔

در حضرت ما دوستی یکدلہ کن  
 ہر چیز کہ غیر ماست آنرا یلہ کن  
 یک صبح با اخلاص بیابرد درین  
 گر کار تو بر نیاید آنکہ گلہ کن!

(ابوسعید مہندی)

# بے خوف زندگی

جائے روح پاک علییں بود کرم باشد کس وطن سرگسں بود! (رومی)  
 آئیے آپ کو بے خوف زندگی بسر کرنے کے وہ گرتلائیں جنہیں صوفیہ کرام نے اپنے ذوق و وجدان  
 سے دریافت کیا ہے، اگر آپ انہیں سمجھ لیں اور ان پر عمل کریں تو آپ اپنی زندگی کو لاخوف علیہم  
 وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ کا مصداق بنا سکتے ہیں اور خوف و حزن سے نجات حاصل کر کے بے خوف و  
 مطمئن زندگی بسر کر سکتے ہیں۔

زیں شہدیک انگشت سام لببت از لذت اگر محو نگردی تف کن  
 یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ صوفیہ کرام کی زندگی حق تعالیٰ ہی کے قرب میں بسر ہوتی ہے، وہ حق تعالیٰ  
 ہی کے لیے جیتے ہیں، اور انہی کے لیے مرتے ہیں، جیسا کہ عارف رومی نے کہا ہے:-

بہر نیرداں می زید نے بہر گنج بہر نیرداں می مرد نر خوف و رنج  
 انگہاں خندد کہ او بیند رصنا ہچو حلوائے شکر اور اقضا

ظاہر ہے کہ بے خوف زندگی کے حصول کا ان کے ہاں صرف ایک ہی طریقہ ہو سکتا ہے، اور وہ  
 یہ کہ قرب حق میں زندگی بسر کی جائے، اور اس امر کا یقین پیدا کیا جائے کہ ہماری زندگی میں حق  
 تعالیٰ ہی کی مراد اور ان ہی کی نشا، کی تکمیل ہو رہی ہے، اور یہ فشار یا مراد خیر برتریں ہے۔

عمر خوش در قرب جاں پروردن است عمر زاغ از بہر سرگسں خوردن است (رومی)  
 اس مضمون میں ہم اسی اجمال کی تفصیل بیان کریں گے۔

صوفیہ کا یہ یقین قرآنی تصور پر مبنی ہے کہ حق تعالیٰ ہم سے قریب ہیں، اقرب ہیں، ہم پر محیط  
 ہیں، ہمارے ساتھ ہیں، وہ ہم سب سے غائب نہیں، بعید نہیں، اِنَّ رَبِّي قَرِيْبٌ مُّجِيْبٌ "میرا رب

مجھ سے قریب ہے، میری دعاؤں کا قبول کرنے والا ہے إِنَّهُ سَمِيعٌ قَرِيبٌ بیشک وہ مجھ سے قریب ہے، اور میری سنتا ہے۔ جب کسی اعرابی نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ کیا ہمارا رب نزدیک ہے کہ ہم اس سے سرگوشی کریں یا دور ہے جو ہم اس کو پکاریں تو جواب میں یہ آیت نازل ہوئی  
 وَذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ  
 جب میرے بند تجھ سے میرے متعلق سوال کریں تو ان سے کہہ میں قریب ہی تو ہوں۔

حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کا بیان ہے کہ ہم ایک سفر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے، لوگ بلند آواز سے تکبیر کہنے لگے، تو آپ نے فرمایا۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ ارْجِعُوا إِلَىٰ أَنفُسِكُمْ  
 انکم لا تدعون اصمًا ولا غائبًا انکم  
 تدعون سمیعاً بصیراً وھو معکم  
 والذین تدعونہ اقرب الی الحدیث  
 یعنی اے لوگو! اپنی جانوں پر نرمی کرو (یعنی آہستہ کہو)  
 تم کسی برے اور غائب کو نہیں پکار رہے ہو  
 تم پکار رہے ہو سُننے اور دیکھنے والے کو جو تمہارے  
 ساتھ ہے اور تم جس کو پکار رہے ہو، وہ تمہارے  
 ادنیٰ کی گردن سے بھی زیادہ قریب ہے۔  
 من عنق راحلہ۔

یہ حدیث و ما کذا غائبین کی تفسیر ہے، اور فانی قریب کی تشریح، سچ ہے و خواب جہل از سرم قرب مراد و فرنگد ورنہ نزدیک تر از دوست کسے پیچ ندید اس معرفت کے حصول کے بعد جو دراد طور عقل و نظر ہے، جس کی سند نص قطعی و کشف صحیح ہے، اور یہ معلوم کرنے کے بعد کہ قرب حق بغیر اختلاط و حلول و اتحاد ہیں حاصل ہے، صوفیہ کرام نے قرب حق کے دو پہلوؤں پر فکر کرنے ان کا تحقق حاصل کرنے اور ان پر قلب کی قوتوں کو مرکوز کرنے کی ہدایت کی ہے، جس کی وجہ سے روح کو صیقل اور قلب کو طمانیت حاصل ہوتی ہے اور خوف و حزن سے قطعی طور پر نجات مل جاتی ہے، اور وہ دو پہلو رحمت و حکمت کے ہیں۔

۱) قرب حق رحمت ہے، رحمت حق ہمیں کوئی گزند یا نقصان نہیں پہنچا سکتی، نقصان پہنچانا ہرگز

۱۹ مکتوبات امام ربانی مجدد الف ثانی جلد اول مکتوب ۲۵ - شیخ علی الہمامی در تفسیر القرآن المسی تبصیر الرحمن ص ۲۱۹

نہیں چاہتی، اور نہ غیر کو نقصان پہنچانے دیتی ہے، حق تعالیٰ تو حلیم و رحیم ہیں، غفور و کریم ہیں اِنَّ اللّٰهَ بِكُمْ لَوْوْفٌ رَّحِيْمٌ وہ تو ہمیں سلامتی امن و رحمت ہی کی طرف بلا تے ہیں، اللہ بدعو الی دار السّلاّم ان کا فضل و کرم عظیم ہے، واللّٰه ذوالفضل العظیم وہ ہلکے سچے دوست ہیں اللّٰه و لٰی الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا! اگر ہم اس بنیادی واقعہ کو یاد رکھیں، فراموش نہ کریں، بھلا نہ دیں، ان کے سایہ رحمت میں زندگی بسر کریں اور ان کی یاد میں رہیں تو کوئی چیز ہمیں نقصان نہیں پہنچا سکتی، کیونکہ رحمت حق کا مقابلہ کوئی چیز نہیں کر سکتی، حق کے مقابلہ میں کوئی قوت آ سکتی ہے!

لیکن ہماری زندگی ذہول و غفلت میں گزرتی ہے، معصیت و نافرمانی میں بسر ہوتی ہے، حق تعالیٰ یار مہربان کی طرح ہمارے جویا ہوتے ہیں، اور ہم گدھوں کی طرح ان سے بھاگتے ہیں، اور بلاؤں اور آفتوں کا شکار ہوتے ہیں۔

تو مرا جویا چو یار مہربان من گریزاں از تو مانند خزان (رومی)

جب خوف و حزن آفات و بلیات کا سامنا ہو اور ہم قرب حق کا ارادہ قائم کر سکیں، قلب کو اس واقعہ کا یقین دلا سکیں، کہ حق تعالیٰ ہمارے ساتھ ہیں، اپنی رحمت کاملہ کے ساتھ ہمارے قریب ہیں، مونس و رفیق ہیں، یار مہربان ہیں، ہماری قوت بازو اور ہماری پناہ گاہ ہیں، سہارا ہیں، وہی حق تعالیٰ جن کے حضور میں رات کی سیاہی اور دن کی روشنی آفتاب کی شعاع اور چاند کا نور درخت کے جائزہ اور پانی کے حیوان سجدہ ریز ہیں، جو محسن و مکرّم و منعم ہیں جو حرز صغیقا، و ذکر فقرہ ہیں تو بہلا بتلاؤ کہ اس ادراک کے بعد قلب میں خوف باقی بھی رہ سکتا ہے، حاشا و کلّا! قرآن کریم نے بیاتنگ دہل اعلان کیلئے کہ اس ادراک یا ذکر کے بعد قلب کا اطمینان قطعی یقینی ہے۔

الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ تَطْمِئِنُّ قُلُوْبُهُمْ

بِذِکْرِ اللّٰهِ اَلَا بِذِکْرِ اللّٰهِ تَطْمِئِنُّ

الْقُلُوْبُ .

جو لوگ ایمان لائے اور اللہ کے ذکر سے ان کے

دلوں کو اطمینان ہوتا ہے، خوب سمجھ لو کہ اللہ کے

ذکر سے دلوں کو اطمینان ہوتا ہے۔

”ذکر توجہ قلبی ہی کا تو نام ہے، حق تعالیٰ کی طرف، ان کی رحمت و محبت کی طرف قلب نے توجہ کی“

اس امر کا ادراک کیا، کہ یہ رحمت ہم پر ہر جانب سے محیط ہے کہ خوف دور ہوا اور طمانیت نصیب ہوئی اور زندگی کے میدان میں قدم اعتماد و اطمینان کے ساتھ بڑھنے لگے، کیونکہ اب ہم یقین ہو گیا، اور ہم نے محسوس کر لیا کہ رحمت حق ہمارے سامنے ہے، کَانَ بِالْمُؤْمِنِينَ رَحِيمًا!

لیکن خوف و خطر کے وقت رحمت کا ادراک اور اس کا تحضر و تحقق کوئی ایسی چیز نہیں جو سہولت کے ساتھ حاصل ہو سکے، اگر ہم نے راحت و آسودگی کے وقت فراغت و طمانیت کی حالت میں حق تعالیٰ کی معیت کا ادراک قائم نہ رکھا ہو تو خوف و مصیبت کے وقت ہم اس معیت کا ادراک نہیں قائم کر سکتے، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمیں نہایت بے رحمی کے ساتھ دشمن کے حوالہ کر دیا گیا، اس لیے یہ ضروری ہے کہ ہم اپنی توجہ ہر حالت میں خواہ وہ نعمت و راحت کی ہو یا بلا و مصیبت کی حق تعالیٰ کی جانب لگائے رکھیں، ان کی یاد میں زندگی بسر کریں، ان کی معیت کا ادراک کرتے رہیں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ابن عباسؓ کو اس سبب پر نصیحت فرمائی تھی کہ

أَذْكُرُ اللَّهَ فِي الرَّخَاءِ يَذْكُرُكَ اللهُ فِي الْبُؤْسِ  
 اذکوار اللہ فی الرخاء یدکوک اللہ فی البؤس  
 میں یاد کریگا۔ یعنی تیری مصیبت دور کریگا۔

جب انسان آسائش اور چین کی حالت میں حق تعالیٰ کی یاد نہیں بھولتا، تو حق تعالیٰ بھی اس کو خوف و مصیبت کی حالت میں نہیں بھولتے، اس لیے تاکید کے ساتھ حکم ہوا ہے۔  
 فَلْيَذْكُرِ اللَّهُ عَاءَ عِنْدَ الرَّخَاءِ جِينِ اور آسائش کے وقت زیادہ دعا کرتے رہو۔

جانتے ہو کہ چین کی حالت میں دعا کا کیا مطلب ہے، صرف یہ ادراک کہ ہر نعمت دراصل حق تعالیٰ ہی کی طرف سے عطا کی جاتی ہے۔ وَمَا بِكُمْ مِنْ نِعْمَةٍ فَمِنَ اللَّهِ حَقِيقَتِمْ مِّنْ مَّعْمٍ، قاسم، فاعل مسببہ موجود حق تعالیٰ ہی ہیں، ان ہی کی مرضی کے مطابق نعمتوں کا استعمال ضروری ہے، اس کو دوسرے الفاظ میں ”شکر“ سے تعبیر کیا جاتا ہے، اور مومن کی شان میں فرمایا گیا ہے:

الْمُؤْمِنُ شَاكِرٌ عِنْدَ الرَّخَاءِ مُمِّنْ مِّنْ مِّنْ حَالْتِمْ مِّنْ حَقِيقَتِمْ مِّنْ مَّعْمٍ۔

اگر ہم آسائش و نعمت کی حالت میں حق تعالیٰ کو یاد نہ رکھیں، نعمتوں کو ان ہی کی جانب سے



نہ سمجھیں، اور اس طرح اپنا رخ ان ہی کی جانب نہ رکھیں، تو مصیبت و خوف کے وقت ہم حق تعالیٰ کی رحمت و رافت کا ادراک نہیں قائم کر سکتے، جو ہماری نجات کا واحد ذریعہ ہے، چین و آسائش کے وقت حق تعالیٰ کی یاد ہمیں اس قابل بناتی ہے، کہ خوف و مصیبت کے وقت ہم ان کی معیت کا ادراک کر سکیں ان کی رحمتِ کاملہ کو اپنا مونس و رفیق پاسکیں، اس لیے حضور انور نے ابن عباس سے فرمایا تھا، کہ اے لڑکے :-

احفظ الله يحفظك الله، احفظ خدا کی نگہداشت کرو، خدا تمہاری نگہداشت کرے گا۔

الله تجده امامك - خدا کو حاضر جانو تو اس کو اپنے سامنے پاؤ گے۔

اگر ہم حق تعالیٰ پر نگاہ رکھیں، یعنی ان کی معیت کے ادراک میں رہیں، تو حق تعالیٰ ہمیں اپنی نگاہ میں رکھتے ہیں (اپنی رحمت و نصرت سے) اگر ہم حق تعالیٰ کی معیت کا ادراک قائم رکھیں، تو ہم انہیں اپنے سامنے ہی پاتے ہیں :-

خوف کے وقت حقیقی دعا تو یہ ہے کہ ہم کہیں "حق تعالیٰ میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ ہمیشہ میرے ساتھ ہیں، میں آپ کی نظروں میں ہوں، پھر کوشش اس امر کے ادراک کی کی جائے کہ ہم حق تعالیٰ کی آنکھوں کے سامنے نہیں، اور ان کی رحمتِ کاملہ بادل کی طرح ہم پر سایہ فلک ہے، یا نور کی طرح ہر جانب سے ہم پر محیط -

خوف اور بلا کے ورود کے وقت قرآن شہد ہے، کہ پیغمبر اسلام (فداہ روحی) کو حکم ہوا کہ

وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا اپنے رب کے حکم پر صبر کرو کہ تم ہماری آنکھوں کے سامنے ہو

بعض عارفین کی جیب میں یہ آیت لکھی رہتی تھی، خوف و مصیبت کے وقت اس پر نظر

ڈالتے، حضور و معیت حق کا ادراک کرتے، اور محض اس ادراک سے کہ حق تعالیٰ ہماری اس مصیبت

کو جانتے ہیں، اس تجربہ میں شریک ہیں، دیکھ رہے ہیں، جھومتے رخص کرتے، خود حضور انور پر اس آیت

سے وجد طاری ہوا تھا، اور ام المؤمنین عائشہ صدیقہ آپ کے پاؤں پر گر گئی تھیں، جامی نے شاید اسی

مفہوم کو یوں ادا کیا ہے،

بادرد بسا زچوں دولے تو منم      در کس منگر کہ آشنائے تو منم  
گر بر سر کوئے عشق اگشتہ شوی      شکرانہ بدہ کہ خونہلکے تو منم

(۲) ثانیاً قرب حق یا حضور حق حکمت و نظم کا نام ہے، حضور حق عالم لاہوت ہے، عالم لاہوت میں کامل الہی نظم پایا جاتا ہے، بے نظمی یا اختلال نہیں، عالم لاہوت میں شر نہیں فساد نہیں بلکہ کامل نظم و ترتیب ہے۔

نظم کائنات پر غور کرو، یہاں پر قانون اپنا عمل کر رہا ہے، اس کی شکست یا ناکامی ناممکن ہے، مثلاً کوئی برقیہ (Electron) تک اپنے کام میں قصور نہیں کرتا، دوسرے برقیہ سے نہیں ٹکراتا، ان کے درمیان تصادم ممکن نہیں، یا قرآنی الفاظ میں یوں کہو کہ صُنح الہی میں کوئی خلل نظر نہیں آتا بار بار نگاہ ڈالنے پر بھی نگاہ دراندہ ہو کر لوٹتی ہے، اور کوئی عیب یا خلل نظر نہیں پڑتا۔

مَا تَرَىٰ فِي خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِن تَفْوِیْتٍ ط      تو خدا کی صنعت میں کوئی خلل نہ دیکھیگا، تو پھر نگاہ  
فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرَىٰ مِن فُطُوْرٍ ثُمَّ      ڈال کر دیکھ لے، کہیں تجھ کو کوئی خلل نظر آتا ہے  
اَرْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتٰیۙ يَنْقَلِبْ اِلَيْكَ      پھر بار بار نگاہ ڈال کر دیکھ، نگاہ ذلیل اور درنا  
الْبَصَرَ خَاسِئًا وَّ هُوَ حَسِيْدٌ رَّحِيْمٌ (۱۶)

عالم لاہوت میں اس سے کہیں زیادہ کامل نظم و توافق کی حکمرانی ہے، یا یوں کہو کہ نظم الہی میں کامل توافق یا ہم آہنگی پائی جاتی ہے، نغمہ موسیقی جن تاروں سے پیدا ہوتا ہے، ان میں سے ہر تار اپنی مقررہ شرح ہی سے نقش ہوتا ہے، اس رفتار میں کمی یا زیادتی نہیں ہوتی، نظم الہی کا بھی یہی حال ہے، یہاں بھی ہر شے ٹھیک ٹھیک ہوتی ہے، اپنے صحیح مقام پر ہوتی ہے، اپنا مقوضہ کام انجام دیتی ہے، اس کو کامل طور پر انجام دیتی، اور اپنے صحیح وقت پر انجام دیتی ہے۔

حضور حق یا قرب حق کے مفہوم میں نظم الہی بھی شامل ہے، اور چونکہ حق تعالیٰ ہمیشہ ہمارے قریب ہیں، اقرب ہیں، ساتھ ہیں، نظم الہی، حکمت حق بھی اس کے ساتھ موجود ہے، اگر ہم اس پر بھروسہ کریں تو اس کا ظہور بھی قطعاً ہو کر رہیگا۔

جب ہم اپنی دعا میں کہتے ہیں کہ حق تعالیٰ میں آپ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ آپ ہمیشہ میرے ساتھ ہیں، تو ہمیں اس امر کا تحقق ہوتا ہے کہ معیتِ حق نہ صرف رحمت ہے، بلکہ حکمت بھی ہے، نظم بھی ہے، لہذا ہر شے ٹھیک ٹھیک ہوگی، اور اپنے ٹھیک وقت اور ٹھیک مقام پر ہوگی، اور اگر ہم اس یقینِ صادق کو قلب سے ہٹنے نہ دیں، تو پھر سب کچھ ٹھیک ہی ہوگا۔

عارفِ رومی نے اس حقیقت کو یوں ادا فرمایا ہے:

رو دیدہ بپوش تادلت دیدہ شود زان دیدہ جہانِ دگرت دیدہ شود

گرو زیند خویش بیرون آئی کارت ہمہ سر بسر پسندیدہ شود

اگر دیدہ دل سے حکمتِ الہی نظر آنے لگے، اگر دل نظمِ الہی کا مشاہدہ کرنے لگے، اس یافتہ

شہود میں وہ جا بھی ہے، تو پھر عارف کا ہر کام پسندیدہ ہی ہوگا، اپنے وقت پر ہوگا، اپنے مقام پر ہوگا، اور ہر وقت وہ یہی کہیگا کہ "الخیر فیما وقع" جو ہوا وہ ٹھیک ہوا،

ہر چیز کہ ہست آچنناں می باید و آن چیز کہ آچنناں نمی باید نیست!

نہ صرف یہ کہ حق تعالیٰ ہمیشہ ہمارے ساتھ ہیں، اللہ مَعَنَا بلکہ ہر زندگی میں منشاءِ الہی ہی کی تکمیل ہو رہی ہے، ہمارے دل، ہمارے اعضاء اور ہم خود سرتاپا حق تعالیٰ ہی کے قبضہ میں ہیں، اس منشاءِ الہی کی بنیاد نامتناہی حکمت و رحمت پر قائم ہے، یہ سرتاپا حکمت ہی، رحمت ہی، یہ ہیں خیر برتر ہی کی طرف لیجا رہی ہے، اس کو ارادۃ اللہ سے بھی تعبیر کیا گیا ہے، مرضی ہوئی بھی کہا گیا ہے، حق تعالیٰ کے ارادے سے توافق ان کی رضا سے راضی ہونا، رضا ازو، رضا بدو، رضادو، اعراض عن الاعتراض، حفظِ حال، قیام فی ماتم اللہ اس کی تعلیم تو ہمارے رہبرِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں دی ہے، حق تعالیٰ کے ارادے، منشاء، مرضی سے زیادہ بہتر، زیادہ نفیس، زیادہ حسین و جمیل، زیادہ شاندار کوئی چیز نہیں ہو سکتی، نیک انجام و شاد کام ہے، وہ شخص جس نے اپنے ارادے سے حق تعالیٰ کے ارادے کے خلاف کام نہ لینے کا ارادہ کر لیا اور باوا ز بلند کہا:-

أَرِيدُ أَنْ لَا أَرِيدُ میں نے ارادہ نہ کرنے کا ارادہ کیا۔

اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ میں حق تعالیٰ سے معروضہ کیا ہو۔

اللھم ان قلوبنا ونواصینا و  
جوارحنا بیدک لم تملکنا منھا  
شیئا فاذا فعلت ذلک، فکن  
انت ولینا واهدنا الی سوا  
السبیل

حق تعالیٰ! ہمارے دل ہم خود ستر پاپا اور ہمارے  
اعضاء، آپ ہی کے قبضہ میں ہیں! آپ نے ہمیں ان  
میں سے کسی چیز پر بھی اختیار (کامل) نہیں دیا ہے،  
پس جب آپ نے یہ کیا ہے تو آپ ہی ہمارے مددگار رہے  
اور ہمیں سیدھی راہ دکھاتے رہے۔

جس کی شب روزیہ دعا ہو کہ

اللھم انی ضعیف فقوئی رضاک  
ضعفی وخذ الی الخیر بنا صیتی  
واجعل الاسلام فنتہا رضائی

حق تعالیٰ میں کمزور ہوں پس اپنی مرضیات میں میرا ضعف  
اپنی قوت سے بدل دیجیے، اور کشاں کشاں مجھے خیر کی  
طرف لے جائیے، اور اسلام کو (یعنی ہر امر میں آپ کے  
سائے تسلیم ختم کرنے کی خو کو میری پسند کا منتہا بنا دیجیے

جب ہم حق تعالیٰ کے ہاتھوں میں اپنے آپ کو دیدیتے ہیں، نرم اور ملائم اور لچکلیے ہو جاتے ہیں،  
ان کے ارادے کے آگے تسلیم ختم کر دیتے ہیں، ان کی رضا سے راضی اور غضب سے غضبناک ہو جاتے  
ہیں تو پھر حق تعالیٰ بھی ہماری رضا سے راضی اور غضب سے غضبناک ہوتے ہیں، زبان وحی نے اس  
کی توثیق کی ہر انّ اللہ رجا لا یرضی برضا لہم ویغضب بغضبہم کما انہم یرضوا برضائہ ویغضوا بغضبہ

ہر چہ خواہی آن کند گر ہر چہ خواہی آن کنی

اچہ گوئی بشنود گر ہر چہ گفت او بشنوی

جب مقام رضا کی تکمیل ہو جاتی ہے تو پھر ہمیں پروا نہیں رہتی کہ زندگی میں ہم پر کیا گزر رہی ہے،  
یا گزرنے والی ہے، کیونکہ ہم جاننے لگتے ہیں کہ انجام ہر چیز کا نیر ہے، خیر اب بھی اور ہمیشہ کے لیے  
بھی، اسی لیے شیخ جمیلی نے جان کر کہا تھا، کہ

لہ فتوح الغیب

لہ ترمذی عن ابی ہریرہ وکنز العمال عن جابر۔

الرضا بالقضاء هو الراحة الكبرى و قضاء الہی سے راضی رہنا دنیا میں بڑی راحت کا  
 الجنة العالیة المنفردة فی الدنیا سبب ہے، گویا جنت عالیہ ہے، اور عبد مومن کے ساتھ  
 وعلت محبة الله بعبد المومن فمن حق تعالیٰ کی محبت کا باعث ہے، اور جس سے حق  
 احبه الله لم یعذبہ فی الدنیا تعالیٰ محبت کرتے ہیں اس کو نہ دنیا میں تکلیف دیتے  
 والاخرہ ہے  
 ہیں اور نہ آخرت میں۔

قرب حق میں زندگی بسر کرنے اور اس پر یقین صادق حاصل کرنے کا کہ ہماری زندگی میں مراد  
 الہی کی تکمیل ہو رہی ہے، نتیجہ خوف پریشانی فکر اور بے شمار خرابیوں کا کامل دفعیہ ہے ہم کو اس سے  
 اس عارف کامل کا نقطہ نظر حاصل ہو جاتا ہے، جو زندگی اور اس کے ہجوم و غموم، افکار و پریشانیوں  
 پر بہتے ہوئے نظر ڈالتا ہے، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ پس پردہ حکمت مطلقہ و رحمت مطلقہ کام کر رہی  
 ہے، اور اپنے شاندار نشانہ و مراد کی تکمیل کر رہی ہے، اور ہمیں خیر برتریں کی طرف لے جا رہی ہے،  
 سائے جہان کو بھی اگر وہ برف سے ڈھکا ہوا دیکھتا ہے تو گھبراتا نہیں، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ خود نشید  
 کی ایک نظر سے یہ ساری برف پگھل جائیگی۔

گر جہاں پُر برف گرد و سرسبز تاب خور گذاروش از یک نظر (رومی)

اس لیے وہ اپنے ساتھیوں سے عجیب امید افزا لہجہ میں کہتا ہے۔

سوئے نو میدی مرو کا مید ہاست سوئے تاریکی مرو خورشید ہاست

بے خوف زندگی بسر کرنے کا راز تم نے دیکھا بس یہی ہے کہ

(۱) قرب حق میں زندگی بسر کرو کیونکہ

عمر خوش در قرب جاں پروردن است عمر ز غ از بہر سرگین خوردن است

(۲) حق تعالیٰ کے ہاتھوں میں نرم اور ملائم بن جاؤ، تاکہ ارادۃ اللہ جاری ہو جائے، رضائے

حق تمہارا مقام ہو، "قیام فی ما اقام اللہ" حق تعالیٰ نے جہاں تمہیں کھڑا کیا ہے، وہیں کھڑے رہو

رضا بالعطا، حفظ حال تمہارا شیوہ ہو، ہر حالت میں خوش رہو، تصادم بالقضاء سے بچو



جن تجربات سے گزر رہے ہو، ان پر خدا کا شکر کرتے رہو کہ ان کا تمہیں موقع دیا گیا، ان ہی سے سیرت کی تکمیل ہوتی ہے، دنیا کو ”روح سار“ وادی کہا گیا ہے، یہاں کبھی غم کے مضراب سے اور کبھی خوشی کے تاروں سے سیرت کے خفتہ نغمے بیدار کیے جاتے ہیں، ان پر ہر حال میں شکر واجب ہے، کرب و بلا دونوں کی ایک سی قیمت ہے۔

بالفاظِ دیگر جن چیزوں سے تمہیں خوف ہو، ان ہی سے پیار کرو، تو خوف سے تمہیں ہمیشہ کے لیے نجات مل جائیگی۔

بس زبونِ دوسوسہ باشی دلا  
گر طرب را باز دانی از بلا

## قرآن اور علاجِ حُزن

بے خلشہمازیستن نازیستن      باید آتش در تہ پارزیستن  
زیستن این گونه تقدیر خودی است      از ہمیں تقدیر تعمیر خودی است (اقبال)

ابتلا یا آزمائش انسان کی تقدیر ہے، اور ابتلا ہوتی ہے زندگی کی محبوب و مرغوب چیزوں کے روک لیے جانے یا فنا کر دیے جانے سے، ان پر آفات کے نزول سے، ان کے حصول میں مشکلات کے پیدا ہونے سے، خلش سے، درد و غم سے، رنج و الم سے، قلب کے تار ٹوٹنے سے یا زیادہ جامع الفاظ میں یوں کہ خوف سے، بھوک سے، جان و مال و ثمرات کے نقص و کمی سے، اور ابتلا کا مقصد سیرت کی تعمیر ہوتی ہے، خودی کی سختگی ہوتی ہے، حیات کی زیادتی ہوتی ہے، قوت کی توفیر ہوتی ہے، خاص عام رحمتوں اور راحتوں کا نزول ہوتا ہے اور جو شخص ابتلا سے بھاگنا چاہتا ہے، وہ ایک کلی و وجودی قانون کی ہمہ گیر قوت سے بچ نکلنے کی کوشش کرتا ہے، اور نادانانہ طریقہ پر اپنا ہی نقصان چاہتا ہے، اپنی خودی کی تکمیل و تعمیر نہیں چاہتا، حیات و قوت کی توفیر نہیں چاہتا، وہ بھول جاتا ہے کہ

دوام ماز سوزِ نا تمام است      چو ماہی جز پیش بر ما حرام است  
محو ساحل کہ در آغوش ساحل      تمید یک دم درگِ دوام است (اقبال)

اپنے اس دعوے کی تائید میں ہم آپ کو کچھ دیر کے لیے فکر و نظر کی دعوت دیتے ہیں، اور کائنات و فطرتِ انسانی کے چند کلی و جزوی قوانین کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرتے ہیں۔

یک تنقیہ ماغ می باید کرد!

انسان، احتیاج کا دوسرا نام ہے، انسان کی عضویت کی تحدید و تقید ہی سے احتیاج

پیدا ہوتی ہے یعنی اس کی فطرت ہی میں احتیاج ہے، وہ حاجتمند ہے، فقیر ہے، اور در نتیجہ جیسا ہی فقر و احتیاج کا، اور فطری طور پر وہ اس درد کی دوا چاہتا ہے۔

عالم ہمہ دردست و دوا میخوابد از خوانِ کرم برگ و نوا میخوابد  
 کس بے حاجت نمی تواند دیدن درویشِ غذا شہ آشہا میخوابد (سحابی اشترآبادی)

اب اس عالم اسباب و علل میں جس کی تشبیہ انگارہ سے دی جاسکتی ہے، مجاہدہ اور عمل ہی سے احتیاج و فقر اور درد و غم بڑی حد تک دور کیے جاسکتے ہیں، جو اپنی بنیاد و اساس کے طور پر علم صحیح کو فرض کرتا ہے، مجاہدہ بغیر علم صحیح کے ممکن نہیں، اور علم صحیح عمل سے علیحدہ ہو کر نافع نہیں ہو سکتا، اس لیے ہم انہیں دو پہلوؤں کو یہاں اختصار کے ساتھ پیش کر کے اپنے دعوے کی تائید کریں گے۔

یاد رکھو کہ انسان کی زندگی اس معنی میں ہمیشہ خطرناک زندگی ہے کہ درد و غم، سوز و الم اس کی ماہیت میں داخل ہیں، کائنات کے اندرونی اسرار سے جو لوگ واقفیت رکھتے ہیں۔ ان کا ایقان ہے کہ کائنات کا مبدئ حق تعالیٰ ہیں جو حکمت و خیر کے اعتبار سے مطلق و لا محدود ہیں، وہی اس کائنات پر حکمراں ہیں، حکم ان ہی کا چلتا ہے، مشیت انہی کی نافذ ہو رہی ہے، لہذا یہ کائنات منظر ہے خیر و حکمت کا، پھر درد و غم جو انسان کی زندگی کا ساتھ نہیں چھوڑتے، اور ہر رنگ میں انسان جو چلتا رہتا ہے، اس میں کوئی حکمت ہے، اور خیر کا کونسا نامیاں پہلو ہے؟ ان ہی واقفانِ راز کا بیان ہے، کہ اہل ذکر یا مشاہدہ پر اس کی حکمت مبرہن ہے۔ اس کی توضیح تین قوانین کی شکل میں پیش کی جاسکتی ہے۔

(۱) درد و غم، سوز و الم نتیجہ ہے، جرم و معصیت کا، گناہ و بدکرداری کا، ذماکم خلاق اور ان سے پیدا ہونے والے افعال و اعمال کا، اس راز کو قرآن حکیم نے اس آیت میں پیش کیا ہے:-

مَا أَصَابَكُمْ مِنْ مُصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ أَيْدِيكُمْ وَيَعْفُوا عَنْ  
 تَمَّ كَوْنُكُمْ مَعْصِيَةً يَخْتِجِي بِهِنَّ وَهِيَ تَهَارِي بِهِنَّ

کے کیے ہوئے کاموں سے ہے اور بہت سے تو

کثیر۔ (پ ۵۶۲۵) درگزر ہی کر دیتا ہے۔

اسی راز کو کسی اور جگہ زیادہ واضح الفاظ میں یوں ظاہر فرمایا گیا ہے :-

أَوْلَمَّا أَصَابَتْكُمْ مُصِيبَةٌ قَدْ أَصَبْتُمْ  
مِثْلَهَا قُلْنَا لِمَ تَعْلَمُونَ هَذَا قُلْ هُوَ مِنْ  
عِنْدِ أَنْفُسِكُمْ ۗ

اور جس وقت تم کو ایک تکلیف پہنچی، کہ تم اس سے دو  
چند پہنچا چکے ہو، تو کہتے ہو کہ یہ کہاں سے آئی، آپ فرمادیجئے  
کہ یہ تکلیف تم کو تمہاری طرف سے پہنچی۔

صاحب کتاب (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس اصول کی تفسیر میں فرمایا کہ اِنَّمَا هِيَ أَعْمَالُكُمْ تُرَدُّ  
عَلَيْكُمْ، یہ تمہارے ہی اعمال ہیں جو تم پر لوٹاے جاتے ہیں، قرآن و خبر سے اس راز کو معلوم کر کے حکماء  
و صوفیاء اسلام نے یہ اصول قرار دے لیا ہے کہ

إِنَّ جَمِيعَ الوجودِ بِمَا بَدَلَكُمْ بِحَسَبِ مَا بَرَزْتُمْ مِنَ الْأَعْمَالِ فَانظُرُوا كَيْفَ تَكُونُونَ  
فَإِنَّ الظلَّ تَابِعٌ لِلشَّأخِصِ فِي الْعُوجِ وَالِاسْتِقَامَةِ (شیخ ابوالنجاء)

یعنی جو اعمال تم سے سرزد ہوتے ہیں ویسا ہی بدلہ بھی دیا جاتا ہے، اس لیے ذرا اپنے اعمال پر  
نظر رکھنا، کیونکہ ظل یا سایہ شخص کے تابع ہوتا ہے، اگر کوئی شے ٹیڑھی ہے، تو اس کا سایہ بھی  
ٹیڑھا ہوگا، اور اگر سیدھی ہے تو سایہ بھی سیدھا ہوگا جس نے توقع کی ٹیڑھی شے کا سایہ سیدھا  
ہو تو اس نے مجال کی تمنا کی۔ مَنْ طَلَبَ اسْتِقَامَةَ الظلِّ مَعَ عُوجِ الشَّأخِصِ فَقَدْ سَرَّاهُ  
المَحَالَّ۔ اس لیے یاد رکھو اور خوب سمجھ لو کہ یہ جو سوز و غم تمہارے قلب کو کھٹے جا رہا ہے نتیجہ  
ہے تمہارے ہی اعمال بدکا، مثلاً جب تم کسی کو دیکھتے ہو کہ وہ تم کو ناحق آزار پہنچا رہا ہے، بے وجہ  
تکلیف سے رہا ہے، زبردستی ستا رہا ہے، تو ذرا سوچ کر دیکھو کہ کیا تم نے بھی اسی قسم کی حرکت  
کسی معصوم و مظلوم کے ساتھ نہیں کی تھی، جس نے تم کو کوئی تکلیف نہیں پہنچائی تھی؟ ممکن ہے  
کہ فوراً یاد نہ آئے، لیکن تحت الشعور نفس کی گہرائیوں میں یہ واقعہ ضرور مندرج ہے، وہ ایک روز  
تمہارے غور و فکر کرنے پر ظاہر و باہر ہو جائیگا، ہر حادثہ اور مصیبت کے وقت اسی قسم کی سوچ بچار

لَهُ اِنَّمَا هِيَ اَعْمَالُكُمْ رَاحِصِيهَا عَلَيْكُمْ فَمَنْ وَجَدَ خَيْرًا فَحَسْبُكَ اللهُ وَمَنْ وَجَدَ غَيْرَهَا فَلَا يَلُومُنَ الْاَلَا

سے کام لیا جائے اور دیانتِ فکری کو ہاتھ سے نہ دیا جائے تو آدمی بالآخر اس امر کا قائل ہو جاتا ہے کہ اللوم علی لا علیہم ملامت مجھ پر ہے، میرے دشمنوں پر نہیں، کیونکہ حقیقی معنی میں میرا دشمن کوئی نہیں، میں ہی اپنی ذات کا بڑا دشمن ہوں، دوسرے دشمن میری ہی طبیعت کے پیدا کردہ ہیں ۶

زادۃ طبع من اند آنا نکه خصمان من اند (خاقانی)

اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کی جان و دل سے تصدیق کرنے لگیگا کہ اعدیٰ عدوک نفسا، التي بین جنباک تیرا سب سے بڑا دشمن تیرا وہ نفس ہے جو تیرے دونوں پہلوؤں میں ہے! درد و الم تیرے ہی ہاتھوں کی کمائی ہے، یداک کسبتا و فوک نفعیہ جو مصیبت و آفت، درد و غم، گناہوں کی عقوبت کے طور پر وارد ہوتے ہیں، ان کی پہچان بس یہی ہے کہ انسان نزولِ بلا پر صبر نہیں کرتا، اپنی جیسی بے بس و بیکس ہستیوں کی طرف اپیل کرتا ہے، جزع و فزع کرتا ہے، شکایتوں کا دفتر کھول دیتا ہے، 'مقام شکوی' میں داخل ہو جاتا ہے، اور 'مقام صبر' سے خارج ہو جاتا ہے، مصیبت کے دفع کرنے کا واحد علاج یہی ہے کہ اپنے اعمال کی اصلاح کی جانب توجہ کرے، اپنے نفس کا تزکیہ کرے، قلب کا تصفیہ کرے، اپنے سر کا اوہام باطلہ سے تخلیہ کرے، خیر کی جانب لوٹے، نور کی طرف پلٹے، ظلمتوں سے نکل جائے، غم و الم کی تاریکیاں خود بخود دور ہو جائیںگی، اور راحت و مسرت کا نور اس کی رگ و پے میں سرایت کرنے لگیگا۔

درد و غم وہ اشارات ہیں جو انسان کو اس کے اعمال کی جانب متوجہ کرتے ہیں، یہ خیر کی طرف ہدایت کرتے ہیں، ان کا وجود اس پر اسرار کائنات میں بے معنی نہیں، بشر محض نہیں، یہ خیر کے تحقق کا زبردست آلہ ہیں، خیر کی منزل تک لیجانے کا نہایت قوی ذریعہ ہیں، یہ جرائم و معاصی کی ظلمتوں کو رفع کرنے میں نور کا کام دیتے ہیں، ایک لفظ میں یوں

لہ قول شیخ اکبر۔ تیرے ہاتھوں نے کمایا، اور تیرے منہ نے پھونکا،



کہو کہ یہ خام کو نچتہ بنانے کے لیے ضروری ہیں، اقبال نے اسی مفہوم کو یوں ادا کیا ہے

جہاں ماکہ جزانگارہ نیست      اسیر انقلابِ صبح و شام است  
 ز سوانِ قضا ہموار گردد      ہنوز اس پیکرِ گلِ ناتمام است

سوانِ قضا پیکرِ خاکی کے نقص و تحدید کو، کجی و خامی کو غم و الم کے انگارہ سے دور کرتا جاتا ہے، اور اس کو کمال کی طرف کھینچ لاتا ہے!

(۲) بعض دفعہ درد و الم، سوز و غم، معاصی و جرائم کی عقوبت کے طور پر نہیں عائد کیے جاتے، مقصود محض سزا دینا نہیں ہوتا، بلکہ تطہیر ہوتی ہے، تکفیر و تہیص ہوتی ہے، شہوتوں اور لذتوں کے اتباع سے نفس میں تاریکی پیدا ہوتی ہے، اوامر الہی کی مخالفتوں سے قلب مردہ ہو جاتا ہے، درد و غم، سوز و الم نفس سے ظلمتوں کو رفع کرتے ہیں، مردہ قلب کو جلاتے جگلاتے ہیں، حق تعالیٰ کی طرف اس کا رخ پھیرتے ہیں، جو نورِ مطلق ہیں، وہ ان کی طرف رخ کر کے نورانی ہو جاتا ہے، اور گناہوں کی ساری تاریکیاں دور ہو جاتی ہیں، بلاؤں اور مصیبتوں سے نفس دب جاتا ہے، ذلیل و خوار ہو جاتا ہے، حق تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے، شہوتوں اور لذتوں سے ٹوٹ کر ان سے جڑ جاتا ہے، ربط قائم کر لیتا ہے، غم سے زیادہ موثر تطہیر کے لیے کوئی اور شے نہیں، اور بلا آتی ہے اسی تطہیر کی خاطر۔

ایں بلائے دوست تطہیرِ شما است (رومی)

اسی مقصود کو پیش نظر رکھ کر عارفِ روم درد و غم (قبض) سے رنجیدہ نہ ہونے کی تاکید فرماتے ہیں، اور اس کو سالک کے لیے مفید قرار دیتے ہیں۔

چونکہ قبض آمد تو درے بسط ہیں      تازہ باش و چینِ مفلکینِ بوجہیں

چونکہ قبضے آیدت لے راہ رو      آن صلاح تست آیس دل مشو

اس خیال سے صوفیائے کرام نے بلا و مصیبت کو حق کے انعامات سے زیادہ بہتر قرار دیا ہے، آلامِ محبوب بہ از انعامِ محبوب، بلا ہی عطا ہے، اور عطا پر غم کیسے، بلا از دوست عطا است و

از عطاء الیوم خطا است .

کے زائر تو بیزار شود جان حسین زخم چوں از تورسد با ہمہ آزار خوشم  
بلا و غم جب تکفیر و تمحیص کے لیے آتے ہیں تو اس کی صفات علامت یہی ہے کہ مبتلا جزع و  
نہیں کرنا، صبر جمیل سے کام لیتا ہے، دوستوں اور ہمسایوں کے سامنے اپنی مصیبت پیش  
کر کے شکوئی و شکایت نہیں کرتا، صبر کر کے بے حساب اجر کا امیدوار رہتا ہے۔

(۳) اور بعض دفعہ بلا و مصیبت محض تطہیر و تکفیر کے لیے بھی نہیں آتی بلکہ ارتفاع درجات  
اور بلوغ منازل عالیات اس کا مقصد ہوتا ہے، یہ قانون اہل اللہ کے متعلق ہے، جنہوں  
نے اپنے نفس کا تزکیہ کر لیا ہے، جن کے قلوب پاک و مصفی ہیں، جن میں ربط بحق قائم ہے، دیکھا  
جاتا ہے کہ کثرت سے بلائیں ان ہی پر نازل ہوتی ہیں، چنانچہ البلاء للولاء بلا دوستوں کے لیے  
ہوتی ہے، مشہور خاص و عام یہی ہے، اس قانون کو رازدان حقیقت صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں  
بیان فرمایا ہے۔ اذ احب اللہ عبداً ابتلاہ فان صبرا اجتباہ وان رضی اصطفاہ یعنی  
جب حق تعالیٰ بندے سے محبت کرتے ہیں تو اس کو مصیبت میں مبتلا کرتے ہیں، اگر وہ صبر کرے  
تو اپنا پسندیدہ بنا لیتے ہیں، اور اگر راضی ہے تو برگزیدہ قرار دے لیتے ہیں، اسی لیے حضرت  
معروفؓ فرمایا کرتے تھے:-

لیس بصادق فی دعواہ من لم یولہ مولاً کی مار سے لذت نہیں لیتا وہ سچا غلام

یتلذذ بضر ب مولاہ۔ ہی نہیں!

اس مفہوم کو کسی عاشق نے ان سریلے نغموں میں ادلیا ہے:-

جاں لب آمد ز درد کردم از درد و اطلب گفت اگر تو عاشقی صبر کن در رضا طلب

یارم کہ بر سر تیغ زند تو دم مزین سرفدا ہے یار کن ہیج نہ خون بہا طلب

مجھے مراد یار شوتا شود او بہ کام تو!

قابل التفات نیست عاشق مدعا طلب

انسان کی فطرت کے اقتضات و قابلیات کا جن کو حکیمانہ علم حاصل ہے، وہ اس راز کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں کہ منازلِ عالیہ تک رسائی کے لیے درد و غم لا بدی و لازمی ہے تقیّد جو انسان کی فطرت ہے، اطلاق کے کسی درجہ کی متحمل نہیں ہو سکتی، درد و الم ہی سے رفتہ رفتہ اضافی اطلاقیّت پیدا ہوتی جاتی ہے، یہ اطلاقیّت کیسا ہے، نفس کی تحدیدات سے رہائی پر ذمائمِ اخلاقیہ تحدید ہی کا نتیجہ ہیں، صفاتِ حسنہ کا پیدا کرنا مشقتوں کا برداشت کرنا ہی، تحمل مشاق موجب الم ہوتا ہے، لیکن ایک دفعہ جب صفاتِ حسنہ پیدا ہو جاتے ہیں تو انسان ترفع محسوس کرنے لگتا اور ہزاروں غموں سے نجات پاتا ہے، گو درد و غم کو وہ فطرۃً مگر وہ سمجھتا ہے، لیکن تلخ سے واقف ہونے کے بعد وہ حق تعالیٰ کے اس قول کی تصدیق کرنے لگتا ہے کہ

عَسَىٰ أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَيَجْعَلَ اللَّهُ فِيهِ خَيْرًا كَثِيرًا  
اس میں خیر کثیر رکھی ہو،

اولیا پر جو بلائیں نازل ہوتی ہیں، وہ ان کے درجات کے ارتفاع کے لیے ہوتی ہیں، حق تعالیٰ انہیں اپنا قرب عطا کرتے ہیں، فقر و نیستی میں انہیں مبتلا کرتے ہیں، درد و حزن ان پر طاری کرتے ہیں، ان سے ارشاد ہوتا ہے کہ البلاء کفر من کنوز الجنۃ لا يعطى الا بالعبادۃ۔  
عشاق بلا کی اہمیت و قیمت سے واقف ہوتے ہیں مستانہ وار وہ اس کے طالب ہوتے ہیں کہ:

درد و قدح درد کہ آں می باید      دردیکہ زتست بیشتر می باید  
تلخ است عجب لیک سے خوشگوار است      ہر چند ہی خورم دگر می باید  
کبھی وہ اپنے ساتھیوں کو یہ کہہ کر تسکین دیتے ہیں کہ

بفقر نیستی یک دوروزہ خوش می باش  
کہ یا خود ز کرم عذر خواہ ما میگرد

ان کے نزدیک جان کے مقابلہ میں تن کی زیادہ قدر نہیں اور جان کی قدر پر تو سے جاناں“

کی وجہ سے ہی، تن اگر تکلیف میں ہو، لیکن جان جاناں کے مراد کے مطابق ہو اور اس کے جمال سے  
کیف اندوز، تو پھر تن کی تکلیف کی کیا شکایت! اسی لیے بلا میں یہ عوام کا لانعام کے خلاف:  
(۱) کسی غیر کے آگے شاکہ نہیں ہوتے، اور اپنی تنگ دلی کا کسی کے سامنے اظہار نہیں کرتے  
کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ اِنَّهُمْ لَنْ يُّغْنُوْا عَنْكَ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا۔

ستم کشاں محبت دم از فغاں بستند      گرہ ز جبہ کشا ندو بردباں بستند  
(۲) اپنے باطن میں اہتمام اپنے رب پر نہیں رکھتے، اس کی حکمت بالغہ میں انہیں کوئی  
شک نہیں ہوتا، وہ حق تعالیٰ سے یہ خطاب سنتے ہیں۔

بادرد بسا ز چوں دوائے تو نم      در کس منگر کہ آتشکے تو نم  
گر بر سر کوئے عشق ما کشتہ شوی      شکرانہ بدہ کہ خون بہا تو نم

(۳) انہیں یقین کامل ہوتا ہے، کہ حق تعالیٰ نے جو بات ان کے لیے اختیار کی وہی ان  
کے لیے دین و دنیا میں اچھی ہے۔ ۶۔

صلاح ما ہمہ آنت کاں تراست صلاح

”حدیث الولی“ میں اس آخری نکتہ کو پوری وضاحت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، اس  
کا خلاصہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ میرے بندوں میں کوئی ایسا بھی ہے کہ  
تو نگرہ یا غنا کے سوا کوئی چیز اس کو صلاح نہیں کر سکتی، اگر میں اس کو فقیر کر دوں تو یہ  
فقر اس کے ایمان کو بگاڑ دے، اور کوئی ایسا بھی ہے کہ اس کو فقیری و درویشی کے سوا  
کوئی چیز نیک نہیں بنا سکتی، اگر میں اس کو غنی کر دوں تو غنا اس کے ایمان کو فاسد کر دے  
اور کوئی ایسا بھی ہے کہ اس کو صحت و تندرستی کے سوا کوئی چیز درست نہیں رکھ سکتی  
اگر میں اس کو بیمار کر دوں تو وہ بیماری اس کے ایمان کو بگاڑ دے، اور کوئی ایسا بھی ہے  
کہ بیماری کے سوا کوئی چیز اس کے ایمان کو درست نہیں رکھ سکتی، اگر میں اس کو تندرست  
رکھوں تو یہ تندرستی اس کے ایمان کو فاسد کر دے، مجھے اپنے بندوں کے احوال سے

پوری آگاہی ہے، اور میں ان کے مطابق اپنا کام کرتا ہوں۔  
 حق تعالیٰ کی ان ہی حکمتوں سے واقف ہو کر عشاق ان کی حسن تدبیر، قضا و اختیار  
 سے راضی اور مطمئن رہتے ہیں، اور ہر حال میں رضا بالعطارد اور حفظِ حال ضروری سمجھتے  
 ہیں، اور قلب کی گہرائیوں سے ۶

ہر چہ از دوست میرسد نیکوست

کے قابل ہوتے ہیں، اسی لیے گو وہ ”طبعی“ غم و اندوہ میں مبتلا ہوتے ہیں، لیکن ”عقلی سرور“  
 سے ان کے قلب خالی نہیں ہوتے! یہ ہے ”جمع بین الاضداد“ اور ”صندوں کی جمع کا یہ منہر“  
 ان ہی کو آتا ہے! رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ!

غرض طبعی حزن و غم کے لحاظ سے کلیہ یہ ہے کہ عالم ہمہ درداست و دروامی خواہد  
 یہ درد یا تو گناہوں اور بدکرداریوں کا نتیجہ ہے، یا تطہیر و تکفیر کے لیے وارد ہوتا ہے، یا رفع  
 درجات کے واسطے عائد کیا جاتا ہے، ہر حال

لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي كَبَدٍ (پا ۲۰۶) ہم نے انسان کو بڑی مشقت میں پیدا کیا۔

کے کلی قانون کا کوئی استثناء نہیں دکھائی دیتا، انسان کی ساری عمر محنت اور دکھ، غم و اندوہ  
 میں گذرتی ہے، سوز و الم میں بسر ہوتی ہے، وہ ایک موجِ بقیار کے مانند ہے، جس کی بہت  
 ہی میں پہنچ و تاب ہے۔ چنانچہ اقبال نے اس حقیقت کو خوب بیان کیا ہے۔

چہ پرسی از کجایم چستیم من؟ بخود پیچیدہ ام تازستیم من

دریں دریا چو موجِ بیسترام اگر بر خود نہ پیچیم یستم من

لیکن جیسا کہ اوپر واضح ہوا وہ درد و غم، سوز و الم بے معنی نہیں، بغیر مقصد و غایت  
 کے نہیں، اس کا مقصد خودی کی تعمیر ہے، قوتِ حیات کی توفیر ہے، اسی مقصد کو پیش  
 نظر رکھنے سے انسان کو طبعی درد کی حالت میں بھی عقلی سرور حاصل ہو سکتا ہے، یعنی اس  
 کو اپنی جہت سے غم ہی غم ہے لیکن حق تعالیٰ کی جہت سے سرور ہی سرور، اسی نکتہ کو سمجھ



عارفِ رومی نے فرمایا تھا۔

چوں بدانتی کہ نخل کیستی  
 فارغی گرمردی و گر زیستی  
 قطرہ نوری سراپا نور باش  
 بگذرا ز غم و انا مسرور باش

فَأَفْهَمُوا قَدَّ بَرًّا

# زندگی میں غم کیوں آتا؟

یہ مقالہ حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کے بارہویں اجلاس سلسلہ

میں پڑھا گیا تھا۔

اگر غم را چو آتش دود بوسے جہاں تار یک بوسے جاودانہ

دریں گیتی سراسر گر بہ گردی خرد مندے نیابی شادمانہ (شہید بلخی)

غم نتیجہ ہے احتیاج کا اور انسان سرتاپا احتیاج ہے، لہذا انسان غم کا پتلا ہے۔ لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي كَبَدٍ۔ رفع احتیاج ہی کے لیے وہ شب و روز حیران و سرگرداں رہتا ہے، تمام اسباب و علل کو کام میں لائے، درد کی دوا چاہتا ہے، احتیاج کا سلسلہ لائننا ہی ہوتا ہے۔ ایک احتیاج کی تشقی ہوتی ہے، تو دوس دوسری پیدا ہو جاتی ہیں، اور غم و الم برابر جاری رہتا ہے، لہذا کلیتہً یہ قرار پاتا ہے :-

عالم ہمہ دردست و دوا میخواید از خونِ گرم برگِ نوا میخواید

کس بے حاجت نمی تواند دیدن درویشِ غذا شہ اشہتا میخواید (سحابی استرابادی)

اس کلیتہً کا استثناء، الشاذ و کالمعدوم کا حکم رکھتا ہے۔ جس کسی سے پوچھیے ”میانِ دلِ چسپت“ جواب ملیگا، ”درونِ سینہ سوزے و تپے“ اگر پوچھا جائے ”تن چسپت“ کہیگا، ”غم ورنج و بلا را ہدفے“ کسی اور سوال کا انتظار کیے بغیر خود کہہ اٹھیگا، القصہ بہ قصدِ جاں مابستہ صغے، مرگ از طرفے و زندگی از طرفے۔

دل چسپت؛ درونِ سینہ سوزے و تپے تن چسپت؛ غم ورنج و بلا را ہدفے

لہ معارف میں جنوری ۱۹۷۷ء میں شائع ہوا۔

القصد بقصد جانِ مابستہ سے مرگ از طرفِ زندگی از طرفِ (ہونِ بندہ) مرضِ غم ہمہ گیر ہے، اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا لیکن یہ کلیتہً بھی مسئلہ ہے، کہ ہر مرض کا علاج مذہب اور فلسفہ اور نفسیات نے ہمیشہ پیش کیا ہے، کچھ دیر کے لیے آپ میرے ساتھ چند نسخوں پر غور کیجیے، ایک زمانہ سے میں نے ان کا اپنی ذات کے لیے اور دوسروں کے لیے بھی کامیابی کے ساتھ استعمال کیا ہے، میں پدرانہ نصیحت کے لیے نہیں کھڑا ہوں چند اساسی عقلی اصول کی طرف آپ کی عقل روشن کو متوجہ کرونگا، اگر یہ اصول آپ کی سمجھ میں آجائیں اور آپ ان کے استعمال پر راضی ہو جائیں تو شفا یابی یقیناً در نہ تضحیح اوقات کی معافی کا خواستگار ہوں غم کا حتمی و یقینی علاج مذہب پیش کرتا ہے، اس کی تائید فلسفہ اور نفسیات سے ہوتی ہے۔ اس علاج کے مختلف اجزاء ہیں، پہلا جزو:

(۱) زندگی کے خیر ہونے کا یقین: اگر آپ خدا کے وجود کے قائل ہیں (اور اسی صورت میں میرا آپ سے روئے خطاب ہے) تو آپ بھی یہ مانتے ہیں کہ خدا ہمہ خیر ہے، خیر مطلق ہے، خیر محض ہی، نیز وہ ہمہ توان یا قادر مطلق بھی ہے، آپ کا یہ بھی یقین ہے کہ ہر شے کا صدور خدا سے ہوتا ہے، زندگی کا مبدع خدا ہے، اس لیے زندگی کا خیر ہونا بدیہی طور پر لازم آتا ہے، اگر معاذ اللہ خدا خیر محض نہ ہوتا تو اس سے شر کا صدور ممکن تھا، یا اگر خیر مطلق ہونے کے باوجود قادر مطلق نہ ہوتا تو سمجھا جاسکتا کہ وہ خیر کے پیدا کرنے میں مجبور ہے، لیکن خدا کو خیر مطلق و قادر مطلق مان کر زندگی کے شر ہونے کا یقین کرنا نہ عقل ہی کے مطابق ہے، نہ نقل کے، بتائے مقدمات کے صحیح مانتے کے بعد منطقی نتیجہ سے گریز کیسے ممکن ہے؟ اور مقدمات کی توثیق مذہب اور وجدان سے ہوتی ہے، لہذا

ہر چہ بینی محض خیر و حکمت است      گر ترا زورِ حمت و گرز حمت است

زانکہ ناپذیرِ باطل از حکیم      فعل حق باطل نباشد کے سلیم

یہ دلیل تو میں نے اہل عقل کے لیے دی ہے، اہل عشق جن کی صفت ”یومنون بالغیب“ ہے

مبدد کائنات کو خیر محض ملتے ہیں، اس کے گرویدہ ہوتے ہیں (أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ) اور زندگی کے خیر ہونے کا انہیں راسخ یقین ہوتا ہے۔ علاجِ غم کے لیے یہ ضروری ہے کہ آپ اس یقین کو پختہ کریں کہ دنیا اچھی، زندگی اچھی، زندگی کے تجربات اچھے، زندگی کے ساتھ تعاون کرنا اچھا، اس تعاون کے نتائج اچھے، انجام اچھا! اسی یقین، اسی "الشدستی" و "خودگزینی" کی وجہ سے آپ بیک وقت جستِ قنوطیت، یاس، غم و اندوہ کی غلامی سے آزاد ہو جائیں گے! اس معاملہ میں "بے یقینی" آپ کو ہمیشہ کے لیے رنج و الم میں گرفتار رکھیگی، اقبال کی تہدید بھول نہ جائیے!

سُن اے تہذیبِ حاضر کے گرفتار غلامی سے تر ہے بے یقینی  
جب ہم یقین کر لیں کہ زندگی اور اس کے تجربات اچھے ہیں، اور ہمیں ان سے خوشی کے ساتھ تعاون کرنا چاہیے، اور پھر خوشی کے ساتھ تعاون کرنے کے لیے کھڑے ہو جائیں تو ہم میں اور زندگی کے واقعات میں توافق پیدا ہو جاتا ہے، اور حالات خود بخود سدھرنے لگتے ہیں، شادمانی و کامیابی نصیب ہوتی ہے، یہ ایک راز ہے، مذہبی زندگی کے تجربات کا، جو میں آپ پر فاش کر رہا ہوں!

یہ محض ایک اعتقادی بات نہیں ہے، بلکہ مسلمہ نفسیاتی اصول پر اس کی بنیاد قائم ہے، خیالات کا اثر افعال پر ہوتا ہے، اور افعال ہی آثار میں تغیر پیدا کرتے ہیں، قنوط و یاس خوف و حزن پیدا کرتے ہیں، اور یہ وہ سلبی جذبات ہیں جو قوائے عملی کو مفلوج بنا دیتے ہیں، خیالات اور جذبات اگر سلبی ہوں تو سیرت اور قسمت کے سیدرو ہونے میں باقی کیا رہتا ہے، کیونکہ نفس کا یہ ایک ہمہ گیر قانون ہے کہ خیالات ہی سے مقاصد کی تشکیل ہوتی ہے، مقاصد عمل میں ظہور پذیر ہوتے ہیں، اعمال عادات کا تعین کرتے ہیں، عادات کی ترتیب و تنظیم سے سیرت بنتی ہے اور سیرت ہی تو قسمت ہے، انسان کی زندگی میں وہ دن نہایت ہی مبارک ہوتا ہے، جب اس کو اس امر کی یافت

ہوتی ہے کہ وہ خود ہی اپنی قسمت کا بنانے اور بگاڑنے والا ہے اس کی ذات ہی میں اس کے آلام کے اسباب پہنا ہوں اور وہیں راحت و شادمانی کے علل کا نشان ملتا ہے! آقا کے نزول پر خدا کو ظالم اور اپنی ذات کو مظلوم ٹھہرانا نہ صرف الحاد ہے، بلکہ کج فہمی اور بے وقوفی بھی، جب تم خدا کو ہمہ خیر مان کر تمام اچھی صفات سے متصف کرتے ہو تو پھر اس کی طرف ظلم کی نسبت کیسے ہو سکتی ہے اور خدا ظالم بن کر لائق عبادت کیسے ہو سکتا ہے؟ اور جو لائق عبادت و استعانت نہ ہو وہ خدا کیسے ہو سکتا ہے؟ اب اگر خدا پر یقین باقی رہ سکتا ہے تو صرف اسی صورت میں کہ خدا کو ظالم نہیں عادل مانا جائے، اب ظلم کی نسبت ہمیں اپنی ذات کی طرف کرنی پڑیگی، اور اسی کو تمام مصائب و آلام کا مبدی قرار دینا پڑیگا۔ مَا أَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللَّهِ وَمَا أَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَفْسِكَ۔

ان حقائق کے سمجھ لینے کے بعد تم حرات کے ساتھ یقین کر لو کہ دنیا اچھی، زندگی اچھی اور اس کے واقعات و تجربات اچھے نقص، کجی، یا شکر میں ہے، تو تمہاری ہی ذات میں ہے، مصائب کے نزول کے وقت قضا و قدر پر اعتراض نہ کرو، بلکہ توافق بالقضا سے کام لو، اس احساس کو قلب میں نہ آنے دو کہ تم پر ظلم ہو رہا ہے، اور تم قابلِ رحم ہو، کیونکہ اس احساس کے ساتھ ہی تم خدا کو ظلم سے متصف کرنے لگو گے، اور اپنے کو بے خطا و بے قصور قرار دو گے، اور تم نے دیکھا ہے کہ واقعہ ہمیشہ اس کے خلاف ہوتا ہے! اپنی ذات کو بے خطا و بے قصور سمجھنا جب کہ وہی تمام سو کا مبدی ہو، کس قدر عظیم الشان مغالطہ ہے، ایسی صورت میں کیا اصلاح نفس کی گنجائش بھی باقی رہتی ہے؟ کیا ترقی کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند نہیں ہو جاتا؟ جو شخص اپنی ہی جان پر ترس کھا رہا ہو، اپنی ہی قسمت پر آنسو بہا رہا ہو۔ اپنی ہی تقدیر کی شکایت میں ہمیشہ مصروف رہتا ہو، اور ساری دنیا کو اپنا مخالف سمجھتا ہو، میرے نزدیک اس قابل ہے کہ کوہِ ہمالیہ کی چوٹی سے نیچے گرا دیا جائے تاکہ اس کو بھی نجات ملے اور دنیا بھی خس و خاشاک سے پاک ہو جائے۔ اقبال ایسے ہی بد بخت سے مخاطب



ہو کر کہتا ہے :

جام تو فریادی بیدار سنگ	اے زبورِ چرخ ناہنجا رنگ
سینہ کو بہائے پیہم تا کجا	نالہ و فریاد و ماتم تا کجا
لذتِ تخلیق قانونِ حیات	در عمل پوشیدہ مضمونِ حیات
شعلہ در بر کن خلیل آوازہ شو	خیز و خلاقِ جہان تازہ شو
ہست در میدان سپر انداختن	با جہان نامساعد ساختن
می شود جنگ آزما با آسماں	گرد سازد با مزاج او جہاں
میدہ ترکیب نو ذرات را	بر کند بنیاد موجودات را
روزگارِ نو کہ باشد سازگار	میکند از قوت خود آشکار
ہمچو مرداں جاں سپردن زندگی است	در جہاں نتواں گردانہ زیت

یقین کی اساس قائم ہونے کے بعد عمل کی مشید عمارت اٹھائی جانی چاہیے، اب تک ہم نے اس امر پر زور دیا کہ یقین درست کرنا چاہیے، یقین کی زندگی اچھی چیز ہے، اور زندگی کے واقعات و تجربات اچھے ہیں، ان کے ساتھ تعاون ضروری ہے، یہ علاج غم کے نسخہ کا پہلا جزو تھا، اس کا دوسرا جزو عمل ہے، جس کو زندگی کے ساتھ تعاون کہا جاسکتا ہے۔

(۲) عمل، سبب غم احتیاج، احتیاج کا دفعیہ عمل ہی سے ممکن ہے، لیکن یہ ضروری نہیں کہ عمل ہمیشہ کامیاب ہی ہو، اور ساری احتیاجات کو رفع کر سکے، عمل کو کامیاب بنانے اور ناکامی کی صورت میں غم و اندوہ سے متاثر نہ ہونے کا بھی کوئی طریقہ ہو سکتا ہے؟ بات بڑی آسان ہوتی، مگر انسان کی ساری احتیاجات عمل سے رفع ہو جاتیں، اور وہ محض چین و راحت کی زندگی بسر کر سکتا، عمل کے دوسرے نتائج ہو سکتے ہیں کامیابی یا ناکامیابی، عام طور پر فطرت کا یہی اصول ہے کہ مجاہد کے آگے دنیا اپنا سر جھکاتی ہے، مجاہد خطرہ ہی کی زندگی کو حقیقی معنی میں زندگی سمجھتا ہے، اگر خواہی حیات اندر خطر زمی ناکامی سے یہ مایوس ہو کہ

نالہ و فریاد، سینہ کوبی اور ماتم نہیں کرتا، کیوں؟ اس کے چند تیقنات و عقائد ہیں ان ہی کی تحلیل سے علاجِ غم کے دوسرے جزو کی تشریح ہو جائیگی۔

جہادِ زندگی کو جہادِ اکبر سمجھتا ہے، دشمنوں سے جنگ اور میدانِ کارزار کا جدال و قتال اس کے نزدیک جہادِ اصغر ہے۔ اس کا بنیادی یقین یہ ہوتا ہے کہ حق بالاخر کامیاب ہوگا اور باطل کو شکست ہوگی، چونکہ وہ ہمیشہ حق کے غلبہ و استیلاء کے لیے جہاد کرتا ہے اس لیے اس کو یقین ہے کہ خدا سے نصرت و تائید کا پانا اس کا حق ہے۔ **كَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِينَ** اس وعدہ اور یقین کی وجہ سے ”احساسِ کمتری“ یک لخت اس سے مفقود ہو جاتا ہے، اب وہ کامیابی کے یقین کی ناقابلِ مدافعت قوت کے ساتھ عمل کرتا ہے، اس کا ایمان ہوتا ہے کہ تمام حول و قوت من اللہ ہے، **لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللَّهِ**! وہ صرف اللہ ہی کو قائل اور موثر حقیقی سمجھتا ہے، اور خود کو امین و خلیفہ، قوت و اثر و حرکت میں وہ اللہ ہی سے استعانت کرتا ہے، اور اسی کے سامنے سرِ عبودیت خم کرتا ہے، ذل و افتقار کی اسی سے نسبت رکھتا ہے، عبادت و استعانت میں وہ اپنی نسبت صرف اللہ ہی سے رکھتا ہے، اور فانی عن الخلق ہوتا ہے، یعنی نہ مخلوق سے استعانت طلب کرتا ہے، اور نہ ان کے سامنے سرِ نیاز جھکاتا ہے گفنی باللہ و کیلا اس کا ماٹ ہے، فاتخذ وہ و کیلا اس کا اصولِ عمل **قُلِ اللّٰهُ ثُمَّ ذَرْهُمْ** اس کا طریقہ کار جسبی اللہ اس کا راحتِ جان کلمہ، ایک لفظ میں وہ موجد ہوتا ہے، اور **لَا إِلَهَ إِلَّا اللّٰهُ** کا قائل و مصدق و عامل۔

اس یقین و عقیدہ کی تحریک سے اس کا ہر عمل پیدا ہوتا ہے، اب جیسا کہ ہم نے اوپر کہا عمل کے دو ہی نتائج ہوتے ہیں، کامیابی یا ناکامیابی، کامیابی میں وہ شکر کرتا ہے، کیونکہ وہ اس راز سے واقف ہے جو ایک مسلمہ نفسیاتی اصول پر مبنی ہے کہ شکر سے نعمت میں اضافہ ہوتا ہے، قوتِ عمل میں جوش پیدا ہوتا ہے اور تسخیرِ کائنات آسان ہو جاتی ہے۔ **لَئِنْ شَكَرْتُمْ** اور **زِيدَنَّكُمْ** کا قطعی وعدہ اس کو مسرور کرتا ہے، وہ اس کامیابی اور نعمت کو خدا کی جانب سے سمجھتا ہے

اور خلق کی طرف اس کی نسبت نہیں کرتا، گو خلق ہی کے ہاتھ سے نعمت ملتی ہے، لیکن محض بمنزلہ اسباب و آلات و ادواتِ نعمت ہوتے ہیں، قائم و مجری و موجود و فاعل و مسبب صرف اللہ ہی ہوتا ہے، اس لیے وہی شکر کا مستحق ہے، مثلاً جب تمہیں تمہارا کوئی دوست ہدیہ بھیجتا ہے تو تمہاری نظر اس خادم کی طرف نہیں جاتی جو یہ ہدیہ تمہارے یہاں لے کر آیا ہے، بلکہ اپنے دوست کے تم شکر گزار ہوتے ہو، جس نے تمہیں یہ بھیجا ہے۔ منعم حقیقی اللہ ہے العاطی اللہ۔ وَمَا بِكُمْ مِنْ نِعْمَةٍ فَمِنَ اللَّهِ اس ادراک سے نعمتِ زوال کے خطرہ سے آزاد ہو جاتی ہے، یہ ایک عظیم الشان حکمت ہے، جس کو بصیرت محمدیہ نے بنی نوع انسان کے سامنے پیش کیا ہے۔ اس راز کو ان الفاظ میں ادا کیا گیا ہے :

النعمۃ وحشی فقید ما بالشکر نعمت ایک وحشی جانور ہے شکر کی زنجیروں سے اس کو باز ہو۔  
تفسیر ہے باری تعالیٰ کے اس قول کی کہ لَنْ شُكْرُكُمْ لَزَيْدٍ تَكْم۔

موجد جب اپنی جدوجہد میں ناکام ہوتا ہے تو یاس و حزن، خوف و الم کا شکار نہیں ہو جاتا، کیوں؟ اس لیے کہ وہ کائنات کے ایک قدیم راز سے واقف ہوتا ہے جو دفعِ غم کے لیے اکسیر ہے، اور جس کو بصیرت محمدیہ نے دریافت کیا ہے، وہ کیا ہے؟ یہی کہ بلاؤں پر صبر کرنے سے بلائیں نعمتوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں، ذرا نقیاتی نقطہ نظر سے اس قانون پر غور کرو، مصائب کے نزول کے وقت صبر سے بہتر کوئی اور پہلو ذہن اختیار بھی کر سکتا ہے؟ حزن و یاس سے قوائے عمل مفلوج ہو جاتے ہیں، مصیبت کے مقابلے اور برداشت کی قوت فنا ہو جاتی ہے، تردد و فکر بھی عمل کے قاتل ہیں، تشنّت اور پریشانی کو بڑھاتے ہیں، گلہ و شکوہ تو نامردی کی صریح علامت ہے، "کلبیت" استہزا و استخفافِ غم کی دار و نہیں، بلاؤں کے نزول کے وقت جب انسان حق تعالیٰ کی گزشتہ عطاؤں کو یاد کر کے صبر کر لیتا ہے، تو حق تعالیٰ اس کے قلب کی حفاظت کر لیتے ہیں، مستغنی کر دیتے ہیں، اب بارِ غم سبک ہو جاتا ہے، برداشت کی قوت بڑھ جاتی ہے اور وہ انہی بلاؤں میں عطاؤں کو پاتا ہے۔

خود بلا و ابتلا کی ماہیت کے متعلق مجاہد صحیح علم رکھتا ہے، ہر بلا ایک اخلاقی سبق دینے آتی ہے، یہ ہمارے کسی نہ کسی نقص کو رفع کرتی ہے، اور اخلاقی اعصاب کو قوی کرتی ہے، سیرت میں سختی پیدا کرتی ہے۔ اس طرح ہمارے مراتب بلند کرتی ہے اور درجات میں ترقی دیتی ہے، یہ بظاہر شر ہے، لیکن دراصل خیر کے تحقق کا ایک ناگزیر ذریعہ ہے، زندگی ایک مدرسہ ہے، واقعات زندگی کے ذریعہ معلوم حقیقی ہیں ہر روز سبق دے رہا ہے، اگر ہم میں عقل ہے تو ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہماری ہر ناکامی میں ایک حکمت ہے اور ایک خاص عظمت، سوائے اس ناکامی کے تجربہ کے دنیا کی کوئی اور شے ہمیں نہ یہ درس حکمت دے سکتی ہے اور نہ عظمت کے اس درجہ پر فائز کر سکتی ہے، ہر غلطی جو تم سے سرزد ہوتی ہے ایک اہم سبق سکھاتی ہے، اگر تم اس کی تحقیق کرو اور جو شخص کہ اس شے میں جو بظاہر شر معلوم ہوتی ہے، خیر کو دریافت کرنے کی کوشش کرتا ہو وہ واقعات کا محکوم نہیں حاکم ہے، ناکامی اس کے لیے ایک صبارتفا مرکب ہے جو اس کو بہترین کامیابی تک پہنچاتا ہے۔

بلا کی شدت اگر تمہیں بالکل ہی مغلوب کر لے، اور اس کے خیر اور فائدہ کے جزیرے مستفید ہونے کے قابل نہ رکھے تو پھر تمہیں صبر ہی کے دامن میں سکون ملیگا، اور صرف مذہب ہی تمہاری دلجوئی کرے گا، ان وعدوں اور بشارتوں پر غور کرو جو مومن صابر کے حق میں وارد ہوتی ہیں، اگر تم میں ایمان ہے اور ایمان کا ذوق بھی موجود ہے، تو یقیناً تمہارا غم ہلکا ہو جائیگا، صابر خدا کا محبوب ہوتا ہے **إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الصَّابِرِينَ**۔ درد مند صابر خدا کی معیت کا ادراک کرتا ہے، کیونکہ **إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ**، اس امر کا یقین کہ خدا میرے درد و غم سے واقف ہے، کیونکہ وہ میرے ساتھ ہی ہے، غم کی چھین کو کم کر دیتا ہے، اور **وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ** یا **عَيْنِنَا** کا حکم اور بشارت تو اس کو نقص میں لے آنے کے لیے کافی ہے! مشہور ہے کہ کسی عاشق پر سربازار منانوں سے تازیانے لگائے گئے اور اس نے آہ تک نہ کی، جب سواں تازیانہ لگا، تو اس نے آہ کرنی شروع کی، پوچھا گیا کہ اس آخری تازیانے پر آہ و بکا کیسی؟ کہا جس کے

سب مارکھائی ہے، وہ ننانوے بازیانوں تک یہاں تماشائیوں میں موجود تھا، اور میری حالت دیکھ رہا تھا، اس لیے مجھے کچھ بھی درد محسوس نہ ہوا، آخری تازیانے کے وقت وہ چلا گیا، اور اس وقت میں نے درد محسوس کیا! ۷

بازد بسا زچوں دولے تو منم      در کس منگر کاشنکے تو منم  
گر بر سر کوئے عشق ماکشته شوی      شکرانہ بدہ کہ خون بہا تو منم (جامی)

صبر پر استقامت پیدا ہو جائے تو تسلیم و رضا کا آخری مرتبہ حاصل ہو جاتا ہے، اب مجاہد صاف طور پر محسوس کرنے لگتا ہے، کہ بلا از دوست عطا است و از عطا نالیدن خطا ست، البلاء کثر من کنوز الجنة لا یعطی الا باولیائہ کی وہ تصدیق کرنے لگتا ہے، اب نہ شکوہ شکایت ہی کا امکان باقی رہتا ہے، اور نہ جزع و فزع کا،

ستم کشان محبت دم از قعاں بستند      گرہ ز جبہ کشادند بر زباں بستند  
سچ ہے درد و غم کا قطعی علاج تسلیم و تفویض ہے اس کے سوا کچھ نہیں ۷  
تسلیم مئی شوی ازاں غم گیتی      تسلیم شو ہر انچہ آید پشت  
رضا با لعا اور حفظ حال سے نہ صرف غم ہی دور ہو جاتا ہے اور فرح و سرور کے دروازے کھل جاتے ہیں، بلکہ حق تعالیٰ بھی قطعی راضی ہو جاتے ہیں، اور جانتے ہو کہ ان کی رضامندی کا کیا نتیجہ ہوتا ہے؟

آنا کہ رضا حق بجاں میجویند      در را و رضا کے ادب سیری پویند  
ہر یک ہمہ آن کند کہ حق فرماید      حق نیز ہماں کند کہ ایشاں گویند

قال علیہ السلام ان الله رجلا یرضی برضاہم و یغضب بغضبہم کما انہم یرضوا برضاہم و یغضبوا بغضبہم

ہر چہ خواہی آن کند گر ہر چہ خواہد آن کنی  
انچہ گوئی بشنود گر ہر چہ گفت او بشنوی



لے درد! تو بھی کیا نعمت ہے، تیری برداشت نے مجھے کیسے کیا کر دیا!

دردہ قدر درد کہ آن می باید

دردیکہ زتست بیشتر می باید

تلخست عجب لیک بسر خوش خوار است

ہرچند ہی خورم دگر می باید

# قرآن اور علاج غضب

یہ مقالہ حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کے چودھویں سالانہ اجلاس نومبر ۱۹۶۲ء میں پڑھا گیا۔

تا تو ابانی خستہ مگرداں کس را      بر آتش خشم نوش مستاں کس را  
گر راحت جاوداں طمع میداری      می رنج ہمیشہ و مرخاں کس را (عطار)

انسان کی مادی دروہانی ترقی میں جو شے سب سے زیادہ مانع و مزاحم نظر آتی ہے وہ جذبہ غضب ہے! اس آتش فشاں جذبہ کے اشتعال کے وقت انسان انسان نظر نہیں آتا، بلکہ وہ ایک مہیب غار کا منظر پیش کرتا ہے جو دقانی آگ سے پڑے جس میں سوائے خوفناک آوازوں اور جاں سوز چنگاریوں کے کچھ نہیں نکلتا، اسی لیے اہل غضب اپنا نسب شیطان سے ملاتے ہیں کیونکہ اسی نے تو کہا تھا کہ خَلَقْتَنِي مِنْ نَارٍ۔

ترا با چیں تندی و سگر کشی      نہ پندارم از خاک از آتشی!

ایک غضبناک شخص کو اعصابی تناؤ کی حالت میں دیکھ کر حضرت حسنؑ نے خوب فرمایا تھا کہ اے شخص تو غصہ میں اتنا اچھلتا ہے کہ مجھے ڈر لگتا ہے کہ اب کی اچھال میں تو دوڑخ میں جا پڑیگا۔ اس قابل لغزت جذبہ کے تسلط کے وقت انسان کی صورت پاگل یاد رکھ کی سی ہو جاتی ہے، دماغ اور اعصاب سیاہ دغانات سے بھر جاتے ہیں، نور عقل تاریک ہو جاتا ہے، خون میں زہر پیدا ہو جاتا ہے، دنیا تاریک نظر آنے لگتی ہے، اس تاریکی میں اس کو نیک و بد کی تمیز نہیں رہتی دوستی اور محبت کے پاک رشتے، قرابت اور رحم کے مقدس تار، عزت و حرمت کے قیمتی روابط ایک ہی ضرب میں پاش پاش کر دیے جاتے ہیں،

لے معارف فروری ۱۹۶۳ء میں شائع ہوا۔

تذخو کا دنیا میں کوئی دوست نہیں، پاگل اور مجنوں کا کوئی دوست کیسے ہو سکتا ہے، اس کی قسمت میں سوزش و تپش لکھی ہوتی ہے، اسی سوز و غم کی وجہ سے وہ اطمینانِ قلب اور طمانیتِ خاطر سے محروم ہوتا ہے، اور جب قلبِ مطمئن نہ ہو تو بدن کیسے تندرست رہ سکتا ہے، اس جہاں فانی میں شاداں زندگی کے نسخے کے یہی دو اجزاء تو ہیں، صبح و تندرست بدن اور مطمئن و آزاد ذہن تذخو ان دونوں سے محروم! اس کی سیاہ بختی و سیاہ روئی میں کسی کو شک کیسے ہو سکتا ہے، اب سوز و تپش، غم و ہم، رنج و حزن کے سوا اس کے ہاں ذخیرہ کس چیز کا ہوتا ہے؟

سوز و تپش قسمت ہر تذخو بود برق از زبان حال مراجستہ جستہ گفت

غرض غضب کا جذبہ ہر بڑائی کی کنجی ہے، (حضرت جعفر صادقؑ) یو قوفی کی جڑ ہے، مسرت و شادمانی کا قاتل ہے، ایمان سوز ہے، اور طمانیت کش، اسی لیے جب بنی نوع انسان کے محسنِ اعظم آنحضرت صلعم (فداہ ابی وامی) سے کسی نے درخواست کی کہ مجھے اپنی زندگی کو سنوارنے کے لیے ذرا سا عمل بتلا دیجیے، تو آپ نے فرمایا لا تغضب یعنی تو غصہ نہ کر، جب اس نے دوبارہ یہی سوال کیا تو یہی جواب دیا گیا، اور تیسرے مرتبہ کے سوال کا بھی یہی جواب ملا، کسی دوسرے موقع پر آپ نے ارشاد فرمایا تھا کہ حق تعالیٰ کے نزدیک کسی گھونٹ کا پینا اس قدر محبوب نہیں جس قدر کہ پی جانا غصہ کا۔

قرآن کریم نے الْكَاطِمِينَ الْغَيْظَ وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ کی تعریف کی ہے، اور ان کے اتباع کی تخریص و تاکید۔

کیا اس خو خوار جانتاں جذبہ سے نجات ممکن ہے؟ علمائے نفسیات کا کیا خیال ہے؟ قرآن کریم نے کیا طریقے تعلیم کیے ہیں؟ کیا علم کی تصحیح عمل میں انقلاب پیدا کر سکتی ہے؟ کیا ریاضت و مجاہدہ غصہ کو محو کر سکتا ہے! انہی چند اعتبارات پر یہاں بحث کرنی مقصود ہے ہشدار کہ رہ خود بخود گم نہ کنی؟

سقراط نے ایک ازلی صداقت کو اپنے الفاظ میں پیش کر دیا تھا کہ نیک علم ہے "یعنی علم صحیح ہی سے نیک عمل پیدا ہوتا ہے، بشرطیکہ علم زبان ہی کی حد تک محدود نہ رہا ہو، بلکہ قلب میں بھی اترا ہو، تمیق کے درجہ تک پہنچا ہو، جو شخص علم کو زبان ہی کی حد تک محدود رکھتا ہے۔ اس کو زبان سنت میں "علم باللسان" اور "جاہل بالقلب" کہا گیا ہے، اس کا شمار ان واعظوں میں ہوتا ہے جن کی شکایت حافظ نے اپنی اس مخلود الذکر شعر میں کی ہے:

واعظاں کیں جلوہ بر محراب منبری کنند

چوں بخلوت میروند آں کار دیگر می کنند

علم صحیح بہر حال ضروری ہے، اور پھر اس کے مطابق عمل ہو تو فلاح انسان کے ہاتھ چوتی ہے، جذبہ غضب کی تعدیل کے لیے بھی یہ دونوں ضروری ہیں، اس لیے ہم یہاں ان ہی دو کے متعلق دو باتیں عرض کرتے ہیں:-

(۱) علم صحیح :- یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ انسان کسی چیز کو محبوب رکھتا ہے اور کسی چیز کو مبغوض و مکروہ، وہ محبوب چیز کے حصول کے لیے کوشش کرتا ہے، اور اس کے تحفظ کا خواہاں و مہتمم ہوتا ہے، اور مکروہ شے سے بھاگتا ہے، اور اس کو دفع کرنا چاہتا ہے، یہ اس کی فطرت ہے، وہ اسی پر مجبور ہوا ہے، جب اس کی مخالفت کی جاتی ہے تو اس کو غصہ آتا ہے، بذات خود غصہ بُری چیز نہیں، یہ مدافعت کا آلہ ہے، تحفظ حیات کے لیے ضروری ہے، استمرار نسل کے لیے ناگزیر ہے، تنازع و للبقا میں اس کا خاص مقام ہے، اس کے بغیر ارتقا میں نسل انسانی کا بقا ممکن نہ تھا، جس طرح کائنات خارجی میں عنصر ناری ضروری ہے اس کے عدم سے اختلال رونما ہوتا ہے، اسی طرح فطرت انسانی میں جذبہ غضب بھی ضروری ہے، اس کے فقدان سے تباہی پیدا ہوتی ہے، موت لازم آتی ہے، اب غضب کے تین درجے ہوتے ہیں:-

(۱) تفریط: یعنی کمی، یہ بالاتفاق مذموم ہے، ایسے ہی آدمی کو بے غیرت کہا جاتا ہے۔

امام شافعی نے کہا تھا کہ جس شخص کو غصہ دلانے سے بھی غصہ نہ آئے وہ "گدھا ہے" حمیت و غصہ کا بالکل نہ ہونا بھی سخت بُرا ہے، اگر کسی شخص کی بیوی اس کے ساتھ خیانت کیے فحش کا ارتکاب کرے، اور وہ علم سے کام لے تو بتاؤ کیا یہ عقلاً، شرعاً و عرفاً سخت مذموم نہیں؟ غصہ کا صحیح موقع پر استعمال ضروری ہے، حق تعالیٰ نے صحابہ کرام کی صفت "اشداء عَلَى الْكُفَّارِ" قرار دی، اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم فرمایا کہ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِينَ وَأَعْلَظْ عَلَيْهِمْ، ظاہر ہے کہ شدت و غلظت غضب کے بعد رونما ہوتی ہے، لہذا

قہر و لطف اندر محسوس خود نکوست جائے گل گل باش جلے خار خار

(۲) افراط: یعنی زیادتی، یہ بھی بالاتفاق مذموم ہے، اسی سے نجات کے طریقوں پر یہاں غور کیا جا رہا ہے، جب غضب عقل و دین کی سیاست و قہرمانی سے نکل جاتا ہے تو انسان درندہ بن جاتا ہے، تمام دنیوی و روحانی اقدار سے محروم ہو جاتا ہے، جنون کا تسلط اس کے دماغ پر ہو جاتا ہے، اہل غضب کی فرست میں اس کا شمار ہونے لگتا ہے، جن کے متعلق یہ کہنا صحیح ہوتا ہے کہ ۶

سایہ جن میں یہ انسان رہا کرتے ہیں

(۳) اعتدال: یہ درجہ محمود ہے، یہاں انسان کا غصہ عقل کی قہرمانی میں ہوتا ہے، دین کا مطیع ہوتا ہے، اس کے اشارہ کا منتظر ہوتا ہے، جہاں حمیت شرعاً واجب ہوتی ہے وہاں وہ شدت سے کام لیتا ہے، اور جہاں اس کا پی جانا ضروری ہوتا ہے وہاں وہ حد اعتدال سے نہیں بڑھتا، اپنے نفس کا مالک ہوتا ہے، جانتا ہے کہ ایسے موقع پر ۶

ہر کراہی علم نیست او چو در دست

ظاہر ہے کہ ہم یہاں غضب کے استیصال کی تعلیم نہیں دے رہے ہیں، بلکہ اس کے اعتدال کی ہم غضب میں افراط و تفریط کو رفع کر کے وسط کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں، کہ خیر الامور اوسطها۔



دیکھو غصہ کا کوئی معروض ضرور ہوتا ہے، یعنی اس کا تعلق کسی شے سے ہوتا ہے، اب اس معروض کی تین شکلیں ہوتی ہیں۔

(۱) ایک وہ جو سب کے لیے ضروری اور لازمی ہے جیسے غذا، لباس، مکان، صحت، جب ان پر حملہ کیا جاتا ہے تو شعلہ غضب ان کے تحفظ کے لیے بھڑک اٹھتا ہے، حفاظت ذات و بقائے نسل کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہر جاندار اپنے دشمن کا مقابلہ کرے اور ضروریات زندگی کے تحفظ میں شدت و قوت کا استعمال کرے، ورنہ وہ صفحہ ہستی ہی سے حرفِ غلط کی طرح مٹ جائیگا، اور یہ فطرت کا مقصود نہیں، مجاہدہ اور ریاضت سے اس قسم کے غصہ کو محو کرنا ممکن نہیں، اور نہ ہی اس کی کوشش ہی کرنی چاہیے، کیونکہ یہ خلافِ فطرت ہے، اور غیر اختیاری، غیر اختیاری شے پر حکمِ اخلاقی لگایا نہیں جاسکتا، ہاں یہاں بھی حدِ اعتدال سے تجاوز، ظلم و ستم ناروا ہے اور تکلفِ علم و برداشت کرتے کرتے تحمل کی عادت پیدا کی جاسکتی ہے۔

(۲) غصہ کے معروض کی دوسری قسم میں وہ اشیاء داخل ہیں، جو بعض کے لیے تو ضروری ہیں، اور بعض کے لیے غیر ضروری جیسے صنّاع کے لیے آلات و اوزار اور عالم کے لیے کتابیں، اگر ان محبوب اشیاء کو نقصان پہنچتا ہے، تو رنج ہوتا ہے، اور نقصان پہنچانے والے پر غصہ آتا ہے اس قسم کے غصہ کا بھی بیخ و بن سے استیصال نہیں کیا جاسکتا لیکن مجاہدہ سے غصہ کی شدت باطن میں باقی نہیں رہتی اور صبر کی خو پیدا ہو سکتی ہے، اور سختی صبر کا احساں کم ہو سکتا ہے۔

(۳) غصہ کے معروضات کی تیسری قسم میں وہ اشیاء شامل ہیں، جو کسی کے لیے بھی ضروری نہیں، جیسے مال و جاہ، خدم و حشم یہ عادتِ محبوب ہیں، لیکن قطعاً داخلِ ضرورت نہیں، یعنی ضروریاتِ زندگی میں ان کا شمار نہیں کیا جاسکتا، یہ "نعیشتِ محض" میں شامل

لہ مقالہ سر اجیاء العلوم باب غضب۔

ہوتے ہیں، جو غیظ و غضب ان کے تعلق سے پیدا ہوتا ہے وہ ریاضت و مجاہدہ سے قطعاً قابلِ استیصال ہے، ہم یہاں جو کچھ عرض کر رہے ہیں، اس کا زیادہ تر تعلق اسی قسم سے پیدا ہوتا ہے۔

جب ہم غصہ کی نفسیات پر غور کر کے یہ معلوم کر لیتے ہیں کہ اس کا انبعاث محبوب اشیاء کے فقدان یا ضیاع سے ہوتا ہے، تو ہمیں ایک صداقتِ کلیہ کا صحیح وجدانی علم حاصل ہوتا ہے اور وہ یہ کہ غیظ و غضب کا اصل مبداء "حُب اشیاء" ہے، جس طرح تمام حزن و ملال کا مبداء بھی یہی حُب اشیاء ہے، نیز تمام حقد و جہالت کا بھی مبداء یہی ہے، رفعِ غضب کے لیے صحیح پوچھو تو تبدیلِ مزاج کی ضرورت ہے، جیسا کہ عارفِ روم نے فرمایا تھا کہ انما للتدابیر تبدیل للمزاج اس تبدیلی کے لیے تنقیہٴ دماغ ضروری ہے، جس کا انحصار تزکیہٴ قلب پر ہے۔ اس کے لیے چند قرآنی اور نفسیاتی حقائق پر تجریدِ ذہنی کے ساتھ غور کرو، تم مال و دولت کو جو تمہارے قبضہ میں ہے، اپنی ملک سمجھتے ہو، کیونکہ تم اس پر متصرف ہو، اپنی مرضی سے خرچ کرتے ہو، اپنی مرضی سے ذخیرہ کرتے ہو، اپنے مالک ہونے میں تمہیں کوئی شبہ نہیں ہوتا، ناگہان تم بیمار ہو جاتے ہو، دولت تمہیں حالتِ صحت میں جان سے زیادہ عزیز تھی، لیکن جب درد کی شدت تمہیں بقرار کرتی ہے، تو مال تمہیں مارا نظر آنے لگتا ہے، تم اضطراب کے ساتھ طبیب کو طلب کرتے ہو، علاج معالجہ پر بے دریغ خرچ کرتے ہو، اسی چیز سے مفارقت گوارا کرتے ہو جو تم کو بہت زیادہ پیاری تھی، اب تمہیں معلوم ہوتا ہے کہ مال سے زیادہ محبوب شے، صحت ہے، یعنی درد و الم سے رہائی، اور سکون و آرام کا حصول، لیکن باوجود تمہاری تمام سعی و کوشش کے تمہیں صحتِ بدنی اور راحتِ قلبی حاصل نہیں ہوتی، تمہارے طبیب کا نسخہ اثر نہیں دکھلاتا، طبیب کے ابلہ ہونے کا تم کو یقین ہو جاتا ہے، اور تمہیں خوف ہوتا ہے کہ یہ کہیں اجل کی پیش قدمی کی علامت نہ ہو، اس سے زیادہ قابلِ طبیب تمہارے علاج میں مصروف ہوتے ہیں، تیر ہدف نسخوں کا استعمال ہوتا ہے، لیکن تمہارا درد بڑھتا

جاتا ہے، اضطراب و اضطراب میں ترقی ہوتی ہے، تمہارا مال تمہاری جاہ و حشمت تمہارے خادم و نوکر اپنے تمام ذرائع کا تم استعمال کر رہے ہو، لیکن ان سے تمہیں کوئی فائدہ کوئی نفع حاصل نہیں ہو رہا ہے، تم اپنی تکلیف اپنے درد میں کسی قسم کی کمی نہیں پاتے، اب تمہیں یاد پڑتا ہے کہ تم نے کہیں پڑھا تھا، یا کسی سے سنا تھا کہ قُلْ لَا أَمْلِكُ لِنَفْسِي ضَرًّا وَلَا نَفْعًا وَلَا مَوْتًا وَلَا حَيَاةً وَلَا فَتُورًا، الفاظ تمہارے ذہن میں ہیں، معنی کا تمہیں کھلا فہم حاصل نہ تھا، وجدان میں ان کا تحقق نہ ہوا تھا، ان کے مصداق سے بے خبر تھے، اب شاید تمہیں پہلی دفعہ روشنی نظر آرہی ہے، جہل کی ظلمت دور ہو رہی ہے، اپنی ہی ذات میں معنی کا تحقق ہو رہا ہے اور خود کو نہ نفع پر قادر پارہے ہو، اور نہ ضرر کے دفع کی قوت ہی کا تمہیں احساس ہو رہا ہے، پھر تم مالک کس شے کے ہو؟ تمہاری مالکیت سے تمہیں کیا فائدہ؟ اپنی محبوب ترین جان سے تکلیف کا بوجھ نہیں اٹھا سکتے، درد کی شدت میں رتی بھر کمی نہیں کر سکتے، مال تمہیں اس لیے محبوب تھا کہ اس سے درد کا ازالہ ہوتا ہے، راحت حاصل ہوتی ہے، پھر یہ کیا ماجرا ہے، اس کا اثر کہاں گیا؟ جب مال کے اثرات تمہارے اختیار میں نہیں تو ایسے بے اثر مال کو لے کر کیا کرو گے؟ یہ تو محض ایک بارگراں ہے، اس سے تو کھر ٹوٹی ہی، یہ پھر اتنا عزیز اتنا محبوب کیوں ہو؟ بیچ پوچھو تو یہ تمہاری ملک بھی نہیں، یہ حق تعالیٰ کی ملک ہے **لِلّٰهِ خَزَائِنُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ** (پ ۲۸ ۱۳۶) اور وہی اس کے حقیقی مالک ہیں۔ **لَهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا** (پ ۶) یہ تمہارا مغالطہ تھا کہ تم اس کو اپنی ملک سمجھ رہے تھے، اور اپنے کو اس کا مالک جان رہے تھے، بیچ پوچھو تو تمہاری کوئی چیز ہی نہیں، تم اپنی ذات کے لحاظ سے فقیر محض ہو، اور حق تعالیٰ ہی غنی و حمید ہیں۔

**يَا أَيُّهَا النَّاسُ أَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ إِلَى اللَّهِ وَاللَّهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيدُ** (پ ۶، ۳) حق تعالیٰ نے اپنی عنایت اور رحمت سے تمہیں دولت دی، عزت دی، مال و دولت تمہارے پاس امانت ہیں، تم امین ہو اس سے زیادہ نہیں، مالک و حاکم حق تعالیٰ ہیں، تمہیں حق امانت کا احساس

ہونا چاہیے، استردادِ امانت کا جب وقت آئے تو تمہیں خوشی کے ساتھ اس کو مالکِ حقیقی کے سپرد کر دینا چاہیے، جانتے ہو استردادِ امانت کے مواقع کونسے ہیں؟ ان کی تفصیل کا یہ وقت نہیں، لیکن اتنا یاد رکھو کہ جب تمہاری دولت پر آفت آتی ہے، وہ تمہارے ہاتھوں سے چھین لی جاتی ہے، اور تم اس کو بچا نہیں سکتے، اور تمہارے قلب کے تار ٹوٹے جاتے ہیں تمہیں احساس ہوتا ہے کہ تم اپنی ملک سے محروم ہو رہے ہو، تو تمہاری نارِ غضب بھرک اٹھتی ہے، یہی وقت اس علمِ صحیح کے تخضر کا ہے، کہ تم محض امین ہو، مالک نہیں، مالکِ حقیقی استردادِ امانت چاہ رہا ہے، متاعِ غیر پر تمہارا اختیار نہیں، تمہارا فریضہ یہ کہ تشکر و امتنان کے جذبات کے ساتھ امانت کو حوالہ کر دو، غیظ و غضب کا کوئی موقع نہیں، بلکہ خوشی کا مقام ہے، دیانت دار امانت کے استرداد کے وقت ضیق محسوس نہیں کرتا، بلکہ اس کے قلب کو سرور و مسرت ہوتی ہے کہ اس نے اتنا عرصہ امانت کی حفاظت کی، شرائطِ مقررہ کے تحت اس پر متصرف رہا، اور بالآخر وقت مقررہ پر مالکِ حقیقی کے ہاتھ امانت سپرد کر رہا ہے۔

ہاں کیا تم جانتے ہو کہ تم پر ان بلیات کا نزول کیوں ہے؟ تمہارا مال تمہاری دولت آفتوں کا نشانہ کیوں بن رہی ہے اور تم غیظ و غضب کی آگ میں کیوں جلی رہے ہو، کیا اس کا بڑا سبب یہی "خیانت فی الامانت" تو نہیں، جہاں تم نے اپنے علم کی تصحیح کی، اپنے گواہین جانا، اور امانت کے تصرف میں خیانت کو ترک کیا، اور شرائطِ معینہ کا خیال رکھا کہ فوراً تمہارے قلب کی حفاظت کر دی جاتی ہے، اب وہ غصہ کی آگ سے محفوظ ہو جاتا ہے، اپنے فقر و امانت کا علم ہو جانے کے بعد وہ اپنی حاکمیت کے دہم سے بھی نکل آتا ہے، حاکمِ حقیقی وہ حق تعالیٰ ہی کو جانتے لگتا ہے، اِن الْحُكْمِ اِلَّا لِلّٰہِ کا اس کو یقین پیدا ہو جاتا ہے، اپنے حکم کی خلاف ورزی پر اس کو آگ نہیں لگتی، اس کا شعلہ غضب نہیں بھرک اٹھتا، حجتِ جاہ کا خاتمہ ہو جاتا ہے، اور نتیجہ کے طور پر جذبہ غضب کا بھی استیصال ہو جاتا ہے، اگر



مجھ پر وجدان میں یہ بات کھل جائے کہ میری ذات فقیرِ محض ہے، مالک نہیں مملوک ہے، حاکم نہیں محکوم ہے، رب نہیں مرہوب ہے، مولیٰ نہیں عبد ہے، ہاں اگر اس حقیقت کا محض عقلی علم نہیں، وجدانی تحقق ہو جائے تو اب میری نظر میں غضب کے سارے معروضات فنا ہو جاتے ہیں، مال و جاہ خدم و حشم کا تعلق میری ذات سے باقی نہیں رہتا، فقیر کو ان سے کیا تعلق ہو سکتا ہے؟ یہ تو اس ذات کے لوازمات ہیں، جو غنی و حمید ہے جو مولیٰ و رب ہے، جو مالک و حاکم ہے۔

حق تعالیٰ ہی الہ ہیں، لا الہ الا اللہ، وہی معبود ہیں اور مستعان اور ہم سب عبد عبد اپنی ماہیت ہی کے لحاظ سے ذلیل ہے اور فقیر، اس کی نسبت ذل و افتقار حق تعالیٰ ہی سے ہے، کسی غیر سے نہیں، وہ غیر اللہ کی نسبت سے غنی ہے، اور حق تعالیٰ کی نسبت سے فقیر، غنی کا فقیر سارے عالم سے مستغنی ہوتا ہے، جب قلب مومن پر اس توحید کا غلبہ ہو جاتا ہے، تو وہ ساری دنیا سے اور دنیا کی تمام محبوب و مرغوب چیزوں کی محبت سے آزاد ہو جاتا ہے،

رفت آنکہ بقبلہ بتاں رو آرم      حرفِ غم شاں بہ لوح دل بنگارم  
 آہنگِ جمالِ جاودانی دارم      حسنے کہ نہ جاوداں ازو بزارم (جامی)  
 اور تم او پر یہ دیکھ چکے ہو، کہ غیظ و غضب کی اصل و نشا، حبِ اشیاء فانیہ ہے، لا الہ الا اللہ سے قلب کا تزکیہ اور روح کا تجلیہ ہوا کہ حبِ اشیاء فنا ہوئی اور اس حب کے فنا ہوتے ہی غضب کی بھی بیخ کنی ہو گئی!

(۲) مجاہدہ :- اس علم صحیح کے حصول کے بعد اب تمہیں مجاہدہ کی طرف توجہ

کرنی چاہیے، مجاہدہ علم کے قلب میں نفوذ سربان کے لیے ضروری ہے، مجاہدہ سے علم کا استقرار ہوتا ہے، تلوین جاتی ہے، تکمیل پیدا ہوتی ہے، مجاہدہ ہدایت کے راستوں کو کھولتا ہے، حصول مقصود کا یہی واحد ذریعہ ہے، تمہارے سامنے جو علم صحیح اوپر پیش کیا گیا ہے، اس پر تدبیر ضروری ہے، تفکر لازمی ہے، فجر کا وقت اس کے لیے سب سے زیادہ موزوں ہے،



اس وقت اعصاب رات کی استراحت کی وجہ سے تازہ دم ہوتے ہیں، قلب کو سکون ہوتا ہے،  
 دماغ افکارِ دنیوی سے نسبتاً خالی ہوتا ہے، ایسے وقت تمہیں زندگی کے کاروبار شروع کرنے  
 سے پہلے اس ازلی وابدی صداقت پر غور کرنا چاہیے، اس کو قلب کی گہرائیوں میں اتارنے  
 کی کوشش کرنی چاہیے، کہ مالکِ حاکم حق تعالیٰ ہیں، حکم ان ہی کا چلتا ہے، ہر چیز ان ہی  
 کی ملک ہے، وہی رب ہیں اور وہی مولیٰ، ہم ان ہی کے فقیر ہیں، انہی کے در کے سائل ہیں،  
 وہی ہمارے معبود ہیں، وہی مطلوب، وہی محبوب، وہی مقصود ان کو رکھ کر میں کسی چیز کا محتاج  
 نہیں، میں غنی عن الٰہی ہوں، ہر شے سے برتر، مجھ ہی سے ارشاد ہوا ہے،

لَكَيْلًا تَأْسُوا عَلٰی مَا فَاَنكُمْ ۗ مَا كُمْ شَيْءٌ مِّنْ شَيْءٍ مَّا كُنْتُمْ تَدْعُوْنَ ۗ اَوَلَمْ يَكُنْ لَكُمْ

وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَا آتَاكُمْ ۗ شَيْءٌ مِّنْ شَيْءٍ مَّا كُنْتُمْ تَدْعُوْنَ ۗ اَوَلَمْ يَكُنْ لَكُمْ

دینا ۱۰۴

کیونکہ

عالمِ لطیفیلِ ماست موجود ماہم زکائیات مقصود!

جوں جوں تمہارا مراقبہ، تمہارا تفکر و تدبر عمیق ہوتا جائیگا، تمہارا نقطہ نظر بدلتا جائیگا، اور یاد رکھو  
 کہ نقطہ نظری کے بدلنے سے خودی میں انقلاب پیدا ہوتا ہے اور خودی کے انقلاب سے کائنات  
 کے چار سو بدل جاتے ہیں

تری خودی میں اگر انقلاب ہو پیرا

عجب نہیں ہے کہ یہ چار سو بدل جائے (اقبال)

اسی انقلاب مزاج سے تمہارے قلب سے اشیاءِ فانیہ کی محبت محو ہوتی ہے، اور غصہ کا مٹی ہی  
 مسما رہو جاتا ہے، جب تک تم نے اپنے کو مالک و حاکم جانا، امانت میں تم نے خیانت کی،  
 میں نہیں غاصب ٹھہرے، غاصب کو جہاں کہاں امن و چین لینے دیتا ہے، تم میں اور  
 کائنات میں توافق نہیں مخالف و تنازع قائم ہو گیا، اب ہر واقعہ تمہارے غصب کو  
 بھڑکائیگا، جب تم نے اپنا نقطہ نظر بدلا، حق تعالیٰ کو مالک و حاکم جانا اور خود کو ان کا

ملوک و محکوم، آدابِ امانت سے واقف ہو گئے، تو اب کائنات میں اور تم میں توافق پیدا ہو جائیگا، اس توافق کے بعد انبعاثِ غضب کا کوئی موقع نہیں پیدا ہو سکتا۔

تسلیم نمی شوی از اں غم گیتی

تسلیم شو ہر آنچہ آید پیشیت!

اس لیے تمہیں دورانِ تفکر میں رضا بالقصنا، کے اعتبارات پر خاص طور پر توجہ کرنی چاہیے دیکھو "تبراً مر" در حقیقت کون ہیں؟ حق تعالیٰ ہیں "يُدَبِّرُ الْأُمُورَ مِنَ السَّمَاءِ إِلَى الْأَرْضِ" جب وہ مدبر ہیں، جب امر و حکم ان ہی کا چل رہا ہے، تو ان کی تدبیر کے ساتھ حسن رضا درکار ہے، نہ کہ غصہ و غضب! دیکھو، حق تعالیٰ کی ذات کامل، ان کے صفات کامل ان کے افعال کامل، اور خود ہی خالق (خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُونَ) تو اب بات تمہارے ذہن میں گم جانی چلے کہ ۶

ہر چہ از دوست میرسد نیکو است

دیکھو حق تعالیٰ مومن پر رحیم ہیں، کَانَ بِالْمُؤْمِنِينَ رَحِيمًا، اب اگر تم میں ایمان ہی، اس کی حفاظت تم نے کر لی ہے، تو اب ہر واقعہ تمہارے لیے نشانِ رحمت ہی پیش آئے گا، گو بصورتِ قہر کیوں نظر آئے، کیونکہ حق تعالیٰ تم پر رحیم ہو کر تمہارا نقصان روا نہیں رکھتے، جب اس صداقت پر تم غور کرو گے، اور تمہارے قلب پر وہ مسلط ہو جائیگی، تو بے اختیار تمہاری زبان سے یہ پُر تر تم الفاظ نکلنے لگیں گے۔

خواہی ز دصال شادماں دار مرا      خواہی ز فراق بہ فغان دار مرا

من باتونگویم کہ چساں دار مرا      زانساں کہ دلت خجاست چاں دار مرا (خیام)

یہ مجاہدہ کا انجام ہوگا، لیکن اس غایت کا حصول یک دم نہیں ہوتا، تمہیں اپنے کام میں لگے رہنا چاہیے، اور بہت و استقلال سے قدم بڑھائے جانا چاہیے، .....

..... کامیابی بالآخر مجاہدہ کے ہاتھ چومتی ہے، اور کَانَ حَقًّا عَلَيْنَا

نَصْرَ الْمُؤْمِنِينَ كَاوَعْدِهِ اس کے لیے پورا ہو کر رہتا ہے۔

اندریں رہی تراش و می خراش	تادمِ آخردے فارغِ مباحش
دوست دارد دوست این آشفنگی	کوششِ بیپودہ بہ از خفتگی
کار کے کن تو و کابلِ مباحش	اندک اندک خاک چہ رومی تراش
چوں ز چاہے میکنی ہر روز خاک	عاقبت اندر رسی در آب پاک
چوں نشینی بر سر کوئے کسے	عاقبت بینی تو ہم روئے کسے

## دعاء اور دفع بلا

اگر آپ کا کوئی عزیز، آپ کا محبوب آپ سے ہزاروں کو س دور غم و الم میں مبتلا، بلاؤ مصیبت میں گرفتار ہو اور آپ سے دعا کا طالب ہو تو آپ جانتے ہیں کہ دعا کے ذریعہ اس کی تائید کا بہترین طریقہ کیا ہے؟ آپ کو سن کر تعجب ہو گا کہ جو طریقہ خود ہیں اپنی بلا مصیبت، خوف و حزن کو دفع کرنے میں کام آتا ہے بالکل وہی اس محبوب کے لیے بھی استعمال کیا جاسکتا ہے! اس کی تفصیلات اجمالی طور پر یہاں پیش کی جاتی ہیں، ممکن ہے کہ یہ آپ کی سمجھ میں آجائیں اور آپ کو اپنی ان باطنی ربانی قوتوں کا علم ہو جائے جن سے آپ اب تک بے خبر تھے، ان کے استعمال سے آپ خود کیفیت و سرور حاصل کریں اور دوسروں کی بھی راحت و آسائش کا باعث بن جائیں۔

زیر شہدیک انگشت برہم بلبت از لذت اگر محو نہ گردی تفت کن

ایک نامعلوم خطہ زمین میں ایک مکتشف مصروف تحقیق ہے اور یکایک راستہ بھٹک جاتا ہے، اب وہ پختہ کار خوب جانتا ہے کہ اس حالت میں اس کے لیے سب سے زیادہ ضروری چیز یہ ہے کہ وہ جو اس باختہ نہ ہو جائے، اس کے اوسان جاتے نہ رہیں، سٹی گم نہ ہو جائے! اس کو خوب معلوم ہے کہ اگر خوف کے ماتے اب اس کی عقل جاتی رہے تو پھر اس کو کبھی راستہ نہیں ملتا اور وہ ہمیشہ کے لیے ہلاک ہو جاتا ہے، اور وہ یہ بھی جانتا ہے کہ اگر اس نے اس وقت اپنے قلب کو سنبھال لیا، اس کو خوف و مہراس سے آزاد رکھا، پرسکون دل جمع اور مطمئن رہا تو ممکن ہے کہ اس کو راستہ مل جائے اور وہ ہلاکت سے بچ جائے۔

بالکل یہی حال تمام مصائب اور مشکلات کا ہے، سب سے پہلے ہمیں اپنے قلب کو خوف و

پریشانی سے بچانا چاہیے، جب ہم پر بلاؤں کا نزول ہوتا ہے، درد اور غم کے بادل اُمنڈاتے ہیں تو سب سے زیادہ ضروری کام یہ ہے کہ ہم حق تعالیٰ کی معیت کا احساس کر کے اپنے دل کو خوف سے محفوظ کر لیں، خوف دور ہوا اور ہم نے ذاتی نفع و ضرر کے خیال سے بلند ہو کر اپنے آپ کو مخاطب کر کے کہا کہ ”حق تعالیٰ کے ہوتے ہوئے مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں“ اور تاباں کے الفاظ میں دنیا کے اچھے اور بُرے کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کر دیا کہ :-

دنیا کے نیک بُد سے کچھ تاباں نہیں ہر مجھ کو غم

گریوں ہوا تو کیا ہوا اور دوں ہوا تو کیا ہوا

تو اب حالات میں تغیر ہو جاتا ہے، اور حیرتناک طریقہ سے ہمیں تمام بلاؤں سے نجات مل جاتی ہے اور ”مَنْ يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَلْ لَهُ مَخْرَجًا“ کا وعدہ پورا ہو جاتا ہے، اسی طرح ہم اپنے محبوب کی خواہ وہ ہم سے قریب ہو یا دور ہو، اس کے بارے میں پریشان اور خوف زدہ ہو کر ہرگز نہیں کر سکتے، خوف و پریشانی سے بچائے اس کی مصیبت کم ہونے کے اور زیادہ ہو جاتی ہے، کیونکہ ہم اپنی مسموم ذہنی فضا سے اس کو بھی متاثر کرتے اور اس کے خوف و پریشانی میں اور اضافہ کر دیتے ہیں، اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہمیں اس کی طرف سے بے پرواہ ہو جانا چاہیے اور اس کا خدا مالک ہے کہہ کر بے فکر بنیں، وہ درد و تکلیف میں مبتلا ہے اور ہمیں اس کی مدد کرنی ضروری ہے، وہ ہم سے کوسوں دور ہے اور جسمانی خدمت کا ہمیں کوئی موقع حاصل نہیں، اس کی خدمت کا روحانی طریقہ ہی اختیار کیا جاسکتا ہے اور وہ دعا اور تقویٰ ہی ہے، ہم اس کے لیے اس طرح دعا کر سکتے ہیں کہ گویا وہ خود اپنے لیے دعا کر رہا ہے اور معیت و نصرت حق کا اس طرح ادراک کر سکتے ہیں کہ گویا وہ خود اس کا ادراک کر رہا ہے۔

اس طریقہ کے استعمال میں سب سے زیادہ اسی شخص کو کامیابی حاصل ہوتی ہے جو متقی اور پرہیزگار ہے، توحید کے میدان کا مرد ہے، امتثالِ امورِ الہیہ میں اپنی زندگی بسر کر رہا ہے، خواہی سے محتنب ہے اور فسق و فجور سے تائب، اس کی دعائیں بلا کا اثر ہوتا ہے اور حق تعالیٰ



نے اسی کے متعلق تو فرمایا ہے کہ میں "اس کا ہاتھ، آنکھ، کان، پاؤں ہو جاتا ہوں کنت سمعہ  
الذی یسمع بہ وبصرہ الذی یبصر بہ ویدہ الّتی یبطش بہا ورجلہ الّتی یمشی بہا  
(الحديث رواہ البخاری)

بہر حال پہلی چیز یہ ہے کہ ہم خود اپنے خوفزدہ اور پریشان قلب کو سکون و جمعیت عطا  
کریں اور اس کے انتشار و پریشانی کو رفع کریں، جب ہمیں اپنے محبوب کے متعلق بُری خبر  
پہنچے تو ہمیں چاہیے کہ فوراً بھولنے والی اللہ حق تعالیٰ کی طرف گریز کریں کیونکہ تمام چیزوں  
کا اختیار ان ہی کے ہاتھ میں ہے اور وہی پناہ دیتے ہیں اور ان کے مقابلہ میں کوئی کسی  
کو پناہ نہیں دے سکتا۔ قُلْ مَنْ بِيَدِ مَلَكُوتِ كُلِّ شَيْءٍ وَهُوَ يُجِيرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ إِنْ كُنْتُمْ  
تَعْلَمُونَ (پ ۵۶) تمام اہل اللہ کو اس امر کا تجربہ ہے کہ جب کوئی شخص اپنی مصیبت کو ابتداً  
حق تعالیٰ کے سامنے پیش کرتا ہے اور خلق کو اس کی اطلاع نہیں دیتا تو بہت جلد نصرت  
الہی اس کو دور کر دیتی ہے اور اس کے قلب کو سکون اور طمانیت عطا کرتی ہے۔

یہ شاید ابتدا میں ہمارے لیے آسان نہیں جب ہم پر کوئی مصیبت وارد ہوتی ہے تو ہمارے  
قلب کے تار ٹوٹنے لگتے ہیں، ہماری نبضیں چھوٹنے لگتی ہیں، ہمارے خیالات میں بلا کا انتشار اور  
نشبت پیدا ہو جاتا ہے، خوف سے ہماری زبان سوکھنے لگتی ہے، ہماری آنکھوں میں اندھیرا  
چھاتا ہے!

یاد رکھو یہی وقت ہے رجوع الی اللہ کا، یہی وقت ہے قلب کو ظلمت سے نکال کر نور  
کی طرف رجوع کرنے کا، سلبی و تخریبی خیالات سے اس کو چھڑا کر ایجابی تصور کی طرف مائل  
کرنے کا، اور حق تعالیٰ سے زیادہ کس کا خیال نورانی اور ایجابی ہو سکتا ہے۔ اسی لیے حضور  
انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے وقت ان پاکیزہ الفاظ کو دہرانے کی تاکید فرمائی ہے :-

لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيمُ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ، لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ رَبُّ السَّمَوَاتِ

وَرَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيمِ

تم چاہو تو ان الفاظ کی تکرار کر سکتے ہو جو تمہارے کرب کو رفع کرنے میں اکسیر کا حکم رکھتے ہیں: اللہ اللہ ربی لا اشرك به شیئاً۔ یا پھر یہ الفاظ دہرائے جاسکتے ہیں: یا حی یا قیوم برحمتک استغیث۔

یہاں یہ نفسیاتی اصول یاد رکھنا چاہیے کہ خوف و غم کا مقابلہ ان کی سطح پر رہ کر نہیں کیا جاسکتا، اس سطح میں ان کی قوت ناقابلِ مدافعت ہوتی ہے، ہمیں ان سے نجات پانے کے لیے اس سطح سے بلند ہو جانے کی ضرورت ہے۔ جب ہم حق تعالیٰ کی ذات کی طرف توجہ کرتے ہیں، ان کے اسماء و صفات کا ذکر کرتے ہیں تو ہمارا قلب خوف کی سطح سے بلند ہو کر اس مقام پر پہنچ جاتا ہے جہاں شر کا گزر نہیں، جہاں سوائے ذات کے سرور و سکون کے کوئی اور چیز نہیں اور ہمیں ذات کے اس سرور میں کافی حصہ مل جاتا ہے۔

قطرۃ نوری سرایا نور باش      بگزر از غم دائماً مسرور باش (رومی)

ادعیہ ماثورہ کی تکرار کے ساتھ تمہیں حق تعالیٰ کی معیت و احاطت کا ادراک بھی واضح طور پر کرنا چاہیے۔ حق تعالیٰ نے تمہیں اپنی معیت کا یقین دلایا ہے۔ ھُو مَعَكُمْ اِنَّمَا كُنْتُمْ جہاں کہیں تم ہو حق تعالیٰ تمہارے ساتھ ہیں، وہ تم پر محیط ہیں، ہر شے پر محیط ہیں، کوئی شے ان کے احاطے سے خارج نہیں، وکان اللہ بكل شیء محیطاً (پ ۵۷) الا انہ بكل شیء محیط (پ ۱۶) حق تعالیٰ ہر جا حاضر و موجود ہیں، تم اپنا منہ جدھر پھیرو وہیں ذات حق موجود ہے۔ قاینما تو لوافتم وجہ اللہ۔

آنکھیں جو ہوں تو عین ہر مقصود ہر جگہ      بالذات ہر جہاں میں وہ موجود ہر جگہ

(نوٹ صفحہ ۳۰۱) ۱۔ رواہ بخاری و مسلم و ابو عوانہ و نسائی و الترمذی و ابن ماجہ و غیر ہم ابن عوانہ نے اسکا اور زیادہ کیا کہ پھر اس کے بعد دعا کرے۔

(عاشیہ صفحہ ۲۱) ۲۔ رواہ ابو داؤد و النسائی و ابن جہاں بخرانی نے تین بار ان کا کتنا زیادہ کیلئے و آخر جہاں ابن ماجہ ایضاً حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ اپنے اہل بیت کو جمع کر کے فرمایا کہ تم میں جب کسی کو غم یا کرب پہنچے تو کہے۔ اللہ اللہ الخ ۳۔ ابن مسعود فرماتے ہیں کہ حضرت صلعم کو جب کوئی غم ہوتا تو یہ الفاظ دہراتے۔

حق تعالیٰ خود ہم سے بہت قریب ہیں، اقرب ہیں، ہرگز بےید نہیں، دور نہیں! وہ اس کاہیں پورا یقین دلا رہے ہیں **مَنْ خَشِيَ اقْرَبَ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ** یعنی ہم رگِ جان سے زیادہ قریب ہیں، اپنے سے دور کیوں سمجھ رکھا ہے! اپنے جہل کو دور کرا اور ہم سے قریب ہو جا! خوابِ جہل از حرمِ قرب مراد دور فلکند درۃ نزدیک تر از دوست کے ہیچ ندید

حق تعالیٰ کے ان ارشادات پر یقین و ایمان رکھ کر خوف و غم، کرب و رنج کے وقت ہمیں اپنے نفس کو یقین دلانا چاہیے کہ۔

حق تعالیٰ اس جگہ حاضر و موجود ہیں الا انہ بكل شیء عیبط  
 حق تعالیٰ قطعاً میرے ساتھ ہیں ہو معکم ایما کنتم  
 حق تعالیٰ قطعاً میرے قریب ہیں۔ ان ربی قریب عجیب  
 حق تعالیٰ قطعاً ہر جہت میں موجود ہیں فایما تولوا فثم وجہ اللہ  
 ثواب

حضورِ حق رحمت ہے، حضورِ حق مسرت ہے، حضورِ حق امن و طمانیت ہے۔ اس مراقبہ و تدبیر سے حق کا ادراکِ نفس و آفاق میں قائم ہونے لگتا ہے اور ادراکِ حق کے قیام کے ساتھ خوف و حزن، غم و کرب و الم سب غائب ہو جاتے ہیں کیونکہ قلب ان کی سطح سے بہت بلند ہو جاتا ہے اور سکون و مسرت و امن و طمانیت کی لہریں اندر سے اٹھنے لگتی ہیں حق کو اپنے ساتھ پا کر وہ ان میں مشغول ہو جاتا ہے اور ان سے راضی اور جب وہ حق سے راضی ہو جاتا ہے تو حق تعالیٰ بھی اس سے راضی ہو جاتے ہیں۔ رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ۔

اس طرح جب ہم نے اپنے خوف و حزن کو دور کر لیا اور حق تعالیٰ کی یافت و شہود کی بدولت قطرہ نور بن گئے، ذاتِ الہی کے سرور سے لطف اندوز ہونے لگے تو ہم اب اپنے دور افتادہ مجبور محبوب کی دعا کے ذریعہ مدد کر سکتے ہیں، ذرا احتیاط کے ساتھ اس طریقہ پر غور کرو۔

ہمیں اس کی جانب سے یافت قائم کرنا ہے، اگر اس کی جان خطرہ میں ہے، اگر وہ بلاؤں میں گرفتار ہے تو جب ہم اس کا خیال کریں گے تو ہمارے قلب میں وہی تاریکی پیدا ہوگی جس میں وہ گھرا ہوا ہے۔ جب ہم نے اپنی تاریکی یافت حق کی وجہ سے دور کر لی تو اب ہمیں اس کی تاریکی اپنے اندر پیدا کرنی چاہیے اور جس طرح اپنی تاریکی رفع کی تھی بالکل اسی طرح اس کے خیال سے پیدا ہونے والی تاریکی کو بھی دور کرنے کی کوشش کرنی چاہیے، یہ توصیہ ظاہر ہے کہ دوست کے غم سے ہمیں غم ہوتا ہے اس کی بے چینی ہمیں بے چین کرتی ہے۔ جب اس کے خطرے یا ضرر کا خیال قلب میں پیدا ہوا کہ قلب کی کیفیت بدلنے لگی اور اسی کیفیت کو حزن و خوف و کرب سے تعبیر کیا جاتا ہے، قلب کی کیفیت کو جب تم نے حق تعالیٰ کے اسماء و صفات کے تذکرے سے حق تعالیٰ کی ذات کی یافت سے ان کے حضور و معیت و احاطت و قرب و قربیت کے ادراک فی النفس والافاق سے دور کر لیا کہ تمہارے محبوب کا خوف و حزن خود اس کے قلب سے ہٹ گیا اور چین و سکون کی کیفیت کا ظہور ہونے لگا۔

اپنے دور افتادہ محبوب کی مدد کرنے کا روحانی طریقہ بس یہی ہے کہ پہلے اس کے غم و مصیبت کے بوجھ کو اپنے گاندھوں پر اٹھانا چاہیے اور اس کا درد اپنے قلب میں پیدا کرنا چاہیے اور پھر حق تعالیٰ کے ذکر اور ان کی یافت کے ذریعہ امن و طمانیت اپنے اندر پیدا کرنی چاہیے اور اس طرح یہ بوجھ خود بخود اٹھ جاتا ہے اور اس کو بلا و مصیبت سے نجات مل جاتی ہے۔ وَمَا ذَلِكْ عَلَى اللَّهِ بَعِزًّا!

اس کے ساتھ ساتھ ہمیں اپنے محبوب کو حق تعالیٰ کو تفویض کر دینا چاہیے۔ ہمیں اس کی صورت کو ذہن میں مستحضر کر کے حق تعالیٰ سے یوں معروضہ کرنا چاہیے، حق تعالیٰ میں نے ان کو آپ کے سپرد کیا، تفویض کیا انہیں نور اور نورانی کر دیجیے عافیت و امن عطا فرمائیے ان کی ضروریات کی تکمیل کیجیے، دَبْنَا عَلَيْكَ تَوَكَّلْنَا، حَسْبُنَا اللَّهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ، نَعْمَ الْمَوْلَى

ونعم النصیر۔

ہیں اس امر کا بھی شدت کے ساتھ استحضار کرنا چاہیے کہ حق تعالیٰ ہماری اور ان کی زندگی کے ہر واقعہ کا بذات خود تعین فرما رہے ہیں اور بشانِ رحمت تعین فرما رہے ہیں۔ اس استحضار ہی سے امر واقعہ کا تحقق ہوتا ہے ہمارے لیے اور ان کے لیے بھی انا عند ظن عبدی بی سے اس کی تائید ہوتی ہے، حالات میں آسانی اور سہولت پیدا ہونے لگتی ہے حق تعالیٰ کے ساتھ حسن ظن تقویٰ ہے اور متقی کی مراد حق تعالیٰ قطعاً پوری کرتے ہیں ۶  
می دہد یزداں مراد متعینین! (ردھی)

ومن یتق الله يجعل له من امره يسرا سے اس دعویٰ کی تائید ہوتی ہے اور من یتق الله يجعل له مخرجا اس پر مزید روشنی ڈالتا ہے۔

امداد کے اس روحانی طریقے کے متعلق یہ بات واضح طور پر یاد رکھنی چاہیے کہ کشف ضرر حق تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں کر سکتا، مخلوق میں نہ اس کی قوت ہے اور نہ طاقت لاقوة الا باللہ حق تعالیٰ ہی فاعل ہیں اور مخلوق محض آلات، موثر حقیقی صرف حق تعالیٰ ہی ہیں، باقی اولیام و خیالات! وان یمسک الله بضر فلا کشف له الا هو وان یردک بخیر فلا راد لفضلہ یردک بہ من یشاء من عباده وهو الغفور الرحیم (پ ۱۶۶)  
یعنی اگر تم کو حق تعالیٰ کوئی تکلیف پہنچائیں تو بجز ان کے اور کوئی اس کا دور کرنے والا نہیں ہے اور اگر وہ تم کو کوئی راحت پہنچانا چاہیں تو ان کے فضل کا کوئی ہٹانے والا نہیں وہ اپنا فضل اپنے بندوں میں سے جس پر چاہیں مبذول فرمائیں اور وہ بڑی مغفرت اور بڑی رحمت والے ہیں جاتی نے اسی عقیدہ کے تحت فرمایا ہے:-

حق فاعل و ہرچہ جز حق آلات بود      تاثیر ز آلت از محالات بود

ہستی کہ موثر حقیقی است یکسیت      باقی ہمہ اولیام و خیالات بود

جب ہم اپنے قلب میں اپنے محبوب کا درد لے کر مواجہ حق میں آجاتے ہیں تو حق ہی کے



نور سے ہمارا اور ہمارے محبوب کا درد رفع ہو جائے، فاعل و موثر قطعاً حق تعالیٰ ہی ہوتے ہیں اور ہم محض وہ آلات جن کے ذریعہ ان کا فیضِ کرم جاری ہوتا ہے۔

اے ستر تو در سینہ ہر صاحبِ راز      پیوستہ در رحمت تو بر ہمہ باز  
ہر کس کہ بدرگاہ تو آید بنیاز      محروم ز درگاہ تو کے گردد باز

## اکسراج

حج زیارت کردن خانہ بود حج رب البیت مردانہ بود (رومی)

صوفیائے کرام نے ہمیشہ مذہب کے ظاہری رسوم سے زیادہ زور اس کی باطنی روح پر دیا  
ہے، دین محمدی کی یہی دو حیثیتیں ہیں: ظاہری و باطنی!

”نیکی و طاعت کے ظاہری افعال سے قلب پر جو اچھے اثرات مترتب ہوتے ہیں ان  
کے احوال و کوائف کی تحصیل دین کی باطنی حیثیت یا تصوف کا مقصود اور نصب  
العین ہے۔“

قرآنی تعلیمات سے بھی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اصل چیز ظاہری رسوم نہیں بلکہ باطنی روح ہے۔ دیکھو  
قربانی کے سلسلہ میں حق تعالیٰ نے وضاحت فرمادی ہے کہ:

”و قربانی کا گوشت حق تعالیٰ کے پاس پہنچتا ہے اور نہ خون، بلکہ تقویٰ یا پارسائی ہے“

یعنی حق تعالیٰ کی رضا و خوشنودی محض قربانی کر دینے یا خون بہا دینے سے نہیں حاصل ہوتی جب  
تک کہ اس قربانی کا مدار حق تعالیٰ کی محبت، ان کی رضا جوئی، اور ان کی قرب طلبی نہ ہو۔ اسی  
طرح دوسری جگہ واضح فرمایا گیا ہے کہ:-

لیس البران تو لو او جو حکم قبل نیکی اس کا نام نہیں کہ تم اپنا منہ مشرق کو کر لویا

المشرق والمغرب ولكن البر من مغرب کو، بلکہ نیکی اسدا اور یوم آخرت پر ایمان

امن بالله والیوم الآخر الخ (پہنچ) یقین سے حاصل ہوتی ہے۔

یعنی محض کسی سمت کو قبلہ بنا کر اس کی طرف منہ پھیر لینے سے انسان کے اندر نیکی نہیں پیدا ہو سکتی

لہ شاه ولی الله ہمعات“ لہ لن ینال الله لحمها ولاد فائها ولكن ینال التقوی منکم۔

جب تک کہ اس کی بنیاد اللہ اور آخرت کے یقین و ایمان پر نہ ہو! لیکن ساتھ ہی ہمیں یہ بھول نہ جانا چاہیے کہ قرآنی تعلیمات اور اسلامی تصوف کی رو سے دنیا میں جس طرح انسانی روح بغیر انسانی جسم کے نہیں پائی جاتی اور اس کے روحانی افعال کا اعتبار بغیر جسمانی افعال کے نہیں ہوتا، اسی طرح دنیا میں خاص خاص افعال یا جسمانی حرکات اور احوال کے بغیر روح کا ارتقا اور اس کی تکمیل نہیں ہو سکتی، اسی لیے صوفیائے کرام نے باطن کے ساتھ ظاہر کی حفاظت پر پورا زور دیا ہے اور متقدمین صوفیاء نے تصوف کی تعریف ہی یہ کی ہے کہ ”وہ نام ہے تعمیر ظاہر و باطن کا“ بالفاظ دیگر دونوں کی اصلاح و درستی ضروری ہے، نہ ظاہر بغیر باطن کے اور نہ باطن بغیر ظاہر کے درست ہو سکتا ہے۔ ظاہر عنوان ہے باطن کا، جب کسی ظاہری افعال شرع محمدی کے خلاف ہوں تو اس کو کوئی تسلیم نہیں کر سکتا کہ اس کا باطن موافق و مطیع ہوگا، ظاہر تو تابع ہوتا ہے باطن کا، کیسے ہو سکتا ہے کہ باطن درست ہو اور اس کا اثر ظاہر پر نہ پڑے، یہ ناممکن ہے۔ اسی طرح ظاہری افعال کا اثر باطن پر پڑتا ہے بلکہ ہر ظاہری عمل باطن کو متاثر کرتا ہے۔ ولیم جیمس جیسے ماہر نفسیات نے تو اس حد تک زور دیا ہے کہ ”اگر تم باطن میں کوئی کیفیت یا جذبہ پیدا کرنا چاہتے ہو تو اس کی ظاہری صورت پیدا کر لو تمہارا باطن متاثر ہوئے بغیر رہ نہیں سکتا۔“ جیمس لینگ نظریہ کی تفصیلات آج کل جامعات کے طالب علم بخوبی واقف ہیں۔

حج کے تمام اعمال پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ مومن جس کا طرہ امتیاز حق تعالیٰ کی شدید محبت ہے (الذین امنوا اللہ حباً) اپنے عشق و محبت کے جذبہ کو جو اس کے قلب کی گہرائیوں میں نہاں ہے ظاہری اعمال و اشکال میں ہویدا کرتا ہے تاکہ ”اس کے اس حال کا چرچا دنیا میں پھیلے، وہ بلند آواز سے لبیک کہتے ہوئے نعرے لگاتا ہے اور ان نعروں سے محبت کی چھپی دبی آگ کو بھڑکاتا ہے!“ چنانچہ شاہ عبدالعزیز اپنی تفسیر میں ابراہیم خلیل علیہ السلام کے حج کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

”بازایشان را حکم شد کہ در ہر سال یک بار خود را والہ و شہید ساختہ دیوانہ وار و عاشق کردار برائے گرد  
گشتن خانہ محبوب خود برہنہ سر و برہنہ تن و برہنہ پا، از ولیدہ مو، پریشان حال و گرد آلودہ از شام  
بر زمین حجاز رسیدہ گلے بر کوہ و گاہے بر زمین رو بہ سوسے خانہ کردہ استادہ شوئند... گرد خانہ تجلی  
آشیانہ او طواف کنند و بار بار کجملے آن را بہ بوسند و بلیسند“

پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکم دیا گیا کہ سال میں ایک دفعہ اپنے کو سرگشتہ و شیدا  
بنا کر دیوانوں کی طرح اور عشق بازوں کا وطیرہ اختیار کر کے محبوب کے گھر کے گرد  
سنگے سرنگے پاؤں، الجھے ہوئے بال، پریشان حالی کے ساتھ گرد میں اٹے ہوئے سر زمین  
حجاز میں پہنچیں، اور وہاں پہنچ کر کبھی پہاڑ پر، کبھی زمین پر محبوب کے اسی گھر کی طرف  
رُخ کر کے کھڑے ہوں..... اسی تجلی خانہ کے ارد گرد گھومیں اور اس کے گوشوں  
کو چومیں، چاہیں)

حج کے مناسک سے عشق و محبت کا یہی جذبہ ظاہر ہوتا ہے اور اسی بنیاد پر طوافِ کعبہ، صفا  
و مروہ کے درمیان سعی، مزدلفہ کی آمد و رفت، عرفات میں قیام منیٰ میں ذبح و قربانی، وتلبیہ و  
احرام وغیرہ کا حکم دیا گیا ہے۔

اعمالِ حج کے ان ہی باطنی اسرار کو ہم یہاں امام الصوفیہ حجۃ الاسلام حضرت غزالیؒ کے  
اشارات کی روشنی میں پیش کر رہے ہیں:۔  
زیں شہد یک انگشت سا نم بلبت از لذت اگر محو گردی تفت کن!

حق تعالیٰ کے گھر کی زیارت کا شوق عاشق کے قلب میں بھرک اٹھتا ہے: جس قلب  
میں اس ”شاہِ خواہاں“ کا عشق نہیں وہ مردہ ہے، یا یوں کہیے:۔  
دل کہ فارغ شد ز عشق آن نگار  
سنگ استنبکے شیطان نش شمار!

عاشق کی نگاہ میں اب دنیا کی ساری لذتیں ہیچ نظر آنے لگتی ہیں۔ مال و دولت، جاہ و عزت دوست و احباب اپنی دلفریبیاں کھودیتے ہیں! "زندے" کا عشق اس کو مردوں کی محبت سے بیزار کر دیتا ہے اور وہ چیخ اٹھتا ہے۔

عشق با مردہ نباشد پائیدار      عشق را با حئی جاں افزائے دار!

عشق زندہ در روان و در بصر      ہر دمے باشد ز غنچہ تازہ ترا

عشق آن زندہ گزیر کو باقیست      وز شراب جاں فرایت ساقیست

عشق آن بگزیر کہ جملہ انبیاء      یافتند از عشق او کار و کیا!

غرق عشق شو کہ غرق است اندرین      عشقائے اولین و آخرین! (ردی)

اہل و عیال، دوست و احباب سے رخصت ہو کر جب وہ سوار ہوتا ہے تو اس کی نظر میں دارِ آخرت کی سواری آجاتی ہے، وہ اپنے جنازے کو آنکھوں سے دیکھ لیتا ہے جس پر سوار ہو کر اس کو ایک روز آخرت کی طرف کوچ کرنا ہوگا اور وہ جانتا ہے کہ یہ دن کچھ زیادہ دور تو نہیں ہو سکتا۔ ۶۔ کیں عمر بیک چشم زدن نقش بر آب است!

جب احرام کے لیے چادر خریدتا ہے تو اس کو وہ دن یاد آتا ہے جب اس کا تہ بے جان کفن میں لپیٹا جائیگا اور وہ بے حس و حرکت پڑا ہوگا! اب اس کا ساتھ دینے والے نہ دوست احباب ہونگے اور نہ اہل و عیال صرف ایمان و عمل صالح ہی اس کے ساتھ جائینگے! وہ اپنے نفس سے مخاطب ہو کر کہتا ہے: ۷۔

یا من بدنیاداشتغل      قد غرک طول الامل

الموت یا قی بغتة      والتبر صندق العمل (حضرت علی)

سوچتا ہے کہ احرام کی چادر تو خانہ کعبہ کے قریب پہنچ کر باندھنی پڑیگی، ممکن ہے کہ یہ سفر پورا نہ ہو سکے اور راہ ہی میں موت آجائے لیکن حق تعالیٰ سے ملاقات تو کفن میں پیٹے ہوئے ہی ہوگی! کفن کی اس چادر پر نظر کر کے شکستہ دلی کے ساتھ حق تعالیٰ سے عرض کرتا ہے:-



اللہم اغسل خطایای بماء الثلج و لے اشد میرے گناہوں کو پرف اور اوسے کے پانی  
 البرد و نق قلبی من الخطایا کما ینقی سے دھوئے اور میرے دل کو گناہوں سے ایسا  
 الثوب الابيض من الدنس و باعد پاک کرے جیسا کہ سفید کپڑا میل سے پاک کیا جاتا  
 بینی و بین خطایای کما باعدت بین ہر اور مجھ میں اور میرے گناہوں کے درمیان ایسا  
 المشرق و المغرب (بخاری، عن عائشہ) فاصلہ کرے جیسا کہ مشرق و مغرب میں تونے  
 جب اپنے شہر سے باہر نکل آتا ہے تو سوچتا ہے کہ اس نے اپنے اہل و عیال اور وطن سے جدا  
 ہو کر ایسا سفر اختیار کیا ہے جو کسی طرح دنیا کے اور سفروں کے بالکل مشابہ نہیں! اس سفر سے  
 اس کا مقصود حق تعالیٰ ہیں، ان کے گھر کی زیارت ہے، ان کی رضا و خوشنودی ہے، حق تعالیٰ  
 ہی کی پکار ہے، ان ہی کی توفیق سے، ان ہی کے شوق دلانے سے، ان ہی کے حکم پر وہ قطع کرتا  
 و ترک خلافت کر کے ان کے دربار کی طرف دیوانہ وار چل پڑتا ہے، اس کی زبان پر ہے:-  
 بِسْمِ اللّٰهِ، مَا شَاءَ اللّٰهُ، حَسْبِيَ اللّٰهُ، لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ، اللّٰهُمَّ اَلْبَيْتُ خَرَجْتَ مِنْتِ  
 اَخْرَجْتَنِي!

من کہ ہاشم کہ براں خاطر خاطر گذرم لطفنامی کنی لے خاکِ درت تاج سرم (عائشہ)  
 اس کو حق تعالیٰ سے پوری امید ہوتی ہے کہ وہ اس سفر شوق میں اس کے ساتھ ہونگے اس  
 کے نگہبان اور مددگار ہونگے، وہ حق تعالیٰ ہی کی دستگیری و رہبری سے اپنی منتہائے آرزو کو  
 پائیگا، اپنے مولیٰ کے دیدار سے اپنی مراد کو پائیگا! ہ  
 من ایں دستے کہ افشاندم ز کونین بدامان تمنا کے تو باشد! (حزین)  
 سوچتا ہے کہ اگر وہ منزل مقصود کو پہنچنے بھی نہ پایا اور راستہ ہی میں طعمہ اجل مسمی ہو گیا، پھر  
 بھی وہ تبارہ بار ہوگا! کیا حق تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا ہے:

وَمَنْ يَخْرُجْ مِنْ بَيْتِهِ مَهَاجِرًا لِي  
 اللّٰهُ وَرَسُولِهِ ثُمَّ يَدْرِكْهُ الْمَوْتُ  
 اللہ اور رسول کی طرف ہجرت کرے گا، پھر اس کو موت

فقد وقع اجره على الله" آپکے تب بھی اس کا ثواب ثابت ہو گیا اللہ تعالیٰ کے ذمہ!

ہاں، اس راہ میں موت بھی اچھی! کہہ سکیگا! ۷

حاصل عمر نشارہ یارے کردم! شادم از زندگی خویش کہ کائے کردم

اسی فکر و ذکر، اسی ولولہ و جنون میں وہ میقات پر پہنچ جاتا ہے، کپڑے اتارتا ہے اور احرام

کی چادریں باندھتا اور اڑھتا ہے، اسوا سے آزاد ہو کر چیخ اٹھتا ہے:

لبيك اللهم لتبيك لا شريك لك لتبيك!

آنکھوں سے اس کے آنسو جاری ہو جاتے ہیں، دل سے سرد آہیں نکلتی ہیں، اور زبان سے یہ چیخ :-

ما از خاک کویت پیرا من است برتن! انم ز آب دیدہ صد چاک تابدا من (جالی،

جانتا ہے کہ لبیک کی یہ پکار حق تعالیٰ کی اس پکار کے جواب میں ہے کہ :-

- وَاذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَدْعُوْاكُمْ حَتَّىٰ تَصْلُوْا مِنْ حَجِّهِمْ لَعَلَّكُمْ تُفْحَمُوْنَ

اور اس کا خیال عرصہ قیامت کی تصویر آنکھوں کے سامنے کھینچ دیتا ہے کہ جب صور پھونکا جائیگا

اور لوگ اسی طرح پکارے جائیں گے اور وہ اپنی قبروں سے نکل کر میدان قیامت میں جمع ہونگے اور

حق تعالیٰ کی پکار کا جواب دینگے پھر ان میں سے بعض مقبول ہونگے اور بعض مردود! ابتداء میں

تردد ہر ایک کو ہوگا، خوف ورجا ہر ایک کے سینہ میں ہوگی! دل ہی دل میں حق تعالیٰ سے کہتا ہو کہ

کارے بجز گناہ نداریم یا حفیظ! عذرے بغیر آہ نداریم یا حفیظ!

ہر چند روسیاء و گنہگار و مجرمیم

توبہ و استغفار، تسبیح و تہلیل، اندامت و شوق، رجا و خوف میں اس کی ہر ساعت بسر ہوتی ہے،

دل میں حسرتوں کا ہجوم ہوتا ہے اور وہ راہ کی صعوبتیں برداشت کیے بڑھتا جاتا ہے! کبھی کہتا ہے :-

اللہ! کس قدر رہ مقصود دور ہے

پیک خیال راہ میں تھک تھک کے رہ گیا

جذہ کا قیام، ساتھیوں کی پریشانی اس کو متاثر نہیں کرتی، وہ تو "محو خیال" یا "بے" ہے :-

وہ تری گلی کی قیامتیں کہ لحد سے مرے نکل پڑے یہ مری جبین نیاز کھتی کہ جہاں صری تھی دھری ہی

انتظار کی ساعتیں گزرتی جاتی ہیں اور وہ جیانی میں گنگنا جاتا ہے :-

نظر ہے وقفِ غم انتظار کیا کہنا کھنچی ہر سانسے تصویر یا کیا کہنا (مگر مراد آبادی)۔  
اب قافلہ مکہ معظمہ میں داخل ہو رہا ہے! "حرم مامون" میں پہنچ رہا ہے! "مَنْ دَخَلَ كَانِ امِينًا"  
کی نوید اس کے کانوں میں گونجتی ہے :- "بلد امین میں داخل ہو کر دم چنچ اٹھتا ہے :-"

ذرہ خاکم و در کوئے توام وقت خوش است ترسم اے دوست کہ باوے نہ بزدنا گاہم! (حافظ)  
آگے بڑھ کر جب اس کی نظر بیت اللہ پر پڑتی ہے تو رب البیت کی تجلی سے اس کے ہوش و حواس  
گم ہو جاتے ہیں :-

آمد خبرے ز آمد او من بعد خبر نماند مارا!

وہ "بیت" کو نہیں، گویا "رب البیت" کو دیکھ رہا ہے!

آنکھوں میں رٹے یا رہے، آنکھیں ہیں رٹے یا رہے

ذرہ ہر آفتاب میں، ذرے میں آفتاب ہے!

اسی ذوق و حقوق کو لیے ہوئے وہ طوائف کے لیے بڑھتا ہے، اس کے قلب میں تعظیم، خوف و رجا،  
عشق و محبت کے جذبات موجزن ہوتے ہیں، اس کا جسم خانہ کعبہ کے طوائف میں مصروف ہوتا ہے  
لیکن اس کی روح رب البیت کے گرد گھومتی ہے، اس کا دل حضرت ربوبیت کا طوائف کرتا ہے،  
ان پر فدا ہوتا ہے، نثار ہوتا ہے، چھتا ہے :-

یک جان چہ متاعیت کہ سازیم فدایت

اما چہ تو اں کرد کہ موجود ہمیں است!

جب حجرِ اسود کو بوسہ دیتا ہے تو جانتا ہے کہ وہ حق تعالیٰ کے ہاتھ پر بیعت کر رہا ہے۔ اطاعت  
فرمانبرداری، عہدیت و عبودیت کا اقرار کر رہا ہے، حجرِ اسود "بیمین اللہ عزوجل فی الارض"  
ہے، حق تعالیٰ کا ماہتا ہاتھ ہے زمین پر، "یصا فح بها خلقہ کما یصا فح الرجل اخاہ" جس سے وہ

۱۔ سلم بردایت عبدالشہین عمری۔

اپنے بندوں کے ساتھ مصافحہ کرتے ہیں! وہ حق تعالیٰ کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر عرض کرتا ہے: ۛ

یارب منم دست تہی چشم پر آب جاں دادہ ودل سوختہ وسینہ کباب

نامہ سیرہ و عمر تبہ، کار شراب از روئے کرم بفضئل خویشیم دریاب

پھر کعبۃ اللہ کے پردہ کو پکڑتا ہے یہ سمجھ کر کہ حق تعالیٰ کے دامن کو پکڑ رہا ہے اور ملتزم سے چمٹتا

ہو یہ سمجھ کر کہ حق تعالیٰ سے قریب ہو رہا ہے، رور و کر عرض کرتا ہے: ۛ

تو کریم مطلق دمن گدا چکنی جزائیکہ نخوایم دردیکوے بنا کہ من بہ کجا روم چو برانیم

ہمہ عمر ہرزہ دویدہ ام خچلم کنوں کہ خمیدام من اگر بقلقہ تنیدہ ام تو بردن درفشانیم (بیدل)

آپ کا دامن چھوڑ کر کہاں جاؤں، کس کے آگے ہاتھ بھیلانوں، کس کے قدم پکڑ لوں؟ میری پناہ گاہ آپ

ہیں، میرا لجا و ماویٰ آپ کے سوا کون ہے؟ آپ کے کرم و عفو کے سوا میرا ٹھکانا نہیں! آپ کا دامن

نہ چھوڑونگا جب تک کہ آپ اپنی رحمت سے میری سیہ کاریوں کو معاف نہ فرمائیں، اور آئندہ

دامن امن میں پرورش نہ فرمائیں! حق تعالیٰ آپ کریم ہیں، در کریم پیچڑو نیاز کے ساتھ آیا ہوں،

دیدہ اشکبار کے ساتھ آیا ہوں، دردِ دل، نالہ جاں آزار کے ساتھ آیا ہوں، اگر آپ دامن عفو

میں پناہ نہ دیں تو کہاں جاؤں، کیا کروں! ۛ

یارب دلم از بارگنہ محزون است جاں زار و دل افکار و جگر پر خون است

ہر چند گنہ من ز حد بیرون است عفو ت ز گناہ من بسے افزون است (درد)

صفا و مروہ کے درمیان جب وہ سعی کرتا ہے تو یہ احساس قلب میں لیے ہوتے کہ ایک فقیر،

مسکین، حقیر و ذلیل غلام اپنے آقا، مالک، بادشاہ کے محل کے صحن میں بار بار چکر لگا رہا ہے، نظر

کرم کا ملتجی ہے، زبان پر سوال ہے کہ:

”رب اغفر وارحم و تجاوز عمتا تعلم انک انت الاعز الاکرم“

بار بار گھومتا ہے اور آواز لگاتا ہے کہ:

عبیدک بفنائک! مسکینک بفنائک! فقیرک بفنائک! سائلک بفنائک! انت

کریم رحیم الرحمنی و اعفزی یا رحیم یا کریم یا غفور!  
 جانتا ہے کہ کوئی سائل اس در سے محروم نہیں جاتا، یہ کریم کا دروازہ ہے، اس کو چوکھٹا کھٹاتا ہے  
 وہ اپنی مراد کو پاتا ہے۔

عاقبت زان دربروں آید سرے	حسب گفت پیغمبر کہ چون کو بی درے
عاقبت جو بندہ یا بندہ بود	سایہ حق بر سر بندہ بود
عاقبت بینی تو ہم روئے کسے	چون نشینی بر سر کوئے کسے
عاقبت اندر رسی در آب پاک	چون ز چاہے میکنی ہر روز خاک

عرفات کے میدان میں جب وہ قدم رکھتا ہے اور لوگوں کا ازدحام اور آوازوں کا بلند ہونا  
 اور زبانوں کا اختلاف جب اس کو نظر آتا ہے تو اس کو میدانِ قیامت کا منظر یاد آتا ہے کہ اس  
 روز بھی ہر امت اپنے نبی کے ساتھ اسی طرح جمع ہوگی اور اس کی پیروی کریگی اور اس کی  
 شفاعت کی امید کریگی، اب وہ اضطرار کے ساتھ حق تعالیٰ کی طرف رجوع ہوتا ہے اور چہچہا ہے:

یا من لا یثقلہ شأن عن	اے وہ ذاتِ مطلق کہ جس کو ایک حال دوسرے حال
شأن ولا سمع عن سمیع ولا	سے نہیں روکتا اور نہ ایک عرض کا سنا دوسرے عرض
تشبہ علیہ الاصوات یا	کے سننے سے باز رکھتا ہے، اور نہ مشتبہ ہوتی ہیں اس پر
من لا تغلط المسائل ولا	آوازیں! اے وہ ذاتِ مطلق کہ جس کو بہت سے سوال
تختلف علیہ اللغات یا من	مخالط میں نہیں ڈال سکتے اور نہ مختلف ہیں اس کے نزدیک
لا یرمہ الحاج الملحمین و	بہت سی زبانیں! اے وہ ذاتِ پاک جس کو ہٹ کرنے والوں
لا تضجرة مسئلة السائلین!	کا اصرار تھا کہ تمہیں دیتا اور مانگنے والوں کا سوال تنگ نہیں
اذقنا برد عفوک و حلوة	کرتا ہم کو اپنے عفو کی ٹھنڈک اور رحمت کی حلوت سے آشنا
رحمتک!	کرا
(دعاے خضر علیہ السلام)	

پھر رو کر کہتا ہے :-



یا اللہ! انت انت وانا انا، انا حق تعالیٰ آپ آپ ہیں اور میں میں ہوں؛ میں گناہوں کی طرف  
 العواد الی الذنوب وانت بار بار پلٹتا ہوں اور آپ مغفرت کی طرف بار بار رجوع  
 الی المغفرة؛ الہی ان کنت لا کرتے ہیں؛ حق تعالیٰ اگر آپ اپنے طاعت والوں ہی پر  
 ترحمہ لا اهل طاعتک فالمن یفرع المذنبون! رحم کریں، تو گنہگار کس طرف ملتی ہوں؛

الہی تجتبت عن طاعتک عمداً حق تعالیٰ میں آپ کی اطاعت سے قصداً علیحدہ رہا اور  
 وتوجهت الی معصیتک قصداً آپ کی نافرمانی پر دانستہ متوجہ ہوا، آپ پاک ہیں آپ کی حجت مجھ  
 فبعتک ما اعظم حججتک علی و پر کتنی بڑی ہے اور آپ کا مجھے معاف کرنا کتنا بڑا کرم ہے پس جس صورت  
 ما اکرم عفوک عنی فبوجوب میں کہ آپ کی حجت مجھ پر ضروری ہوئی، میری حجت آپ کے ہاں  
 حججتک علی وانقطاع حججتک عنک جاتی رہی، میں آپ کا محتاج ہوں اور آپ مجھ سے بے پروا و  
 وفقری الیک وغناک عنی الا بے نیاز، آپ مجھے معاف ہی فرما دیجیے! اے ان سے بہتر ذات جن کو  
 غفرت لی! یا خیر من دعاہ جن کو کوئی دعا مانگنے والا سچا، اور افضل ان سب میں سر کوئی توقع رکھنے والا ہے  
 دافع وافضل من رجاء راجع ہجرتہ اسلام کی حرمت اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذمہ کا  
 الاسلام وبنی مت محمد علیہ السلام وسیلہ تیرے سامنے پیش کرتا ہوں، میرے سائے گناہ  
 اتوسل الیک فاغفر لی جمیع بخش دیجیے اور مجھے اس موقع سے حاجتیں پوری  
 ذنوبی واصرفنی عن موقفی ہذا کر کے لوٹائیے اور جو کچھ میں نے مانگا مجھے دلا دیجیے اور  
 مقضی الخوائج وھب لی ما سألت جس چیز کی میں نے تمنا کی اس میں میری توقع پوری  
 وحقق رجای فیما تمنیت! کیجیے!

پھر چلا تاپے درد بھرے دل سے!

الہی من مدحک نفسہ فانی الہی! جو تیرے سامنے اپنی تعریف کیا کرے میں تو اپنے  
 لا ثم نفسی! الہی! آخرست المعاصی نفس کو ملامت کرتا ہوں؛ الہی گناہوں نے میری زبان

لسانی فیما لی وسیلۃ من عملی و  
 لا شفیع سوی الا مل! الہی انی  
 اعلم ان ذنوبی لہرتق لی عندک  
 جاہاً ولا للاعتذار وجہاً ولكنک  
 اکرم الاکرمین الہی ان لہ اکن اہلاً  
 ان ابلغ رحمتک فان رحمتک  
 اہل ان تبلغنی ورحمتک سعۃ  
 کل شیء وانا شیء! الہی ان ذنوبی  
 وان کانت عظاماً ولکہ فاصغاد  
 فی جنب عفوک! فاغفرہالی یا کریم!  
 گوئی کردی، پس مجھ کو اپنے عمل کا وسیلہ نہ رہا اور نہ سوا  
 امید کے اور کوئی سفارش کرنے والا! الہی مجھے معلوم  
 ہے کہ میرے گناہوں نے تیرے نزدیک میری قدر  
 کچھ باقی نہ رکھی اور نہ عذر کرنے کی کوئی صورت  
 چھوڑی لیکن تو تمام کریموں سے زیادہ کریم ہے! الہی  
 اگر میں اس قابل نہیں کہ تیری رحمت تک پہنچوں  
 تو تیری رحمت تو شایاں ہے کہ مجھ تک پہنچے! الہی  
 تیری رحمت ہر چیز کو شامل ہے اور میں بھی ایک چیز  
 ہوں! الہی اگرچہ میرے گناہ بڑے ہیں لیکن تیرے  
 عفو کے مقابلہ میں چھوٹے ہیں! میرے گناہوں سے  
 درگزر کرے کریم!

چاہتا ہوں کہ یہ وہ مبارک مقام ہے جہاں حق تعالیٰ کی رحمتیں نازل ہوتی ہیں اور ان رحمتوں کو  
 وہ قلوب جذب کرتے ہیں جو اس میدان میں موجود ہوتے ہیں، یہ ابدال و اوتاد کے قلوب ہیں،  
 ان صاحبین کے قلوب ہیں جو حق تعالیٰ کے آگے سز سجد ہیں، ان کے حضور میں دست بستہ  
 دولت و مسکنت کے ساتھ گڑ گڑا رہے ہیں! رحمت الہی کے جذب کا اس سے زیادہ قوی و موثر  
 کوئی طریقہ نہیں کہ:

”ان ابرار کی ہمتیں اکٹھی ہوں اور ایک وقت میں ایک زمین پر قلوب ایک دوسرے  
 کی مدد کریں!“

اس بادراک کے ساتھ ہی اس کی زبان سے یہ چیخ نکلتی ہے:

غمناکم والدرتو باعسم نروم جز شادو امیدوار و خرم نروم

اے یہ سب دعائیں اچھا، لعلوم باب نہم سے کی گئی ہیں۔ فلیرج۔

از درگہ ہچو تو کرتے ہرگز نومید کے نرفت و من ہم نروم (ابوسعید)  
اسی لیے کہا گیا ہے کہ:

عرفات شریف کے میدان میں آکر یہ سمجھنا کہ حق تعالیٰ نے میری مغفرت نہیں کی،  
سب سے بڑا گناہ ہے۔“

رحمت اینجا کہ کند وسعت خود را ظاہر

ہر کہ تقصیر نہ کرد است گنہ گار تراست!

رحمی جمار کے موقع پر احرام باندھتے وقت کے اپنے اس قول کو یاد کرتا ہے کہ:

لبیک لحجة حقا تعبدًا أو سرفًا

اور محض اپنی غلامی و بندگی کے اظہار کے لیے امر کی اطاعت کا قصد کرتا ہے اور محض تعمیل ارشاد  
و امتثال امر الہی کے لیے رمی کرتا ہے، جانتا ہے کہ اس فعل میں نہ تو نفس کو کوئی خطبہ ہے اور نہ عقل  
کو! اپنی عقل اور نفس کو حق تعالیٰ کے حکم پر قربان کرتا ہے، اور دیوانہ وار "اقامت ذکر اللہ"  
کے لیے شیطان پر کنکر مارتا ہے اور زبان سے کہتا جاتا ہے:-

اللہ اکبر علی طاعة الرحمن و رعد الشيطان تصديقًا بكتابتك و اتباعًا

لسنة نبیک -

جب قربانی کرتا ہے تو جانتا ہے کہ حق تعالیٰ کے حکم پر وہ اپنی بھی جان قربانی کے جانور کی  
طرح فدا کرنے کو تیار ہوگا بلکہ عاشق کی زندگی تو ہر "زمان مردنی" ہے وہ اپنی جان کو ہر دم فدا کر ہی  
رہے:

اے حیاتِ عاشقاں در مردگی دل نیابی جز کہ در دل بردگی

ما بہا و خوں بہا را یا نسیم جانبِ جاں با ختنِ بشتا فتمیم

اسے میں حاضر ہوں حج کے واسطے حقیقت میں بندگی اور غلامی کی راہ سے (دارقطنی در علل بروایت حضرت انس رضی  
علہ السلام جمل الطوائف بالبيت والسعی بین الصفا والمروة و رمی جمارًا لاقامت ذکر اللہ لا لغیره یعنی طوائف  
العبادہ سعی در میان صفا و مروہ اور کنکریوں کا پھینکنا ذکر اللہ کے قائم رکھنے کے واسطے مقرر کیا گیا ہے) ابو داؤد و ترمذی بروایت

عاشقاں راہر زمانے مرز نیست      مردن عشاق خود یک نوع نیست  
 اود و صد جاں دارد از نورِ ہدی      واں دو صد رامی کند ہر دم فدا  
 ہر یکے جاں راستانہ دہ ہسا      از نبی خواں عشرۃ امثالہا (ردی)  
 غرض حج کے اعمال میں دل کا وظیفہ یہ ہے جس کا اجمالاً او پر ذکر ہوا، قلب کی یاد کے ساتھ  
 حج کے اعمال وہی ادا کرتا ہے جس کے دل پر حق تعالیٰ کی محبت و غلامی کا داغ ہوتا ہے اور ظاہر  
 ہے کہ جس غلام کو خود بادشاہ خریدتا ہے اس کا مرتبہ سوا ہوتا ہے۔

داغ غلامیت کر دیا یہ خسرو بلند  
 صدر ولایت شود بندہ کہ سلطان خرید

## زیارتِ مدینہ

”زیارتِ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) اوکد مستحبات و افضل قرأت سے ہے اور صاحبِ  
 قدرت کے لیے قریب واجب کے ہے!“

خوش آنکہ بندم در رہت بر ناقہ محل از وطن!

خیزم چو گرد، افتم چو اشک، ایم بسیر، غلظم بہ تن (اوحادی)

مدینہ رسول کی راہ میں درود کے شغل سے بہتر کوئی شغل نہیں۔

إِنَّ اللَّهَ وَمَلَائِكَتَهُ يُصَلُّونَ عَلَى النَّبِيِّ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا صَلُّوا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوا

تَسْلِيمًا. من صلی علی واحدۃ صلی اللہ علیہ عشرًا (مسلم)

اس راستہ کو درود و سلام کے ورد ہی میں ختم کرنا چاہیے، حُب نبوی کا تقاضا یہی ہے

من مذہبی حب النبی و صحبہ

وللناس فیما یعشقون مذاہب

لہ دہ ماتدآن، اشارہ بایہ من جاء بالحسنۃ فلد عشر امثالہا (سورۃ الانعام)

مکمل مولانا صدیق حسن مرحوم، در الشامۃ الغبریہ من مولد خیر البریہ ص ۱۱۵-۱۲

جب مدینہ منورہ کی دیواروں پر نظر پڑتی ہے تو عاشق کے ذہن میں خیال آتا ہے کہ یہ وہ مبارک شہر ہے جس کو حق تعالیٰ نے اپنے محبوب کے لیے پسند فرمایا ہے، اور اس کو ان کا دارالہجرت بنایا ہے۔ یہ وہ مقام مقدس ہے جہاں آپ نے حق تعالیٰ کے فرائض و سنن مشروع فرمائے، اعدائے دین سے جہاد کیا اور حق تعالیٰ کے دین کو ظاہر کیا، اسی پاک زمین میں آپ نے اپنی زندگی بسر فرمائی، یہاں تک کہ حق تعالیٰ نے آپ کو اپنے جوار رحمت میں بلالیا اور آپ کی قبر مطہر اس میں مقرر فرمائی، اور آپ کے دو وزیر جو آپ کے احکام کی بجا آوری میں کامل تھے آپ ہی کے پہلو میں آرام فرما رہے ہیں! اس خیال کے آتے ہی وہ فرط مسرت سے چیخ اٹھتا ہے:

من ویشرب کہ بہ از نور بود خاک انجا!	باشد از ہر مبین سایہ افلاک انجا!
شرفے خاک ہمیش راست کہ باو دین آب	از تیمم شود اعضاے وضو پاک انجا!
بجر رحمت شود آں قطرہ کہ از سے ریزد	چوں کند تاب سفر جبہ عرفناک انجا!
صاحبش راست جنابے کہ ز بس تعظیمش	بال جبرئیل بر بدخش و خاشاک انجا!

(مولوی احسان اللہ ممتاز)

جب عاشق رسول مدینہ منورہ کی پاک زمین پر قدم رکھتا ہے تو اس کی زبان سے بے اختیار نکلتا ہے:

اندر دو جہاں کعبہ ما کوئے محمدؐ

مخراپ دل و جاں خم ابروئے محمدؐ

وہ دیوانہ وار حق تعالیٰ سے مخاطب ہو کر کہتا ہے:

اللہ! ایسے جذبِ محبت کو کیا کروں!

رگ رگ کو جس نے درد بھر دل بنادیا

ہر قدم پر وہ یہ سوچتا ہے کہ اس مقام پر آتے نامدار کے قدم پڑے ہونگے، قدم اٹھاتا ہے

پھر ٹھہر جاتا ہے، بڑھتا ہے، پھر ٹھہر جاتا ہے



توے کوچے میں ہم کل اس طرح سے جا بجا ٹھہرے  
چلے چل کر تھمے، تھم کر بٹھے، بٹھ کر ذرا ٹھہرے

اس گلی کے ہر ڈرے کو وہ اپنا دل سمجھتا ہے۔ ۶۔

ہم اس کوچے کے ہر ڈرے کو اپنا دل سمجھتے ہیں!

تجلیات جب اس کو آگے قدم بڑھانے نہیں دیتیں، تو وہ چنچلتا ہے

پایم بی پیش از سرایں کو نمی رود

یا راں خبر دہید کہ این جلوہ گاہر کیت (نظیری)

اسی محبت کی تجلی میں وہ دیکھتا ہے کہ: ۶۔

کوچہ جاناں کا ہر ڈرہ چرخِ طور ہے!

اپنے محبوبت کا وہ خیال کرتا ہے، حق تعالیٰ نے اپنی معرفت کس درجہ آپ کو عطا فرمائی تھی!

آپ کے ذکر کو کس درجہ بلند فرمایا تھا کہ اپنے ذکر کے ساتھ اس کو ملا دیا تھا، دفعنا لک ذکرک کی

نوید سے آپ کو سرفراز فرمایا تھا! آپ کی تعظیم کے ترک کرنے پر کیسی وعید فرمائی تھی، گو آپ کی آواز

پر اپنی آواز ہی کے بلند کرنے سے وہ ترکِ تعظیم کیوں نہ ہو! جبطِ اعمال اس کی سزا تھی! پھر نظامیؒ

کے الفاظ میں وہ اس طرح ثنا خواں ہوتا ہے ۷۔

شمسہ نہ مسندِ معرفت اختران ختمِ رسل خاتمِ پیغمبران!

احمدِ رسل کہ خرد خاکِ اوست ہر دوہاں بستہ فزاکِ اوست

امی گویا بہ زبانِ فصیح از الف آدم و میم مسیح

اے تن تو پاک تراز جانِ پاک روح تو پروردہ روحی فداک

اے مدنی برقع و کی نقاب سایہ نشین چند بود آفتاب

اے گوہر تاج فرستادگان تاج وہ گوہر آزادگان

پھر وہ خیال کرتا ہے کہ حق تعالیٰ نے ان نیک بختوں پر کتنا بڑا احسان فرمایا، جنہوں نے

آپ کی صحبت پائی، اور مشاہدہ جمال، استماع اقوال و ملاحظہ احوال سے سعادت حاصل کی اور اپنے حال پر آنسو بہاتا ہے کہ یہ دولتِ سرمدی مجھے نصیب نہ ہوئی، اور نہ آپ کے اصحابِ کرام کی صحبت ملی؛ دنیا میں تو آپ کو نہ دیکھا، آخرت میں بھی شاید آپ کی زیارت نگاہِ حسرت ہی سے ہو اور اعمالِ بد کے باعث آپ ہمیں قبول نہ فرمائیں کیونکہ آپ کا ارشادِ مبارک ہے کہ:

”قیامت کے روز کچھ لوگوں کو فرشتے دوزخ کی طرف لے جائیں گے (جن میں اپنی امت کی بعض نشانیاں دیکھ کر میں حق تعالیٰ سے عرض کروں گا، حق تعالیٰ یہ میرے لوگ ہیں، حکم ہو گا کہ نہیں ہمتیں نہیں معلوم کہ تمہارے بعد انہوں نے کیا کام کیے ہیں؛ تب میں کہوں گا کہ مجھ سے دور ہو، مجھ سے دور ہو!“ (رداء الشیخان)

یہ حال ان لوگوں کا ہو گا جنہوں نے شریعتِ مطہرہ کی توقیر نہیں کی، سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قدر نہ سمجھی، اور بدعت کو ترجیح دی، اب وہ اپنی حالت پر نظر ڈالتا ہے، اس معید سے کانپ اٹھتا ہے، اپنے گناہوں سے توبہ کرتا ہے، چیتا ہے۔

ہر چند گناہ بے شمار است	صد مرتبہ بے شمار توبہ
در بارگت کم حنہ دایا	بادیدہ اشکبار توبہ
گرفت بہ ترات عسرم	کردم نہ بیک دو بار توبہ
شد ہر سر موکنوں زبانی	آرم بتو بار بار توبہ (لااعلم)

پھر عرقِ خجالت میں غرق ہو کر حق تعالیٰ سے التماس کرتا ہے :-

تو غنی از ہر دو عالم من فقیر	روز محشر عذر ہائے من پذیر
یا اگر بینی حسابم ناگزیر	از نگاہِ مصطفیٰ پنہاں بگیر (اقبال)

پھر امید ورجا کی موج اس کے سینے میں اٹھتی ہے، وہ اس امر کا احساس کرتا ہے کہ حق تعالیٰ نے ایمان کی دولت سے اس کو سرفراز فرمایا، اپنے محبوب کی زیارت کے لیے وطن سے نکال کر اس مقدس مقام پر پہنچایا، حفظِ دنیا یا تجارت اس سفر سے اس کا مقصود

نہ تھا، فقط آپ کی بے پایاں محبت اور آپ کے آثار کے دیکھنے کے شوق ہی نے اس کو وطن  
 مالوف سے نکالا، زندگی میں جب آپ کا دیدار نصیب نہ ہوا تو اس نے اس پر ہی قناعت  
 کی کہ آپ کی مسجد مبارک میں حاضر ہو کر آپ کی قبر اطہر کی دیوار پر ہی نظر ڈالے۔

غریبے گر روی ہشتر و دیا      روی در مسجد مصفا کن  
 دوست را گرنمی توانی دید      خانہ دوست را تماشا کن

جب حق تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے یہ سامان مہیا کر دیے تو اب اس کی رحمت  
 سے یہی توقع ہے کہ وہ اس کی طرف نظر رحمت سے دیکھینگے، اور اس کے گناہوں کو معاف  
 فرمائینگے۔

اندر علم انچہ ترا شاید نیست

اندر کرمت انچہ مرا ہاید ہست

جب مسجد نبوی میں قدم رکھتا ہے تو یہ سوچتا ہے کہ یہ وہ مقدس جگہ ہے جس کو حق  
 تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم اور مسلمانوں میں سے اول اور افضل لوگوں کے لیے تجویز فرمایا، جو نبول  
 عارف رومیؒ      برترند از عرش و کرسی و خلا  
 ساکنان مقعد صدق خدا

اور جو حق تعالیٰ کی نظر میں "محبوب و مطلوب و پسند" رہے ہیں۔

جانتا ہے کہ یہی وہ مقام ہے جہاں سب سے پہلے حق تعالیٰ کے فرائض ادا ہوئے، اور  
 کامل عبودیت کے ساتھ ادا ہوئے؛ یہی وہ زمین ہے جس میں تمام مخلوق سے افضل و برتر  
 لوگ حالت حیات و حالت ممات میں جمع ہیں؛ اب وہ توقع کرتا ہے کہ حق تعالیٰ اس  
 پر بھی رحم فرمائینگے، اور دل ہی دل میں عرض کرتا ہے:

بضاعت نیا و دم الہامیہ

خدا یا ز عفو مکن ناامید

پھر مسجد مبارک میں خشوع و تعظیم سے داخل ہوتا ہے، زبان پر یہ دعا ہوتی ہے:-

اللهم هذا هم رسولك فاجعل لي وقاية من النار وامانا من العذاب وسوء  
الحساب اللهم افتح لي ابواب رحمتك وارزقني من زيارة نبيك ما رزقت  
اوليائك واهل طاعتك واغفر لي وارحمني يا خير مستول -

پھر نیت اعتکاف الی الخرج کر کے روضہ جنت کی طرف بڑھنا ہے اور محراب نبوی کے  
پاس، ممکن ہو تو مصلیٰ نبوی یا اس سے متصل یا منبر کے پاس، اور نہ ہو سکے تو کسی ایک مقام  
پر تحیۃ المسجد کی دو رکعتیں ادا کرتے ہیں، پھر اس نعمت عظمیٰ کے حصول پر حق تعالیٰ کا شکر ادا کرتا  
ہے، اور رضا، توفیق خیر، قبول اعمال و بلوغ مقاصد کی دعا کرتے ہیں! دہلے کے الفاظ یہ ہوتے ہیں:

اللهم ان هذه روضة من رياض الجنة شرفتها وكرمها ومجدتها وعظمتها  
ونورها بنور نبيك وحبيبك محمد صلى الله عليه وسلم اللهم كما بلغتنا في  
الدنيا زيارته وما اثره الشريف فلا تحرمنا يا الله في الآخرة من فضل  
شفاعة محمد صلى الله عليه وسلم واحشرنا في زهرته وتحت لوائه وامتنا  
على محبته وملته واسمنا من حوضه للورود بيد الشريفة شريفة هنية  
لانظساء بعدها ابدا انك على كل شيء قدير -

پھر زیارت کی نیت سے نہایت ادب و خشوع کے ساتھ روضہ پاک کے سامنے حاضر  
ہوتا ہے، اس کا عقیدہ ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کے آنے، کھڑے ہونے، اور  
زیارت کرنے کا علم ہوتا ہے، اور اس کا درود و سلام آپ کی خدمت مبارک میں پہنچتا ہے۔  
آپ نے فرمایا کہ:

من صلى علي واحدة صلى الله عليه عشرا (مسلم)

یہ جزا تو صرف زبان سے درود پڑھنے کی ہے، جب وہ خود زیارت کے لیے تمام بدن سے

لے یہ اس حدیث سے ثابت ہے کہ آپ نے فرمایا کہ: "جو لوگ میری قبر پر آکر سلام کریں گے میں اس کا سلام خود سنوں گا  
اور دور سے سلام کرنے والوں کا سلام مجھے پہنچایا جائیگا!" (مشکوٰۃ)

حاضر ہوا ہے تو اس کا بدلہ کس قدر عظیم الشان ہوگا!

اب وہ اپنے آقا کے نامدار (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں سلام عرض کرتا ہے:  
 الصلوٰۃ والسلام علیک ایہا النبی السید الکریم والرسول العظیم والحبیب  
 الرؤف الرحیم ورحمة اللہ وبرکاتہ، الصلوٰۃ والسلام علیک یا محمد بن  
 عبد اللہ بن عبد المطلب ابن ہاشم یا طہ یا یس یا بشیر یا سراج یا مبین  
 یا مقدم جیش الانبیاء والمرسلین ۛ

یاخیر من دفنت فی التراب اعظمہ فطاب من طیہن القام والاکم  
 نفسی الفداء لقبرانت ساکنہ فیہ العفاف وفیہ الجود والکرم  
 انت الحبیب الذی ترحی شفاعتک عند المصراط اذا ما زلت القدم

پھر صدیق اکبرؓ اور عمر فاروقؓ کی خدمت میں سلام عرض کرتا ہے۔

پھر حضورؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے منبر شریف کے پاس حاضر ہوتا ہے اور تصور کرتا ہے  
 کہ گویا آپ منبر پر چڑھے کھڑے ہیں اور مہاجرین و انصار آپ کے گرد حلقہ کیے ہوئے ہیں اور  
 آپ ان کو خطبے میں حق تعالیٰ کی اطاعت کی ترغیب و بہت دلا رہے ہیں اور نافرمانی سے روک  
 رہے ہیں اور ڈرا رہے ہیں ۛ

محمد شہنشاہ خیلِ رسل کہ خردند پیشش چہ جزوہ گل

درخشاں دردیج عبدمناف بانگشت اعجازمہ را شکاف

زابروش محراب عین بصیتن زگیسوش اسباب جبل المتین

فلک ہا زدریاش در شبنے فصیحاں زغوغاش در لبکے

چناں عقدہ از کار امت کشاد کہ دندان دریں کار برباد داد! (ظہوری)

دل میں توحید پر مبنی مرنے کا پختہ عزم کرتا ہے، حضورؐ کی محبت کو قلب میں اور زیادہ راسخ  
 کرتا ہے، اور آپؐ کی سنت مطہرہ پر ساری عمر عمل کا پورا ارادہ کرتا ہے، اس عقیدے کو پختہ کرتا ہے کہ



حق تعالیٰ ہر حال میں اس کے نگران ہیں۔ ”الم یعلم بان اللہ یبصر“۔ اس کے دل کے دوسروں اور خفیہ خطرات و خیالات کو دیکھتے اور جانتے ہیں تاکہ سب کاموں میں ادب کا لحاظ رکھے جیسے کہ کوئی شخص کسی بادشاہ کی نظروں کے سامنے ہے، ہر وقت گردن جھکائے، اور ہر کام میں ادب! اس یقین کو بھی دل میں مضبوط کرنا ہے کہ:

”فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ“

یعنی طاعات کو تو اب سے ایسی نسبت ہے کہ جیسے غذا کو پیٹ بھرنے سے اور گناہوں

کو عذاب سے وہ تعلق ہے جو زہر کو بلا کیت سے!

عزم کرتا ہے کہ اپنے تمام حرکات و سکنات، خطرات و خطرات، لفظات و فلمات، غدرات و فجرات پر ہمیشہ نظر رکھیگا، اور تقویٰ کے اختیار کرنے میں اور ہر برائی سے اجتناب کرنے میں مبالغہ

سے کام لیگا۔ بحول اللہ و قوتہ۔ آخر میں اس تسکین بخش عقیدے کو بھی پختہ کرتا ہے کہ رزق کی کفالت خود حق تعالیٰ نے فرمائی ہے یہ کہہ کر کہ:-

”مَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا“

یہ رزق مضمون ضرور ملیگا، جتنا مقدر ہے وہ قطعاً پہنچ کر رہیگا، طلب رزق بطور شرعی کرنا چاہیے اور جو چیز فوت ہو جائے اس پر افسوس نہ کرنا چاہیے۔

لَكَيْلًا تَأْسَوْا عَلَىٰ مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوا بِمَا آتَاكُمْ

مہر شریف کے پاس پہنچ کر تصور کرتا ہے کہ کچھ ان ہی تیقنات پر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم زور دے رہے ہیں اور وہ انہیں اپنے قلب میں اتار رہا ہے، اور اپنے تحت شعوری نفس میں انہیں پختہ کر رہا ہے۔

حج و زیارت کے اعمال میں یہ ہے دل کا وظیفہ، جس کے اجمال کا ذکر ہوا۔ اس طرح فارغ ہو کر حاجی فرط مسرت سے چیخ اٹھتا ہے۔

نازم کچشم خود که جمال تو دیده است  
 افتم بیک خود که کبویت رسیده است  
 هر دم هزار بوسه زخم دست خویش را  
 کوه امت گرفت لبویم کشیده است

